قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جولائی 2017 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب و غریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

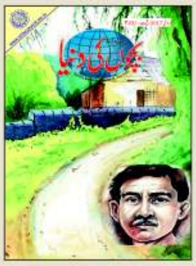
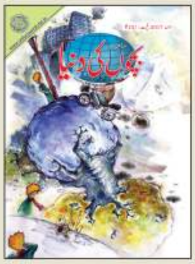

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

مشمولات

اداریہ
ہماری بات — 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 5

انٹرویو
افسانہ کے نام پر انشائیے لکھے جارہے ہیں: نورالحسنین — معین الدین عثمانی — 7

عالمی اردو کانفرنس
مندوبین کے تاثرات — 10

زبان و تعلیم
غالب اور غربال — شمس کمال انجم — 14

نقد و نگاہ
افق لکھنوی کی رمائن — مختار ٹونکی — 16
دبستان لکھنؤ کی شاعری اور ریتی کالین کاویہ — شیویہ ترپاٹھی — 18
قرۃ العین حیدر کا فن — گلشن مسرت — 21

سیماب اکبرآبادی اور اصلاح سخن — مقیم احمد — 24
اردو افسانہ اور کشمیر — مدثر رشید فیروز — 27

خراج عقیدت
شاہد احمد شعیب — افصح ظفر — 31

سلسلۂ صحافت
اخبار'الاصلاح' حریت پسندی کا جلی عنوان — خان محمد رضوان — 35

نیا آسماں نئے ستارے
میر ناصر علی کی انشائیہ نگاری — نوشین حسن — 38
فکشن تنقید اور وہاب اشرفی — ہاجرہ خاتون — 41

اردو افق
اردو زبان اور ہماری ذمے داریاں — ایم اے کنول جعفری — 46

ہم نے جنھیں بھلا دیا
پنجاب کا ایک گمنام شاعر: رام رتن مضطر — رحمان اختر — 49

باب کونسل
ادب اطفال کی اشاعت میں قومی اردو کونسل کا حصہ — سید اسرار الحق سبیلی — 52
'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ — ارشاد قمر — 57

دانش گاہ
عثمانیہ یونیورسٹی کے صدور و سربراہان — محمد ناظم علی — 59

کمپیوٹر
بائنری سسٹم — 62

طب
طب یونانی ماضی اور حال کے آئینہ میں — سید فضل اللہ قادری — 64

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ — 69

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ — 83

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 85

ماہنامہ اردو دنیا

URDU DUNIYA

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:19، شمارہ:07، جولائی 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ اعلیٰ تعلیم حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آراسے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 چترگتی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

ہماری بات

اردو رسائل کی ایک زریں تاریخ رہی ہے۔ ماضی کے بہت سے ایسے رسالوں کے نام لیے جاسکتے ہیں جن رسائل نے علمی، ادبی، تہذیبی مباحث کے ذریعے نہ صرف قارئین کے شعور کو بیدار کیا بلکہ ایک ایسی نسل تیار کی جو آگے چل کر علم وادب کے میدان میں کامران ہوئی۔ ان رسائل کا ہی فیض ہے کہ بہت سے اچھے شاہکار قارئین کو پڑھنے کے لیے ملے۔ ان رسائل کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ زبان وادب کی ترویج اور ادبی مباحث کے افہام وتفہیم میں ان رسائل کا کردار بہت اہم ہے۔ انھی رسائل کے ذریعے بہت سے تخلیقی اور تنقیدی اذہان وجود میں آئے۔ ان رسالوں نے ایک بڑا اہم کام یہ کیا کہ نئے ادیبوں کو متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا، نئے لکھنے والوں کی فکری وذہنی تربیت کی۔ نامور ادیبوں کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ نوآموز قلمکاروں کو بھی اپنے قیمتی صفحات میں جگہ دی۔ نئے قلمکاروں کو روشناس کرانے کی یہ روایت آج بھی قائم ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' نے 'نیا آسمان نئے ستارے' کے ذریعہ اسی روایت کا احیا کیا ہے۔ آج اردو کے بہت سے دانشور بھی نئی نسل پر خصوصی توجہ دینے کی بات کر رہے ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ انھیں اردو زبان وادب کے مستقبل کا خیال ہے مگر المیہ یہ ہے کہ قلمکار تو بہت ہیں لیکن باشعور قارئین کا قحط ہے۔ پہلے رسائل میں قارئین شماروں کے مندرجات اور کلیدی مقالات پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے تھے۔ تخلیقات کے حسن وقبح پر خیال افروز بحثوں کا سلسلہ چلتا تھا۔ اہم نظریاتی اور علمی مباحث پر مکالمے شروع ہو جاتے تھے۔ بہت ہی معتدل اور متوازن گفتگو ہوتی تھی۔ قاری اور قلمکار دونوں کو اس سے روشنی اور رہنمائی ملتی تھی۔ ذہنوں کے دریچے کھلتے تھے۔ تجسس کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور اس طرح قاری اور قلمکار کا ذہنی افق وسیع ہوتا تھا۔ مگر اب صورت حال بدل گئی ہے۔ اردو میں بہت سے رسائل نکلتے ہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری تک ان رسائل کی رسائی نہیں ہو پاتی یا اگر وہ پہنچتے بھی ہیں تو قارئین ان پر کسی طرح کا

ردعمل ظاہر نہیں کرتے جب کہ رسالوں کو تازگی اور توانائی قاری کے مثبت یا منفی ردعمل سے ہی ملتی ہے۔ رسائل کو بہتر بنانے میں قارئین کے تاثرات اور رایوں کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ کسی ایک رسالے کو اگر اچھے قاری میسر آجائیں تو اس رسالے کی تقدیر سنور جاتی ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں سے یہ دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تر سینئر تخلیق کار کسی بھی علمی، تہذیبی مباحثے میں شرکت سے گریز کرتے ہیں۔ ایک طرح کی بے حسی طاری ہے جس کی وجہ سے بہت سے اہم مباحث بھی بے اعتنائی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں جدیدیت/مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات جیسے مباحث پر قلمکاروں اور قارئین نے خصوصی دلچسپی لی تھی تو ان رسائل سے ایک بڑے طبقے کا رشتہ جڑ گیا تھا اور ان مباحث کی وجہ سے فکر ونظر کے نئے نئے ابواب بھی روشن ہوئے۔ مغربی تحریکات ورجحانات سے لوگوں کی آشنائی بڑھی۔ اب شاید ان مباحث پر توجہ کم ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے قاری کا ایک بڑا حلقہ رسائل سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اب المیہ یہ ہے کہ اردو رسائل کے وہ صفحات جو قارئین کے ردعمل کے لیے مختص ہوا کرتے تھے وہ مختصر ہوتے جارہے ہیں اور اگر قاری کا کوئی ردعمل سامنے آتا بھی ہے تو بحث کے دروازے کھل نہیں پاتے۔ صرف مشمولات کی تعریف وتوصیف ہی ردعمل کا مقصد نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی مقالے کے مافیہ کے حوالے سے گفتگو ہوتی ہے تو اس سے لکھنے پڑھنے والوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ قلمکاروں کو اپنی خوبیوں اور خامیوں کا احساس ہوتا ہے۔ قومی اردو کونسل کا ترجمان ماہنامہ 'اردو دنیا' بھی قارئین کے خطوط کو بہت ہی اہتمام کے ساتھ شائع کرتا رہا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اب اردو دنیا کے معتبر قلمکار کسی بھی مقالے یا موضوع کے متعلق اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کرتے جب کہ اردو دنیا کی اعزازی کاپی بہت سے اہم اور معتبر قلمکاروں کی خدمت میں بھیجی جاتی ہے اور ان سے ہمیشہ یہ توقع رہتی ہے کہ ان کے تجاویز اور مشوروں کی روشنی میں اردو دنیا کو خوب سے خوب تر بنایا جائے مگر یہاں بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قلمکاروں کی طرح قاری کا بھی قحط ہے۔ ایسے میں اب یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ پتہ چلایا جائے کہ اردو رسالوں کا بازار کہاں ہے؟ کن علاقوں میں اردو رسائل کی زیادہ رسائی ہے اور یہ سروے کیا جائے کہ اردو رسائل کس طبقے یا زمرے میں زیادہ پڑھے جاتے ہیں اور ان کی پسند کے موضوعات اور ترجیحات کیا ہیں۔ اردو رسائل کے مدیران کو اب اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ قاری صرف رسالہ پڑھنے پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ رسالے کے مندرجات اور مباحث پر اپنے ردعمل کا بھی اظہار کریں۔ اسی ردعمل سے رسالوں کی اہمیت اور معنویت بھی سامنے آئے گی اور اسی سے رسالے اپنی راہ کا تعین بھی کرسکیں گے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

اردو دنیا جون 2017 نظر انداز ہو۔ اداریہ میں آپ نے سچ کا اظہار کیا کہ ''جو زبانیں شناخت کی سیاست میں الجھادی جاتی ہیں۔ ان زبانوں کے بنیادی مسائل سے توجہ خود بخود ہٹ جاتی ہے۔ اردو زبان کا المیہ بھی یہی ہے۔ اسے ایک تہذیبی تشخص سے جوڑ کر دیکھنے کی روش عام ہوگئی اور آپ کی یہ بات کہ اردو کے فروغ کے لیے بہت سی تحریکیں چلائی گئیں مگر شائد اس کے لیے اب تحریکوں کی نہیں ذہنوں میں تحرک پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو کتابیں اردو اخبارات سرورق پر لکھتے ہیں سب سے زیادہ شائع ہونے والا اخبار کتنے لوگ پڑھتے ہیں۔ 30 کروڑ کی مسلمانوں کی آبادی میں اگر کوئی 10 تا50ہزار اخبار پڑھے جاتے ہیں تو اس کا کیا فیصد بنا اس لیے ہمیں تحریک کی نہیں بلکہ ذہنوں میں تحرک کی ضرورت ہے تمام شماروں کی طرح جون کا شمارہ بھی اپنے اندر گونا گوں خصوصیتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ زبان وتعلیم، خاکہ نگاری، تخلیقی سفر، طنز ومزاح پرمبنی مضامین نے ادب کے ہر موضوع کا احاطہ کیا ہے۔

آندھرا وتلنگانہ میں اردو صحافت رؤف خیر نے کافی تحقیق کے بعد یہ مضمون لکھا وہ ایک اچھے نثار کے ساتھ شاعر بھی ہیں اور سچائی کو پیش کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ بہت اچھی معلومات انہوں نے پیش کی ہے روزناموں میں انہوں نے روزنامہ خون ناب (شاہنامہ) روزنامہ 'آفاق' روزنامہ ساز دکن اور روزنامہ صدائے حسینی کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اخبارات شہر میں کم دوسری ریاستوں میں زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ بچوں کے رسالہ میں انھوں نے ابوالفہیم وحید علی خاں کے رسالہ ہمارے نونہال کا ذکر نہیں کیا۔ وہ خوب چلتا تھا۔ احقر اس کا معاون مدیر بلکہ کئی خصوصی نمبروں کا مدیر ومرتب رہا۔ روزنامہ صحیفہ کا ذکر بھی نہیں ہے اس کے علاوہ تین سال سے روزنامہ صحافی دکن پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے اس کا ذکر انھوں نے نہیں کیا البتہ راقم الحروف کو اس کے ادبی ایڈیشن سے وابستہ بتایا جبکہ احقر اس کے ادبی ایڈیشن 'قرطاس وقلم' اور ہمارے نوجوان کیرئیر گائیڈنس کا مدیر ومرتب ہے۔ اس کے ساتھ محکمہ انفارمیشن و پبلک ریلیشن سے ماہنامہ آندھراپردیش جو کہ اب ماہنامہ تلنگانہ ہوگیا۔ اس کا ذکر بھی نہیں یعقوب سروش بودھن سے بساط ذکر وفکر بھی شائع کرتے تھے جو ان کے انتقال کے کچھ دن بعد بند ہوگیا اطیب اعجاز ملٹس کی خوشبو نکالتے ہیں جبکہ وہ رؤف خیر کے شاگرد ہیں۔ مجموعی اعتبار سے کافی معلوماتی مضمون ہے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں جو کمی رہ گئی ہے اس کو پر کرنے کی کوشش کی ہے اور بھی بہت سے اخبارات ورسائل ہیں اس پر قارئین نظر کر سکیں۔

٭ **ڈاکٹر م ق سلیم**: 'سائبان' 4/69-2-19، بیرون، حیدرآباد، تلنگانہ

جون کا شمارہ گوناگوں تخلیقات سے بھرپور رہا ہے۔ محمد اقبال لون نے نورشاہ سے خوب انٹرویو لیا ہے، انھوں نے بڑی گہری بات کہی ہے کہ ''قاری نہ ہو تو افسانہ نگار کس کے لیے لکھے گا افسانہ اور اگر پڑھنے والا ہی نہ ہو تو افسانہ کس کام کا، آج لوگوں کے پاس پڑھنے کا وقت مشکل سے نکلتا ہے۔ اس لیے طویل افسانے پڑھنے میں قاری کی دلچسپی ختم ہوتی جارہی ہے—!''

قیام نیر نے 'خاکہ نگاری اور سعادت حسن کا خاکہ منٹو' پر خاکہ کی خوبیوں پر گہری نظر ڈالی ہے اور خصوصاً منٹو نے اپنے آپ کو بھی خاکہ بنا کر پیش کیا اس پر بھی بڑی اچھی بات کہی ہے کہ ''اپنے آپ پر لکھا گیا خاکہ''، 'منٹو'' خاکہ نگاری کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے!''

فیروز عالم (عابد سہیل کی خاکہ نگاری) تصنیف عزیز (شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری) پر بھی انھوں نے اچھا خاصا تبصرہ ہے۔ جمیل اختر کا 'عصمت کا تخلیقی سفر- ایک تحقیقی جائزہ' بھرپور کیا ہے۔ ناصرہ سلطانہ نے قرۃالعین حیدر کے شاہکار ناول 'آگ کا دریا' کا تبصرہ کمال کا کیا ہے۔

نسیم احمد نسیم نے 'اردو میں طنز ومزاح کے ابتدائی نمونے' میں جعفر زٹلی سے ہوتے ہوئے، سودا، انشا اور شیفتہ تک کے نثری اور شعری نمونے پیش کیے ہیں ابھی لکھنے کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔ انیس امروہی نے 'ہماری فلمیں اور عالمی ماحولیات' کا اثر کن کن فلموں پر پڑا اس کی تفصیلات سے آگاہ کیا ہے۔ جہاں انھوں نے خاموش فلموں کا ذکر کیا ہے وہاں انھوں نے متکلم فلم 'عالم آرا' (ماسٹر نثار، زبیدہ، پرتھوی راج کپور، اور ڈبلیو ایم خان) نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے فلم 'جانور انسان' کا ہیرو شمی کپور لکھا ہے جبکہ اس فلم کا ہیرو ششی کپور تھا۔ ویسے مضمون فلم شائقین کے لیے کافی اہم رہا ہے—!

٭ **ضیاء جعفر**: 436 نمبر/94 کراس، بکمار سوامی لے آؤٹ، بنگلور

زیرنظر شمارے میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کا اداریہ نہایت جامع اور قابل غور ہے۔ جو ہم جیسے ادبا وشعرا کے دل کی آواز ہے۔ موصوف نے قومی اردو کونسل کے توسط سے آج تک کی جتنی اشاعتی اور بزم آرا خدمات کا ذکر کیا ہے یہ قدم اردو کی ایک نئی تاریخ کی مرتبت کی جانب گامزن ہے۔ اس کونسل نے بڑی کم مدت میں ایسے گراں قدر کام انجام دیے ہیں جو اس سے قبل کہیں دیکھنے اور سننے کو نہیں ملے اور یقیناً سب کی نگاہیں آج اسی ادارے پر مرکوز ہیں اور بلاشبہ اس کی سرگرمیاں ہندوستان کے علاوہ بیرونی ہند کے اردو دانوں کو بھی مرعوب کیے ہوئے ہیں۔ بقول ارتضیٰ کریم اردو ایک عالمی رابطے کی زبان بن گئی ہے۔ اردو دانوں کے علاوہ دیگر زبانوں کے دانشور اور قلم کار بھی اس زبان سے جڑے ہوئے ہیں اور دوسروں کو جوڑنے کی بابت دلچسپی ظاہر کررہے ہیں۔ اس سلسلے میں ان نئے رجحانات اور جوشیلے مجاہدان اردو، سے اتفاق رائے رکھتا ہوں کہ اردو آج کسی حکومت کی حمایت اور معاونت کی محتاج نہیں رہی ہے۔ باوجود اس کے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل عزت مآب پرکاش جاوڈیکر اردو کونسل اور زبان اردو سے پوری دلچسپی اور اعانت کا ثبوت دے رہے ہیں اور قومی کونسل کی کارکردگی سے مطمئن ومسرور ہیں۔ جناب ظفر گلزار نے پطرس بخاری کی طنز ومزاح نگاری والے مضمون میں پطرس کے تمام تر مضامین کا احاطہ کیا ہے جس میں لاہور کا جغرافیہ، کتے، سویرے جو آنکھ میری کھلی، مرید پور کا پیر، سنیما کا عشق، میبل اور میں، میری بائیسکل اور مرحوم کی یاد میں قابل ذکر ہیں۔ پطرس بخاری کے بارے

میں جہاں تک میرا مطالعہ رہا ہے طنز و مزاح کے وہ واحد ادیب ہیں۔ کم مضامین لکھ کر بکھراں اور بسیط شہرت کے حامل بنے ایسی قسمت دیگر مزاح نگاروں کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔ ان کی حس مزاح میں جو جدت اور ندرت اور شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ایسی انفرادی حسیت کسی اور طنز و مزاح نگار میں دکھائی نہیں دیتی وہ یوں کہ پطرس مغرب مشرق کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادب سے بھی بہ خوبی واقف رہے ہیں۔

فضل حسنین کے دلچسپ مضمون 'زبان زد اشعار میں تحریف' میں انھوں نے زبان زد اشعار میں تحریف اصطلاح کی بجائے تصرف کہتے تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ تحریف کا مطلب ہے کسی شعر کی صورت کا یا تو مسخ ہو جانا یا تبدیل ہو جانا لیکن انھوں نے اپنے منتخب اشعار کی جو فہرست پیش کی ہے بھلے ہی ان اشعار کی اصلیت کچھ اور ہو لیکن زبان زد ہوتے ہوتے تحریف کی بجائے تصرفات کے اضافے کے ساتھ ہی اس کا حسن اور مزید بلاغت کے ساتھ نکھرا ہے جیسے کہ: ابتدائے عشق ہے روتا کیا ہے، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا، اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے، دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا... وغیرہ۔

مضمون نگار نے اختتام مضمون میں بہادر شاہ ظفر کے مشہور شعر:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

کو بہادر شاہ ظفر کی بدنصیبی قرار دیتے ہوئے تحریفاً اپنے مضمون میں شامل کیا ہے جبکہ اس شعر کی بجائے ان کی وہ مشہور غزل جس کا مطلع ہے:

'نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں' کو شامل کیا جاتا تو بہتر ہوتا کہ یہ غزل آج تک بہادر شاہ ظفر کی غزل ہی قرار دی گئی ہے جبکہ باوثوق ذرائع سے یہ انکشاف ہوا کہ یہ غزل بہادر شاہ ظفر کی نہیں بلکہ جاں نثار اختر کے والد محترم مضطر خیرآبادی کی ہے۔ ایسے بہت سارے پوشیدہ حقائق آج بھی جوں کے توں ہیں جن کا پردہ فاش ہونا ضروری ہے۔

❖ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

مئی کا تازہ شمارہ 'اردو دنیا' نظر نواز ہوا۔ مشمولات کا انتخاب اچھا ہے۔ اداریہ جہاں ایک طرف اردو کے فروغ و ترقی کے مسائل پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے وہیں اہل اردو کو بھی اپنی اپنی ذمے داریوں کا احساس دلاتا ہے۔ اردو کے موجودہ پس منظر میں قومی کونسل کی سرگرمیوں اور جد و جہد سے انکار نہیں کیا جا سکتا، یقیناً یہ اردو زبان کے فروغ میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے لہٰذا اس تحریک کو گھر گھر پہنچایا جائے۔ محترم محبوب خان اصغر کا پروفیسر بیگ احساس سے انٹرویو، پسند آیا۔ موصوف کے انٹرویو کا عنوان 'سنجیدہ اور پاپولر لکھنے والوں کے درمیان فرق مٹ گیا' سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ سفینہ بیگم کا مقالہ 'وجودیت اور اردو ناول' کافی محنت اور عرق ریزی کے بعد قلم بند کیا گیا ہے، جو قابل داد ہے۔ پطرس بخاری مرحوم پر مضمون بھی اپنے انداز کی بہترین تحریر ہے۔ محترم سلیم محی الدین خان کی کاوش 'عالم کاری، زبان و ادب اور سوشل میڈیا عصری پس منظر میں' بہترین مقالہ ہے۔ انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، فیس بک وغیرہ نئے زمانے کی وہ اختراعات ہیں جو ہمارے معاشرے کے ہر پہلو پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اردو زبان کے اخبارات و رسائل کی قلیل تعداد میں انٹرنیٹ کا سب سے بڑا دخل ہے، محترم پرویز اشرفی ہمارے عصر کے نمائندہ تحقیق کاروں میں سے ہیں ان کی تحریریں اپنے معیار و اعتبار اور اسلوب کے لحاظ سے عمدہ ہوتی ہیں۔ سہسرام پر ان کی تحریر دلچسپ ہے، صفحہ 59 پر سرسید مرحوم کا تصور علم فکر انگیز مضمون ہے۔ مرحوم کے قومی، ملی، صحافتی اور علمی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے ایک عظیم مصلح، ماہر تعلیم اور قوم بردار شخص تھے۔

❖ **عبداللہ عثمانی**: 4/16 گری واڑہ، سہارنپور، دیوبند، یوپی

چوتھی عالمی اردو کانفرنس کی دیدہ زیب تصاویر اور سیر حاصل روداد سے مزین مئی 2017 کا تازہ ترین اردو دنیا نظر نواز ہوا... اس میں شک نہیں کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان فروغ اردو کے لیے ہر مستحسن قدم اٹھانے کی پہل کرتی اور ماشاء اللہ کامیاب ہوتی ہے... میں بھی این سی پی یو ایل کی کارکردگی کے مداحوں میں ہوں... خدا اردو کو دن دونی رات چوگنی ترقی یافتہ زبان بنائے۔

❖ **شکیل احمد سہسرامی**: پٹنہ، بہار

ہماری بات میں مدیر نے کہا ہے کہ ہمارے اشاعتی ادارے جو نہ صرف علوم و فنون عوام و خواص تک پہنچا رہے ہیں بلکہ ایک تہذیبی، تمدنی، تاریخی اور لسانی شعور کو بھی بیدار کر رہے ہیں۔ فاروق ارگلی نے کہا کہ اردو کی خدمت کرنے والا ہر شخص آج کے دور میں گویا عبادت کر رہا ہے۔ آپ کی بات سچ ہے میری دانست میں اردو کو جو شخص نسل نو تک پہنچائے گا اور اردو کی ترقی و ترویج کے لیے بے لوث کام کرے گا اس کو عبادت کا ثواب ملے گا۔

باب مطبوعات میں قومی اردو کونسل کی اشاعتی خدمات میں محمد آدم نے تحریر کیا کہ 16 جون 1973 اور 5 نومبر 1975 کو ترقی اردو بیورو بعد میں سرکاری ادارہ NCPUL بنایا گیا۔ NCPUL کا باضابطہ قیام یکم اپریل 1996 میں عمل میں آیا اور یہ ادارہ ترقی انسانی وسائل کے تحت کام کرتا ہے۔ اس ادارے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس سے اردو زبان کا فروغ و ترقی ہو، سائنس اور ٹکنالوجی شعبوں سے اس کو مربوط کیا جائے میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ NCPUL نے کل ہند سطح پر اردو کو عصری ٹکنالوجی و عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی مساعی جمیلہ کی ہے اور اردو قاری کو عصری ماحول سے مطابقت پیدا کروانے میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ادارے اداروں سے تقویت اور فروغ پاتے ہیں۔ یہ شمارہ مطبوعات نمبر کے ساتھ بحر العلوم کا مرکز و منبع بن گیا ہے۔

ماہ مئی 2017 کا اردو دنیا کے سرورق پر چوتھی عالمی اردو کانفرنس کی افتتاحی تصویر شائع کی گئی ہے۔ ہماری بات میں مدیر نے عالمی اردو کانفرنس میں جو تجاویز اور بحث و مباحثہ ہوئے اس پر عملی جامہ پہنانے کی بات کی ہے۔ اس کانفرنس میں اردو زبان و ادب کے علاقائی و ریاستی قومی اور عالمی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ محبوب خاں اصغر نے پروفیسر بیگ احساس سے جو انٹرویو لیا ہے وہ زبان، تنقید، تحقیق، افسانہ کے علاوہ دانش مندانہ اظہار ہے اور ادبی معلومات سے مزین ہے۔ پروفیسر بیگ احساس نے ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور بعد کے ادبی تنقیدی رجحانات کا غیر جانبدارانہ محاکمہ کیا ہے۔ محمد احسن نے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی صورت حال میں سچائی اور حقائق سے کام لیا ہے۔

اس شمارے کے دیگر مشمولات و مضامین نیا پہلو لیے ہوئے ہے۔ غرض اس میں ادب، سائنس، تاریخ، سماجیات کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔

❖ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موتاز

اپریل/مئی کی اس تپتی، سلگتی، دوپہری میں 'اردو دنیا' کی آمد اذہان و دل پر کسی بارش سے کم نہیں۔ ممنون و مشکور ہوں کہ بروقت تمام شمارے موصول ہو رہے ہیں اور مشمولات سے محظوظ ہونے کے مواقع میسر آ رہے ہیں۔ اداریہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے حوالے سے نہایت اہم نکات پر روشنی ڈالتا ہے۔ شعیب رضا فاطمی نے عالمی کانفرنس کے حوالے سے اردو زبان و ادب کا نہایت عمدہ منظر نامہ پیش کیا ہے، پروفیسر بیگ احساس سے انٹرویو ایک کامیاب تجربہ ہے کہ ادبی ازم اور ادب کی دیگر اصناف پر اس میں سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ محمد احسن، مشتاق احمد، فضل حسنین، سفینہ بیگم، ظفر گلزار، مزمل سرکھوت، محمد شاہد حسین، سلیم محی الدین، محمد وصی اللہ حسینی، رضی احمد، شہزاد انجم، ابواسامہ، پرویز اشرفی، جہانگیر اکرم، م ق سلیم، ارشد قمر، توصیف خان، شمس الاسلام فاروقی ان تمام خواتین و حضرات کی ادبی کاوشیں لاجواب ہیں کہ منفرد اور جدید تر مسائل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ تبصرہ و تعارف بذات خود ایک ادبی دبستان نظر آتا ہے۔ قومی اردو کونسل کی علمی و ادبی سرگرمیاں لائق ستائش ہیں۔

❖ **ڈاکٹر رضوان اللہ ارم**: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور ویمنس کالج،

افسانہ کے نام پر انشائیے لکھے جارہے ہیں

نورالحسنین

معین الدین عثمانی

نورالحسنین اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہیں۔ 1980 کے بعد اردو فکشن کو نئی جہت دینے والوں میں نورالحسنین کا شمار ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے فکشن نگار ہیں بلکہ انہوں نے ڈراما نگاری، فیچر نگاری بھی کی ہے اور بچوں کے ادیب کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اصلاحی معاشرتی اور سماجی پہلوئوں کو اچھی طرح برتا گیا ہے۔ ان کے ناولوں میں تاریخ کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ فکشن تنقید پر لکھی ان کی کتابیں بھی لائق مطالعہ ہیں۔ پیش ہیں ان سے حال ہی میں لیے گئے انٹرویو کے اقتباسات:

معین الدین عثمانی: نورالحسنین صاحب آج ادبی حلقوں میں آپ کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ نے افسانے، ناول، تنقیدی مضامین، ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے اور فیچرز، خاکے، بچوں کے لیے کہانیاں لکھی ہیں۔ اسٹیج اور ریڈیو کے ڈراموں میں کام بھی کیا، آپ کے افسانے اور ڈرامے تعلیمی نصاب میں شامل رہے۔ آج بھی آپ کا قلم رواں ہے۔ اپنے تخلیقی سفر کے آغاز سے متعلق بتائیے، آپ کا پس منظر کس طرح کا تھا۔

نورالحسنین: عثمانی صاحب، میری پیدائش ایک صوفی علمی اور جاگیردار گھرانے میں ہوئی، لیکن سقوط حیدر آباد کے بعد سب کچھ ختم ہوگیا، اور پھر ملازمتیں ہی مقدر ٹھہریں۔ میرے دادا سید نورالمقتدیٰ نقشبندی خود ایک عالم تھے۔ آپ نے 156 نقشبندی سلسلے کے صوفیوں کے حالات قلم بند کیے تھے اس کے علاوہ اورنگ آباد کے مشہور اور غیر معروف تین سو شعراء کے حالات زندگی اور اُن کے کلام کے نمونے جمع کیے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی سید نورالضیا نقشبندی حیدر آباد کے نظام میر عثمان علی خان کے دربار میں مفتی تھے جنھیں ضیا یار جنگ بہادر کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔ سکندر علی وجد میرے ننھیالی رشتے دار تھے تو حمایت علی شاعر میرے حقیقی پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ اس ماحول نے بچپن ہی سے مجھ میں لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ جب میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا، تب میں نے اپنی پہلی کہانی 'انسانیت' لکھی تھی جو ممبئی سے شائع ہونے والے اخبار 'ہندوستان' کے بچوں کے صفحے میں شائع ہوئی تھی۔ بس اس کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا۔

م ع: اور آپ کی ادبی رسائل میں آمد۔

نورالحسنین: پہلے تو کمرشیل رسائل، بانو، شمع، شکیلہ، چترا وغیرہ میں اس کے بعد جواز (مالیگاؤں) گلبن (احمد آباد) میں افسانے شائع ہوئے اور پھر ہندو پاک کے مختلف رسائل میں سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔

م ع: آپ نے اپنی ملازمت کا آغاز تو درس وتدریس سے کیا تھا، بعد میں ریڈیو کی ملازمت میں آگئے۔ آپ کو زیادہ اطمینان اور مسرت کہاں میسر آئی؟

نورالحسنین: میں نے کسی بھی جگہ ملازمت کو ملازمت سمجھ کر کام نہیں کیا، بلکہ اُسے اپنا شوق و ذوق سمجھا، اور ہر دو جگہ خوب محنت کی، میرے شاگرد آج بھی میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ ریڈیو کی ملازمت کو قبول کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں بچپن ہی سے ڈراموں میں کام کرتا تھا۔ ریڈیو میں میرے اس شوق کی بھی تکمیل ممکن تھی۔

م ع: علاقہ دکن سے آپ کا تعلق ہے۔ اس کے تہذیبی اثرات آپ کی تحریروں میں محسوس ہوتے ہیں۔ عالم کاری کے اس دور میں کیا یہ مناسب ہے؟

نورالحسنین: عثمانی صاحب آپ کا یہ سوال بڑا عجیب ہے۔ دور خواہ کچھ رہے، کیا انسان اپنے علاقے، اپنی تہذیب، اپنی زبان، اور اپنے ماحول سے کٹ کر رہ سکتا ہے؟ ادیب یا شاعر وہی لکھتا ہے جو وہ دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے۔ مجھے زیادہ خوشی محسوس ہوتی ہے جب کوئی میری تحریروں میں دکن کی بو باس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر بھی میں نے کوشش کی کہ پھیل کر لکھ سکوں۔ چنانچہ ناقدین نے مجھے ایک متنوع افسانہ نگار بھی لکھا ہے۔ میں نے مقامی، ریاستی اور عالمی موضوعات پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ میرا پہلا ناول 'آہنکار' اگر علاقائی پس منظر پر ہے تو دوسرا ناول 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' 1857 کی جنگِ آزادی پر محیط ہے جس میں پورا ہندوستان ہے۔ تیسرا ناول ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' میں 'عشق' موضوع ہے، اس کی زمین ہندوستان بھی ہے، یونان بھی ہے، عرب بھی ہے۔ میرے ان تینوں ناولوں کو پسند بھی کیا گیا۔ کیا مناسب ہے؟ اور کیا مناسب نہیں ہے؟ عالم کاری کے اس عہد میں میں یہ نہیں سوچتا۔ البتہ اس بات پر زور دیتا ہوں کہ مجھے وہ لکھنا ہے جس سے بھی میرے ملک کے حالات دوچار ہوئے تھے یا جو میں دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں۔

م ع: حسنین صاحب آپ نے بچوں کے لیے بھی لکھا ہے، مگر زیادہ نہیں، البتہ آپ نے ساری توجہ فکشن پر دی، ادبِ اطفال اس سے محروم رہا۔ ایسا کیوں؟

نورالحسنین: عثمانی صاحب یہ سچ ہے کہ میری ابتدا بچوں کی کہانیوں سے ہوئی تھی۔ وہ بچپن تھا، اس کے بعد تو میں افسانوں اور ڈراموں کی طرف چلا آیا، دو تین کتابیں

بچوں کے لیے بھی شائع ہوئیں وہ بھی میں نے خاص طور پر نہیں لکھیں، بلکہ ریڈیو کی ملازمت نے مجھ سے لکھوائیں۔ بچوں کے لیے لکھنا آسان بات نہیں ہے۔ کبھی آپ بچوں کے لیے لکھ کر دیکھیے، آپ کو بھی اندازہ ہو جائے گا۔

م ع : آپ کے افسانوں کا سفر جدیدیت کے اثرات سے شروع ہوا، مگر ان دنوں آپ کے افسانے روایت کا دامن تھامے آگے بڑھ رہے ہیں۔ کون سا احساس تھا جس نے آپ کو مراجعت کے لیے پابند کیا؟

نورالحسنین: یہ سچ ہے کہ جب میں نے افسانہ نگاری شروع کی تو وہ جدیدیت کا دور تھا۔ اس لیے اس کے اثرات تو ہونے ہی والے تھے، میں آج بھی جدیدیت کا مخالف نہیں ہوں۔ مجھے اختلاف اُن لوگوں سے ہے جو بنا سوچے سمجھے اس لہر میں کود پڑے تھے اور افسانے کے نام پر انشائیے اور معلوم نہیں کیا کچھ لکھ رہے تھے۔ قاری کو بھگانے میں جدیدیت کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ وہ کمزور اور لایعنی تحریریں تھیں جن کے انبار نے ادب کو ادب نہیں رکھا تھا۔ بھائی صاحب اگر جدیدیت کا رجحان نہیں آتا تو آج جو افسانہ لکھا جا رہا ہے وہ بھی نہیں لکھا جاتا۔ آج کا افسانہ وہ روایتی نہیں ہے بلکہ اُس میں کہانی اور کردار کے ساتھ ہی ساتھ علامت، استعارہ، تشبیہ، تکنیک، اسلوب کے نئے رنگ سب کچھ شامل ہیں۔ میرے ابتدائی افسانوں میں بھی علامتی انداز کم اور تمثیلی انداز زیادہ تھا۔ جس طرح میرے معاصرین سوچ رہے تھے وہی احساس میرا بھی تھا۔ جس کی مثال میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سمٹتے دائرے' ہے۔

م ع : جدیدیت کے دور میں آپ کا لکھا ہوا ایک کامیاب افسانہ 'رنگوں کے اسیر' اردو فکشن کو میسر آیا تھا۔ وہ مجھے اب بھی یاد آرہا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر آپ اسی ڈگر پر چلتے تو ممکن تھا فکشن کو مزید ایسے عمدہ افسانے ملتے۔ کیا اس بات کا آپ کو افسوس ہوتا ہے؟

نورالحسنین: وقت اور حالات اپنے موضوعات سجھاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ایک وقت تھا جب افسانہ 'بازیگر' اور 'رنگوں کے اسیر' میری پہچان بن گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد میری نئی پہچان '' گڑھی میں اُترتی شام، وصیت، تقلیب اور' ایک زندہ کہانی' سے ہوئی اور اب میرے قارئین افسانہ' کلمہ گو، سبزہ نورستہ کا نوحہ، اور 'پیپل کی چھیاں' سے کرتے ہیں۔ میرا کام لکھنا ہے اور پسند کرنا یا رجیکٹ کرنا یہ قاری کا مسئلہ ہے۔

م ع : فکشن کی تخلیق کے ساتھ آپ نے تنقید کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی، کیا یہ ناقدین کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے؟

نورالحسنین: آپ کا یہ سوال سن کر مجھے ہنسی آرہی ہے۔ ناقدین کے ساتھ میں کیا ناانصافی کروں گا۔ میں ناقدین اور تنقیدی ادب کا احترام کرتا ہوں۔ ہمارے بزرگ ناقدین نے جب یہ اعلان کیا کہ نئی نسل کو اپنے ناقد خود پیدا کرنا چاہیے تو شوکت حیات، حسین الحق، بیگ احساس، سید احمد قادری، اور سلام بن رزاق وغیرہ کے ساتھ ہی ساتھ میں نے خورشید حیات اور احمد صغیر نے بھی تنقید کی طرف توجہ دی، لیکن آج بھی میں اپنے آپ کو ناقد کہلوانا پسند نہیں کرتا، باوجود اس کے کہ میں نے اپنے آپ سے ایک عہد کیا ہے کہ میں اپنے تمام معاصرین پر مضامین لکھوں گا اور میں لکھ رہا ہوں۔

م ع : آپ کی فکشن کی تنقید پر علاقائیت اور جانبداری کی گفتگو ہونے لگی تھی۔ کیا آپ کو اس بات کا اعتراف ہے؟

ن ح : یہ اطلاع تو مجھ تک نہیں پہنچی، آپ سے کس کس نے یہ بات کہی مجھے معلوم نہیں۔ میں نے شفق، شوکت حیات، عبدالصمد، بیگ احساس، سید محمد اشرف، سید احمد قادری، م۔ ق۔ خان، سلام بن رزاق، مشتاق احمد نوری، فخرالدین عارفی، اسلم جمشید پوری، نگار عظیم، یسین احمد، قمر جمالی، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، بانو سرتاج، اشتیاق سعید، ایم۔ مبین وغیرہ کے ساتھ ہی ساتھ آپ پر، عارف خورشید، عظیم راہی پر بھی تفصیلی مضامین لکھا اور بھی کچھ نام ہیں جو مجھے اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں۔ ان ناموں میں دیکھ لیں اور خود ہی فیصلہ کرلیں کہ آپ کا الزام کہاں تک درست ہے۔

م ع: معاشرے میں سیاسی، سماجی سطح پر غیر محسوس طریقے سے جاگیردارانہ نظام آج بھی قائم ہے اور ادب کے ایوانوں پر نقادوں کا راج ہے۔ آپ کے تئیں اُن کا رویہ کیسا رہا؟

نورالحسنین: آپ ایک سابق جاگیر کی اولاد کو جاگیردارانہ نظام کا طعنہ دے رہے ہیں۔ (ہنستے ہوئے) بھائی اب جاگیر ہی نہیں رہی تو کیسا جاگیردارانہ نظام؟ اب تو سرمایہ دارانہ نظام اور غنڈہ راج کا زمانہ ہے۔ عثمانی صاحب افسوس تو اسی بات کا ہے کہ ادب پر اب ناقدین کی پکڑ کی بات تو دور رہی سینئر ناقدین نئے ادیبوں کو پڑھتے بھی نہیں۔ میں اُن کا بھی شاکی نہیں ہوں، اُن کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ساری ادبی دنیا میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ سب کچھ پڑھتے بیٹھیں۔ پھر ہر انسان کی اپنی ایک پسند بھی ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے اُنھوں نے مجھے نظر انداز بھی نہیں کیا یہ اور بات ہے کہ تفصیلی طور پر نہ سہی لیکن پھر بھی میرا ذکر تو ہوتا ہی رہا۔ میں نے کبھی شعوری کوشش بھی نہیں کی کہ مجھ پر کچھ لکھوایا جائے۔ ہاں یہ کوشش ضرور کی کہ جو بھی لکھوں محنت سے لکھوں، کام اگر اچھا ہوگا تو خود ہی لوگ متوجہ بھی ہوں گے۔ ویسے میرا یہ ایمان ہے کہ تنقید صرف جائزہ لیتی ہے وقت فیصلہ کرتا ہے۔ اس لیے اس وقت کو غنیمت جان کر اچھا لکھنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

م ع : PRO شپ کے اس زمانے میں آپ کے

سوانحی کوائف

نام: سید نورالحسنین نقشبندی

قلمی نام: نورالحسنین

تاریخ پیدائش: 19 مارچ 1950 اورنگ آباد (مہاراشٹر)

تعلیم: ایم اے (اردو)

ملازمتیں: • معین العلوم ہائی اسکول اورنگ آباد • اناؤنسر آکاش وانی اورنگ آباد • گیان وانی اورنگ آباد

کتابیں: • سمٹتے دائرے (افسانے) 1985، • موررقص اور تماشائی (افسانے) 1988، • گڑھی میں اترتی شام (افسانے) 1999، • فقط بیان تک (افسانے) 2012، • خوش بیانیاں (خاکے) 2003، • آہنکار (ناول) 2005، • انسان امر ہے (ڈرامے اور فیچرز) 2009، • بچوں کے لیے 'گڈو میاں' (کہانیاں) 1988، • حضور کا اقبال بلند رہے (ڈرامے) 2008، • چوتھا شہزادہ (کہانیاں) 2009، • نیا افسانہ نئے نام (تنقید) 2012، • اقبال متین سے اُنسیت (اقبال متین پر تنقیدی کتاب) 2012، • ایوانوں کے خوابیدہ چراغ (ناول) 2013

اعزاز و انعام: • مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کا 'شاہ سراج اورنگ آبادی' ریاستی ایوارڈ 2009، • 'سمٹتے دائرے' مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی اترپردیش اردو اکادمی، • 'مور رقص اور تماشائی' مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، • 'گڑھی میں اترتی شام' مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، • 'اہنکار' ناول فکشن ایوارڈ، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، • 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' فکشن ایوارڈ 2013 اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، • 'پاسبان تعلیم' اعتراف نامہ ادبی خدمات 2015 فیڈریشن آف آل مائنارٹی ایجوکیشنل آرگنائزیشنس (فیم)

صحافت: • مزاحیہ کالم فرمایا نورالحسنین نے (روزنامہ آج)، • مزاحیہ کالم 'بات سے بات' روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز

مدیر: دلرس، کتابی سلسلہ (سہ ماہی)

رہائش: مکان نمبر 1-12-31، پرگتی کالونی، محلہ گھاٹی اورنگ آباد۔ 431001 (مہاراشٹر)

درویشانہ مزاج کے باوجود بھی جو ادبی مقبولیت آپ کو ملی ہے کیا آپ اُس سے مطمئن ہیں؟

ن ح : آدمی کا مطمئن ہو جانا موت کی علامت ہے۔ میں ان سب باتوں کو نہیں سوچتا، میں نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دے دیا جس کی وجہ سے مجھ پر مقبولیت اور شہرت کے دروازے کھل جائیں گے۔ میرے لیے تو یہی بہت ہے کہ اس لکھنے پڑھنے کی وجہ سے کچھ ادبی شخصیات میرے نام سے بھی واقف ہو گئیں۔ میری ایک شناخت بن گئی، کیا یہ کافی نہیں ہے؟

م ع : علاقائی، ملکی، اور بین الاقوامی سطح پر بے شمار موضوعات بکھرے پڑے ہیں، پھر بھی ایسے میں اُردو میں عالمی معیار کا کوئی افسانہ یا ناول ضبطِ تحریر میں نہیں آسکا، نقادانِ ادب مایوس ہو چکے ہیں۔ کیا وجوہات ہیں؟

ن ح : مجھے آپ کے اس سوال سے اتفاق نہیں ہے۔ اس بات کا جواب میں نہایت تفصیلی بلکہ دلائل کے ساتھ دے سکتا ہوں، لیکن دو چار صفحات کے اس انٹرویو میں قاصر ہوں، پھر بھی آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دنیا کی تمام ادبی زبانوں میں کم عمر ہونے کے باوجود یہ اُردو ہی ہے جس کے ادب کو بین الاقوامی ادب کے مقابل رکھا جاسکتا ہے۔ ہاں بقول آپ کے اگر ناقدین ادب مایوس ہو چکے ہیں تو انھیں اپنی آنکھوں پر سے مغربی پیمانوں کی عینک کو اُتار کر مشرقی ماحول اور اُس کی تہذیب اور اُس کے حدود کو سامنے رکھ کر دیکھنا ہوگا تو ان شاء اللہ وہ مایوس نہیں ہوں گے۔ بھائی یہ سب احساسِ کمتری کی باتیں ہیں۔

م ع : ان دنوں افسانہ تو لکھا جا رہا ہے مگر اچھا افسانہ خال خال ہی پڑھنے کو ملتا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟

نورالحسنین: عثمانی صاحب آپ خود بھی ایک افسانہ نگار ہیں۔ کیا آپ کا ہر افسانہ شاہکار ہے؟

م ع : کہا جا رہا ہے کہ یہ فکشن کی صدی ہے اور ناول پر بہار ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

نورالحسنین: میرا خیال ہے جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ درست ہی کہا جا رہا ہے۔ ان پندرہ بیس برسوں میں جس قدر زیادہ ناول لکھے گئے وہ بہار کے مترادف ہی ہیں۔ ان میں بعض تو واقعی لاجواب ہیں اور کچھ کمزور بھی ہیں۔

م ع : آپ نے 1857 کی جدوجہد آزادی کی تاریخ سے استفادہ کر کے 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' جیسے ناول کی تخلیق کی ہے، مگر بعض لوگ اسے فکشن کے اُصولوں سے روگردانی مانتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

نورالحسنین: اس ناول پر جس قدر بھی مضامین آئے اُس میں یہ بات تو کسی نے نہیں لکھی۔ تاریخی موضوعات پر ابتداء ہی سے ناول لکھے جا رہے ہیں۔ آئندہ بھی لکھے جائیں گے۔

م ع : بعض ناقدین ادب کے مطابق آپ کا ناول 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' الگ الگ گذشتہ تہذیبی معاشقوں کی داستان ضرور ہے مگر ایک مربوط ناول کا پلاٹ نہیں ہے۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ن ح : ناقدین کی اس رائے کا تو مجھے علم نہیں ہے۔ یہ ایک تجربہ ضرور ہے لیکن نیا نہیں ہے۔ داستانوی ادب کا جائزہ لیں تو الف لیلیٰ بھی مختلف داستانوں پر مشتمل ہے۔ 'باغ و بہار' بھی چار درویشوں اور ایک لاولد بادشاہ کی داستان ہے۔ مہا کاویہ 'مہابھارت' میں بھی کئی ذیلی داستانیں ہیں۔ میں نے ناول میں یہ تجربہ کیا، میری اس ناول کے راوی عشق اور چاند ہیں وہ ہی ساری داستانوں کو مربوط کرتے ہیں۔ بلکہ میرے اس ناول کو بہت زیادہ پسند بھی کیا جا رہا ہے۔ جن مضامین کے حوالے سے آپ نے یہ بات کہی ہے اگر مجھے بھی بتادیں تو میں آپ کا ممنون رہوں گا۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ میں تنقید کا احترام کرتا ہوں۔

م ع : اپنے معاصرین کے درمیان آپ خود کو کس جگہ محسوس کرتے ہیں؟

نورالحسنین: اُن کے ساتھ ہی محسوس کرتا ہوں۔

م ع : اپنے کام کے تناسب میں ہونے والی پذیرائی سے کیا آپ کو اطمینان ہے؟

نورالحسنین: میں نے ابھی ایسا کوئی بڑا کام کیا ہی نہیں ہے۔ پذیرائی، اطمینان یہ بہت بڑے بڑے الفاظ ہیں۔ ہاں دوستوں کی ہمت افزائی مجھے حوصلہ دیتی ہے۔ یہی میرے لیے بہت کچھ ہے۔

م ع : آج کل ادیب و شاعر رسائل میں گوشہ گیری، جشن منانا، اور کتابیں لکھوا کر ادبی سکہ جمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے زبان و ادب کا کیا بھلا ہو سکتا ہے؟

نورالحسنین: یہ دور خود کو پروجکٹ کرنے کا دور ہے۔ جن کے پاس کچھ ہوتا ہے شاید وہی لوگ یہ سب کروا رہے ہیں۔ بہت پہلے آپ نے بھی اپنے دور رسائل میں گوشے شائع کروائے ہیں۔ اس سے زبان و ادب کو کیا فائدہ ہوا ہوگا یہ تو مجھ سے زیادہ آپ ہی جان سکتے ہیں۔

م ع : اپنے معاصرین میں کن فنکاروں کے یہاں افسانہ اور ناول کے بہترین امکانات کی رمق آپ کو دکھائی دیتی ہے؟

نورالحسنین: میرے سارے ہی افسانے معاصرین امکانات کی رمق سے بہت بلند ہو چکے ہیں بلکہ اُن میں سے بہت سارے تو افسانہ اور ناول کے معتبر نام بن چکے ہیں۔

م ع : الیکٹرانک میڈیا کے مقابل اردو کا مستقبل کیسا ہوگا؟

نورالحسنین: روشن۔ میڈیا، فلم اور ٹیلی ویژن اردو کے بغیر ادھورا ہے۔

م ع : کیا واقعی اردو ترقی کر رہی ہے؟

نورالحسنین: مجھے تو یہی لگتا ہے۔ میں آپ کو اپنے شہر سے مثال دیتا ہوں، میرے بچپن میں اورنگ آباد میں اردو کے تین ہائی اسکول، ایک مڈل اسکول اور دو کالج تھے جن میں اردو مضمون بھی شامل تھا۔ آج اورنگ آباد میں کوئی ایسی گلی نہیں ہے جس میں اردو اسکول نہیں ہے۔ لڑکیوں کے لیے علیحدہ سے ایک ویمن کالج ہے جس میں اردو اور انگریزی میڈیم میں تعلیم دی جاتے ہے۔ کئی کالجس ہیں جن میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ یونیورسٹی میں شعبہ اردو قائم ہے۔ شہر میں پانچ چھ اردو روز نامے شائع ہوتے ہیں۔ 'عالمگیر ادب' جیسا ضخیم کتابی سلسلہ شائع ہوتا ہے اس کے علاوہ سہ ماہی 'عکس ادب' پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ یہ ایک چھوٹے شہر کا حال ہے ایسے شہر ہندوستان میں بے شمار ہیں۔ صرف قومی کونسل کے تعاون سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ادبی جلسے اور سمینار منعقد ہو رہے ہیں۔ اسے اردو کی ترقی ہی کہا جائے گا نا؟ اب رہی معیار کی بات تو اس کے ذمہ دار آپ اور ہم ہیں۔

م ع : فی الحال آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

نورالحسنین: ایک ناول کی تیاری میں مصروف ہوں۔

م ع : نو واردانِ ادب کے لیے آپ کے پاس اُن کی ذہن سازی کا کیا منصوبہ ہے؟

نورالحسنین: منصوبہ وہ بناتا ہے جو اُس پر عمل کروانے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ میں کیا منصوبہ بناؤں گا؟ ہاں نئے لکھنے والوں کو مشورہ دے سکتا ہوں کہ سب سے پہلے وہ زبان پر محنت کریں، مطالعے کی عادت ڈالیں، تقلید سے بچیں، غور کریں کہ جدیدیت کے بعد بھی اردو افسانہ چالیس برس کا عرصہ گزار چکا ہے۔ اسلوب اور تکنیک میں اب کیا تبدیلی لائی جاسکتی ہے؟ جس سے افسانے کے ایک نئے دور کا آغاز ہو سکے۔

م ع : نورالحسنین صاحب اس ملاقات کے لیے آپ نے وقت دیا، اس کے لیے آپ کا شکریہ۔

ن ح : عثمانی صاحب آپ کا بھی شکریہ

■

Moinuddin Usmani
264 Shahu Nagar Jalgaon - 425001 (MS)
Mob.:09420390562, 9921299749
Noorul Hasnain
1-12-31, Pragati Colony Ghati
Aurangabad-431001 (Maharashtra)

عالمی اردو کانفرنس
مندوبین کے تاثرات

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نئے ہزارے کے شروع میں متمدن اقوام کے مابین ہم کلامی کے لیے ایک عالمی ایجنڈا (U.N. Global Agenda for Dialogue Among Civilisation) منظور کیا تھا تاکہ اقوام عالم کو ایک دوسرے کے ساتھ بہتر اور دوستانہ تعلقات رکھنے میں مدد ملے اور وہ ایک دوسرے کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو ٹھیک سے سمجھ سکیں۔ اس ایجنڈے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ یہ اعادہ کیا گیا تھا کہ مختلف تہذیبوں میں جو چیزیں مشترک ہوں ان کی پہچان کی جائے، انھیں فروغ دیا جائے، ہم کلامی میں شرکت کی نوعیت کو آفاقی شکل دی جائے اور سبھی تعلیم یافتہ لوگ، مفکرین، دانشور، مصنفین، سائنسداں، فنکار، ثقافت اور ذرائع ابلاغ سے وابستہ افراد و نوجوان اس ضمن میں اہم کردار ادا کریں اور حکومتیں اس طرح کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے عمل کو سہل بنائیں اور اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے مناسب اقدام و تدابیر کریں جیسے کانفرنس، سمپوزیم اور ورکشاپ وغیرہ کا انعقاد، تاکہ مختلف معاشروں اور تہذیبوں کی نمائندگی کرنے والے دانشور، مفکرین اور فنکاروں کے درمیان بہتر روابط قائم ہوں، انھیں مبادلۂ خیالات کے مواقع حاصل ہوں اور ان کی کما حقہ ہمت افزائی ہو اور ساتھ ہی مختلف تہذیبوں والے ممالک کی زبان، تاریخ اور معاشرتی و سیاسی افکار کو تعلیمی نصاب میں شامل کرنے اور اس غرض سے تحقیقاتی کام سرانجام دینے میں مدد ملے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیراہتمام منعقد چوتھی عالمی کانفرنس اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس کانفرنس میں صرف کونسل کی اردو کے تئیں خدمات اور اس کی فعالیت کو ہی نہیں سراہا گیا بلکہ اس کی وسعت پذیری اور مزید وسعت پذیری کے امکانات کا بھی جائزہ لیا گیا۔ اس کانفرنس میں امریکہ، جرمنی، کناڈا، ترکی، سعودی عرب، ایران، دبئی، ماریشس جیسے ممالک کے نمائندوں کی شرکت، جن میں بیشتر مندوبین نوجوان نسل کی نمائندگی کر رہے تھے، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اردو کو آفاقی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور دنیا کے بیشتر ممالک میں نہ صرف اردو کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہے بلکہ ہر شعبۂ ادب میں تخلیقی کام ہو رہا ہے۔ اردو اخبارات اور جرائد بھی شائع ہو رہے ہیں اور کچھ معدوم روایات کا احیائے نو بھی ہو رہا ہے جیسے داستان گوئی۔ اردو کی اس آفاقیت کو تقویت تب حاصل ہوگی یا یوں کہیے کہ اس میں چار چاند تب لگیں گے جب یہ پیغام دنیا کے دیگر ممالک تک بھی پہنچے اور اس طرح کے پروگراموں، سمیناروں اور کانفرنس کا انعقاد بیرون ملک بھی ہوتا کہ باذوق عاشقان اردو کو دنیا کے ہر حصے میں اردو کی خوش ذوقی، لذت شیریں اور نرم خوئی سے باور کرایا جا سکے اور وہ یہ جان سکیں کہ سرزمین ہند تمام زبانوں کے فروغ کے لیے کتنی زرخیز ہے اور ہندوستان صرف جغرافیائی اعتبار سے ہی وسیع و عریض ملک نہیں بلکہ یہ کشادہ ذہن اور وسیع المشرب عوام کا مسکن ہے جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے صدیوں سے مل جل کر رہتے آئے ہیں۔ جن ممالک میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی خاصی تعداد ہے اور جہاں لوگ اردو سیکھنے کے خواہاں ہیں وہاں ہندوستانی سفارت خانوں میں ہندی کی طرز پر اردو سکھانے کے مراکز بھی قائم کیے جا سکتے ہیں اور وزارت

خارجہ و وزارت داخلہ اس تجویز پر ہمدردانہ غور کر سکتی ہیں۔ جس ملک کے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل (عزت مآب جناب پرکاش جاوڈیکر) اس عالمی کانفرنس کی افتتاحی و الوداعی تقریر میں یہ یقین دلائیں کہ اردو کو نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک میں فروغ دینے کی کوشش کی جائے گی اور وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل (عزت مآب ڈاکٹر مہیندر ناتھ پانڈے) یہ بیان دیں کہ ہندوستان میں اردو کا سب سے زیادہ کام ہو رہا ہے، اس زبان کو کسی اور بیساکھی کی ضرورت نہیں۔

—**خواجہ عبدالمنتقم**، سابق ایڈیشنل لیجسلیٹو کاؤنسل و ڈائریکٹر حکومت ہند و سابق وزیٹنگ پروفیسر ایمٹی یونیورسٹی

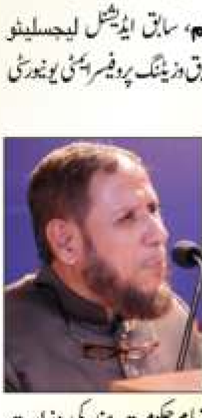

17 مارچ کی صبح پروگرام کا پہلا دن تھا، چوتھی عالمی اردو کانفرنس 'ہندوستان اور بیرونی ممالک میں اردو کا منظر نامہ' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام حکومت ہند کی وزارت ترقی انسانی وسائل کی چھتر چھایہ میں آغاز کے مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ صبح سویرے ناشتے کے لیے ہوٹل کی کینٹین میں جمع ہونا تھا۔ شہاب الدین بھی دہلی پہنچ گئے تھے۔ پروفیسر ارتضی کریم کے ہمراہ ان کی اہلیہ محترمہ بھی ناشتے کی میز پر تشریف رکھتی تھیں دیگر تمام ساتھی بھی یکے بعد دیگرے جمع ہونے لگے مختلف میزیں مہمانوں سے سج گئیں۔ ناشتہ کے بعد، اشوکا ہوٹل کے خوبصورت وسیع و عریض ہال میں پہنچے جہاں وزیر محترم پرکاش جاوڈیکر کو کانفرنس کا افتتاح کرنا تھا۔ مگر ہوا یوں کہ انھی دنوں حکمران جماعت نے اتر پردیش میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی اور ہائی کمان کے احکامات اور مشوروں کے لیے مرکزی وزرا اور اہم کارکنان جماعت مصروف ہو گئے تھے سو افتتاحی اجلاس میں مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر خود تشریف نہ لا سکے اور وزیر مملکت مہندر ناتھ پانڈے نے ان کی نیابت میں پہلے اجلاس کی پہلی شمع روشن کی جبکہ یہ تجربہ اور مشاہدہ ہمارے لیے کم از کم نیا تھا کہ شمع جلانے کے بعد اسی سے اسٹیج پر موجود دیپکوں کی ایک کہکشاں روشن کرنی تھی، پھر یوں ہوا کہ ڈاکٹر ارتضی کریم کے ہمراہ، مہندر ناتھ پانڈے کے بعد ایک ایک دیپ مختلف مہمانوں کے ہاتھوں روشن ہوا۔ افتتاحی دیپ روشن کرنے والوں میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، جناب شہنواز حسین سابق وزیر کے علاوہ ایک اور وزیر بھی تھے۔ رسمی کاروائی کے بعد افتتاحی اجلاس کا آغاز ہوا۔ وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل ڈاکٹر مہندر ناتھ پانڈے نے اپنی افتتاحی تقریر میں اردو کی خوبصورتی اور ہمہ گیریت پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کو ہر طبقے کی زبان قرار دیا۔ موصوف نے کونسل کے کاموں اور کاروائیوں کی تعریف بھی کی اور دنیا بھر سے اردو والوں کی آمد و شرکت پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بیرونی مندوبین کا حکومت ہند کی جانب سے استقبال کیا جس پر دیر تک تالیوں کی گونج سنی گئی۔ سابق وزیر اور حکومتی جماعت کے نمائندے (اسپوک پرسن) نے بہت شستہ اردو میں تقریر کی اور اردو کاوشوں کو ایک تحریک بنانے کی اہمیت پر زور دیا۔ ساتھ ہی قومی کونسل اور تمام محبان اردو کو اردو کے گھر گھر پہنچانے کی ذمے داری کا احساس بھی دلاتے ہوئے ایک خاص جملہ بہت دلچسپ انداز میں کہا کہ "وہ پارٹی کے سرکاری ترجمان تو ہیں مگر اردو کے پیدائشی ترجمان ہیں"، پھر ایک بار ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ارتضی کریم نے اپنی منصبی ذمے داری نبھاتے ہوئے شہ نشین سے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور حکومتی ذمے داروں سے 3 مارچ کو یوم اردو قرار دینے کی خواہش کا اظہار بھی فرمایا جس کی حاضرین کی جانب سے تالیوں کے ذریعے بھرپور تائید کی گئی۔ افتتاحی دور کا کلیدی خطبہ برصغیر کے نامور نقاد اور محقق پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے پیش فرماتے ہوئے زبان کی تاریخ اور تکنیکی ساخت و پرداخت پر روشنی ڈالی۔ دیگر مخاطب کرنے والوں میں معروف فکشن نگار سید محمد اشرف بھی شامل تھے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد شام کی ساعتوں میں تفریحی پروگرام ترتیب دیے گئے تھے جن میں ایک داستان گوئی اور دوسرا گائیکی کا پروگرام تھا۔

داستان گوئی ہماری تہذیبی تاریخ کا اہم حصہ رہی ہے عرصہ دراز سے یہ صنف سخن ناپید ہو رہی تھی، کچھ دنوں سے اسے دوبارہ زندگی ملی کہ جاوید دانش جیسے فنکاروں نے اس کے احیا کی کوششیں تیز کر دی ہیں اسی ضمن میں جاوید دانش کا یہ پروگرام 'داستان ہجرتوں کی' پیش کیا گیا۔ داستان پر گفتگو سے پہلے میں داستان گو جاوید دانش کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرنا چاہتا ہوں، جاوید دانش کی طرح ان کی نادر صنف سخن داستان گوئی بھی غیر معمولی دلچسپی کا محور تھی۔ جاوید دانش شاعر اداکار (یعنی ڈرامہ آرٹسٹ ڈرامہ باز ہرگز نہیں) ڈرامہ نگار اور کینیڈا کی کلغی بھی سر پر سجی ہوئی کیا پوچھنا جاوید دانش کا، جہاں جاتے سر آنکھوں پہ بٹھائے جاتے، (دلوں کا حال تو اللہ

جانتا ہے مگر اندیشہ ہے کہ بعض لوگوں کو ان سے پیشہ ورانہ جلن بھی ہونے لگی ہو، کیا خاص بات ہے جاوید دانش میں ایک عام سا شاعر ایک ڈرامہ نگار ہی تو ہے) نہیں نہیں ایسا نہیں ہے مجھے اور کچھ تو نہیں معلوم مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جاوید دانش ایک طلسمی شخصیت کا نام ہے جس سے ایک بار مل لے وہ دوبارہ ملنے کی خواہش لیے دل میں برسوں انتظار کرتا ہے، کیوں نہ ہو کہ دانش نے شخصیت ہی ایسی پروقار باغ و بہار پائی ہے۔ لکھنو کے خمیر کو جب بنگال کے جادو نے گوندھا ہو اور علیگڑھ کی نکہتوں نے جسم و جاں میں بس کر کنیڈا کی فکری توانائیوں سے جلا پائی ہو تو اس مجسم کو طلسمی نہیں تو کیا ہونا چاہیے تھا۔ مشاعرہ کے اسٹیج پر ہوتا تو ایک باوقار خوش فکر شاعر دکھائی دیتا، داستان گوئی کے روایتی لباس میں لکھنو کا بانکا نظر آتا تو لوگ بے اختیار تالیوں سے استقبال کرتے۔ یہ وہ جاوید دانش ہے جس کی ہمسفری ہمیں دو ہفتے میسر رہی۔

ہجرتوں کی جو داستان جاوید دانش نے پیش کی وہ ہندوستان میں رہنے بسنے والوں کے لیے بہت رقت انگیز اور دلوں کو چھو لینے والی تو تھی کیونکہ وطن عزیز میں شاید ہی کوئی گھر بچا ہو جس کے کوئی عزیز کسی نہ کسی بیرونی ملکوں کی سیر نہ کر چکے ہوں یا وہاں مقیم نہ ہوں۔ اور ہم غریب الوطنوں کے لیے اس قسم کی داستان گوئی ایک نیا تجربہ تھی ہمیں پتہ چلا کہ اس طرح بھی ہم اپنے مسئلے بیان کر سکتے ہیں، جاوید دانش جب برف کی چٹانوں پر مہاجروں کے گھوڑے دوڑا رہے تھے تو ہمیں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گھوڑے برف کی چٹانوں پر نہیں خلیج کے ریگزاروں میں دوڑ رہے ہیں جب یوپی سے کینڈا پہنچے روٹی بنانے والے کی کہانی سنا رہے تھے تو لگ رہا تھا کہ ایسی بے شمار کہانیاں تو ہمارے آس پاس بھی سانس لے رہی ہیں بلکہ سسک رہی ہیں، تڑپ رہی ہیں۔ جب وہ بمبئی کے بھائی کی زبانی اس کی بے بسی بیان کر رہے تھے تو ہمیں لگا کہ کتنے بہت اونچی آواز میں بولنے والے دادا لوگ خلیجی ملکوں کو آ کر بے زبان ہو جاتے ہیں۔ داستان ختم ہوئی تو لوگ اپنی آنکھوں کے کناروں کی نمی کو صاف کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

داستان گوئی کے بعد غزل کا پروگرام پیش کیا گیا جس میں پہلے تو ایک نوسکھیے نوجوان نے گانا شروع کیا جس کی بے ہنگم آواز کے ساتھ بہت بلند و بانگ موسیقی نے ہمیں مجلس سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ دیر دور ٹھہرنے کے بعد ایک سریلی سی آواز نے ہمیں پھر اپنی طرف متوجہ کرا لیا، جس نوجوان کو اپنی محبتوں کے حصار میں لیے ارتضی کریم اسٹیج کی جانب بڑھ رہے تھے وہ محفل میں قدم رکھتے ہی اپنی آواز کا جادو جگانے لگا تھا۔ ہمیں موسیقی سے نہ جانے کیوں کوئی دلچسپی کبھی نہ رہی اس لیے اس قسم کی محفلوں سے اجتناب رہا۔

افتتاحی تقریب میں پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے علاوہ چند اور بھی معروف قدآور شخصیات سے ملاقات ہوئی جن میں طنز و مزاح کے معروف نثر نگار محترم مجتبیٰ حسین بھی شامل تھے، یہ تینوں بھائی محبوب حسین جگر، مجتبیٰ حسین اور ان کے تیسرے بھائی (دو ملک ایک کہانی کے مصنف) ابراہیم جلیس جو زوال حیدرآباد یا حکومت ہند کے ساتھ انضمام دکن کے بعد پاکستان چلے گئے تھے، حیدرآباد کی ماضی قریب کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کے لیے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ حیدرآباد سے تشریف لانے والوں میں پروفیسر بیگ احساس اور پروفیسر حبیب نثار سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا، خواتین میں ڈاکٹر شابانہ مریم شان حیدرآباد یونیورسٹی کی ہونہار اسکالر جو حیدرآباد سے بیاہ کر دہلی آ گئی ہیں ملیں تو ساتھ ہی ان کے دہلوی شوہر سے بھی ملاقات کروائی۔ ڈاکٹر قمر سرور سے بھی اسی پہلے دن ملاقات ہوئی، دراصل ان دونوں سے آن لائن رابطہ ادبی واٹس اَپ گروپوں میں عرصے سے رہا ہے، ان کے علاوہ ڈاکٹر وسیم راشد مدیرہ چوتھی دنیا سے بھی تعارف ہوا کہ شہلا نواب نے پہلے ہی میرا غائبانہ تعارف ان سے کروا دیا تھا، جس کا ذکر محترمہ نے ملاقات پر فرمایا۔ امتیاز گورکھپوری بھی ملے اور اپنے رسالے کا تازہ شمارہ عنایت فرمایا۔ مجھے دلی کے اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں میں شاہین نظر اور عذرا نقوی نظر نہیں آئیں تو اندیشہ ہوا کہ کہیں انھیں دعوت نہ پہنچی ہو۔ ارتضی صاحب سے ذکر کیا، موصوف نے حقانی القاسمی سے جو اس افتتاحی تقریب میں استقبالیہ کمیٹی کے فعال ذمے دار نظر آ رہے تھے فون کروانے کو کہا سو از راہ کرم میری درخواست پر حقانی القاسمی نے انھیں دعوت بھی دی مگر دونوں شخصیتیں افتتاحی پروگرام میں نہ آ سکیں بعد میں عذرا نقوی سے فون پر پتہ چلا کہ انھیں باقاعدہ دعوت نہیں پہنچی عذرا ریاض میں اپنے بہت محترم شوہر ڈاکٹر پرویز احمد کے ساتھ مقیم تھیں اور درس و تدریس کے علاوہ عذرا نقوی نے عربی کہانیوں کو اردو میں انگریزی ترجمہ کے ذریعے منتقل کرنے میں نمایاں کام کیا ہے 2008 کی جدہ میں عالمی اردو کانفرنس کے دوران ان سے ملاقات کا موقع ملا تھا کہ وہ اپنے مقالہ پڑھنے کے لیے ریاض سے ڈاکٹر پرویز کے ہمراہ تشریف لائیں اسی کانفرنس میں جہاں مجھے بھی اپنا مضمون پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تھا مولانا آزاد یونیورسٹی نے قونصل خانے کے تعاون سے منعقد کی تھی۔ اور شاہین نظر جو میرے جدہ کے قدیم کرم فرماؤں میں ہیں اپنی تدریسی مصروفیات کے سبب نہیں آ سکے۔ شاہین نظر تو پورے پروگرام میں نہیں آ سکے البتہ بہن عذرا میری گزارش پر باقی پروگرام میں تشریف لے آئیں اور پھر آگے بہار وغیرہ میں بھی ان کا ساتھ نصیب رہا۔ بے باک صحافی عابد انور نے بھی شرف ملاقات بخشا۔ پروفیسر حسین الحق سے بھی نیاز حاصل ہوا جن سے ملاقات کا شرف جدہ میں ان کی آمد پر نہ ہو سکا تھا اور دل میں اشتیاق باقی تھا، موصوف نے بہت محبت اور شفقت کا اظہار فرمایا۔

قارئین ذی احتشام آیئے اس کاروان کے سالار پروفیسر ارتضی کریم (ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) کے بارے میں کچھ عرض کروں—

صاحبو! مجھے ایسا لگا کہ سر کے بالوں کی سفیدی سے جسم کی ساخت کا کوئی میل جول نہیں ہے یعنی سر تو بزرگی کا اظہار کر رہا ہو اور چست، چاق و چوبند متحرک شخصیت اس اظہار کے انکار پر مصر ہو، آنکھوں کی چمک فکر انگیزی کے ساتھ ساتھ تبحر علمی اور دانشوری کے اس پڑاو کا اعلان کرتی ہوئی کہ جہاں ایک قلمکار اپنے آپ سے مطمئن نظر آتا ہو چاہے زمانہ اسے مانے یا نہ مانے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو کی ترویج اور تشہیر کے لیے حکومت ہند کا سب سے بڑا ادارہ مانا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس بڑی ذمے داری کو بحسن و خوبی نبھانا اور ان ذمے داریوں سے عہدہ برا ہونا اتنا آسان نہیں جتنا ان کے بہی خواہ سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں میرا ایک قدیم شعر عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ

میں مسافر ہوں خطائیں بھی ہوئی ہیں مجھ سے
تم ترازو میں مرے پاؤں کے چھالے رکھنا

تیسری عالمی اردو کانفرنس 2016 کے دعوت نامہ کے ساتھ پروفیسر سید علی کریم بمعروف ارتضی کریم سے تعارف ہوا۔ برادرم شہاب الدین نے فون نمبر بھی ارسال کیا کہ انھیں فون کر کے آپ یعنی میں اپنی آمد کی توثیق کر دوں مشکل مراحل سے گزرتا ہوا میں جسے اپنے سفر کی سہولتوں کے ملنے کا امکان کم نظر آ رہا تھا، یہ نہیں کر سکتا تھا جامعہ نے اگزٹ ری انٹری ویزا لگانے سے انکار کر دیا تھا، شعبے کے مدیر کی سفارش بھی کام نہ آئی سو میں ارتضی صاحب کو صورت حال بتانا چاہتا تھا اسی لیے میں نے انھیں فون کیا۔ غالباً اس وقت ارتضی کریم صاحب کسی میٹنگ میں رہے ہوں گے کہ انھوں نے میرا فون اٹھا کر مختصر دو تین لفظوں میں بات مکمل کرتے ہوئے کہا'' آپ

آجائیں آجائیں''۔ اس اختصار میں سرکاری افسری کے لہجے میں چھپی اپنائیت کا بھی گمان ہورہا تھا ویسے پورے سفر میں بھی اور سفر سے پہلے بھی یہ تجربہ ذہن میں جگہ بناتا رہا کہ ارتضیٰ کریم صاحب فونوں کے معاملے میں یا توبہت مشغولیت کے سبب یا احتیاط کے تقاضوں کا خیال کرتے ہوئے کہ ان پر احباب پروری کا الزام آتا رہا ہے ،گریز کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری کبھی ان سے یاری یا دعا سلام بھی نہ تھی، جس سے الزام لگانے والوں کی غلط بیانی کا یقین ہوجاتا ہے۔ ارتضیٰ کریم اردو کی خدمت کے لیے اتنے ہی مخلص ہیں جتنی خود اردو (اردو والے نہیں) اپنی حفاظت اور ترویج وتشہیر کے لیے ہوسکتی ہے۔ ان لمحوں نے مجھے حیرت زدہ کردیا جس دم ارتضیٰ کریم نے جدہ میں اردو کی بے بسی اور اردو والوں سے اردو کی شکایات کا ذکر کرتے ہوئے میرا شعر پڑھا،

اپنوں نے ہی مجھ کو نظرانداز کیا ہے
اردو کا میں شاعر ہوں اور اردو کی طرح ہوں

اس سے یہ عقدہ کھلا کہ موصوف خلیج میں اردو کے منظر نامے پر گہری نظر رکھتے ہیں یا جس کو کانفرنس میں دعوت دیتے ہیں اس کے استحقاق کی تحقیق بھی کرلیتے ہیں۔

دوسرے دن کا پروگرام دہلی کے مشہور کانفرنس ہال اسکوپ میں منعقد ہونا تھا، سو وہاں پہنچے تو ایک گروپ کسی اخبار کی سرخیوں پر چہ مگوئیاں کررہا تھا سرخی کچھ یوں تھی'' قومی کونسل کے پروگرام کا آغاز کانفرنس پرکاش جاوڈیکر کے ہاتھوں افتتاح سے محروم'' یہ کوئی نئی بات نہیں کہ بیمار ذہن اور زرد صحافت کے امین ہمیشہ مثبت کو بھی منفی بنا کر پیش کرنے میں جری ہوتے ہیں اور خود ہی اپنی جراتوں کے باعث خوار بھی ہوتے ہیں۔ مرکزی وزیر کی عدم شرکت کی وجوہات کونسل سے عدم دلچسپی ہرگز نہیں تھی جس کو ہر ذی فہم شخص سمجھ سکتا ہے، بلکہ حکمران پارٹی کو درپیش مراحل میں ان کا رہنا زیادہ ضروری تھا، سو وہی ہوا اس کا اظہار وزیر موصوف نے تیسرے روز اپنی شرکت اور یادگاری تحفے اور شہادت ناموں کی تقسیم کے موقع پر فرما بھی دیا۔

—**مہتاب قدر**، جدہ، سعودی عرب

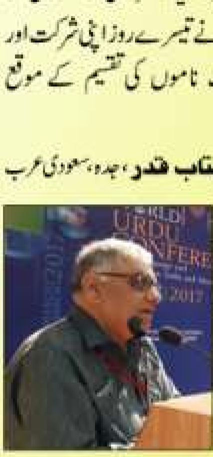

17-19 مارچ 2017 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیراہتمام منعقدہ چوتھی عالمی اردو کانفرنس میں آپ کی دعوت پر شرکت کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کی سرپرستی میں اردو کانفرنس کا انعقاد ایک تاریخی واقعہ تھا۔ اردو زبان وادب کے حوالے سے اس موقعے پر جو عالمی منظرنامہ ابھر کر سامنے آیا۔ یہ بے حد خوشگوار اور اثرانگیز تھا۔ مختلف ممالک سے اردو کے شیدائیوں کا اس کانفرنس میں شرکت کرنا اور مختلف زاویوں سے اردو کی ترقی، بقا اور صورت حال کا اظہار کرنا مختلف سمتوں کے دروا کرنے جیسا تھا۔ بھارت کے مختلف حصوں سے کافی بڑی تعداد میں اردو کے شیدائیوں اور اسکالرز کا اس موقعے پر اس تاریخی کانفرنس کا گواہ بننا بے حد اہم تھا— سیمینار ہوں، داستان گوئی، غزل یا مشاعرہ ہو، ہر پروگرام اپنے آپ میں اثرانگیز تھا اور ہر پروگرام کے کامیاب مختلف پہلوؤں پر آپ کی چھاپ نمایاں تھی۔

آپ کو آپ کی ساری ٹیم کو ڈھیر ساری مبارکباد!

—**ڈاکٹر کیول دھیر**، بی 116، بی آر ایس نگر، لدھیانہ

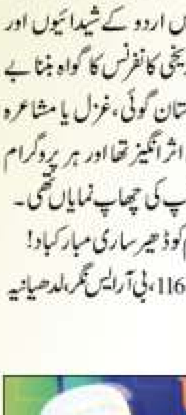

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیراہتمام 17 تا 19 مارچ 2017 کو منعقدہ چوتھی عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کا موقع نصیب ہوا۔ اس کانفرنس میں عالمی سطح پر اردو کی صورت حال اور اس کے فروغ کے مسائل وامکانات پر روشنی ڈالی گئی۔ منتظمین نے کانفرنس کی کارروائی نہ صرف عمدہ طریقے سے انجام دی بلکہ اس کانفرنس کو کامیابی سے ہمکنار بھی کیا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کی انتظامی صلاحیتوں کا مظہر دیکھنے کو ملا۔ کثیر تعداد میں سامعین کی شمولیت سے کانفرنس ہال مزین رہا۔ قومی کونسل کے ہر ایک فرد کی محنت نظر آئی اور یہ سب بہت خلوص اور پیار سے مندوبین کے ساتھ پیش آئے۔ دلچسپ بات ہے کہ کانفرنس میں شریک ہونے والے مختلف ممالک کے مقالہ نگاروں نے مختلف جہتوں میں اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ کہیں کسی مقالے کی تکرار نہیں رہی اور تمام مقالے دلچسپ رہے۔ مہمان مقررین نے بہت مفید باتیں اپنی تقریر میں پیش کی مہمانان عظام کی امید تقاریر سے اہلیان اردو خوش ہوئے۔ اہم بات یہ ہے کہ سب کی تقریر شائستگی اور سلیقے سے سنی گئی۔ مجھے ذاتی طور پر ترکی، کناڈا، ماریشس، جرمنی سے تشریف لائے مہمانوں سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا جس سے بہت مفید باتیں بھی سامنے آئیں۔

عالمی کانفرنس کے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے مختلف ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ ان ادبی نشستوں میں مقالے بھی پڑھے گئے، افسانوی محفل میں اردو کے مشاہیر اہل قلم نے اپنے افسانے بھی سنائے بالخصوص سید محمد اشرف، بیگ احساس، حسین الحق وغیرہ کے افسانوں پر سامعین نے کھل کر داد بھی دی۔ غزل گائکی اور داستان گوئی سے کانفرنس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ ان تمام پروگرام کو ترتیب دینے میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب اور ان کی پوری ٹیم کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اسی نوعیت کے پروگرام مستقبل میں بھی منعقد ہوتے رہیں گے جس سے اردو کے فروغ کے مسائل اور امکانات پر گفت و شنید ہوتی رہے گی۔

—**ڈاکٹر امان اللہ ایم بی**، اسسٹنٹ پروفیسر چینئی

■

غالب اور غربال

شمس کمال انجم

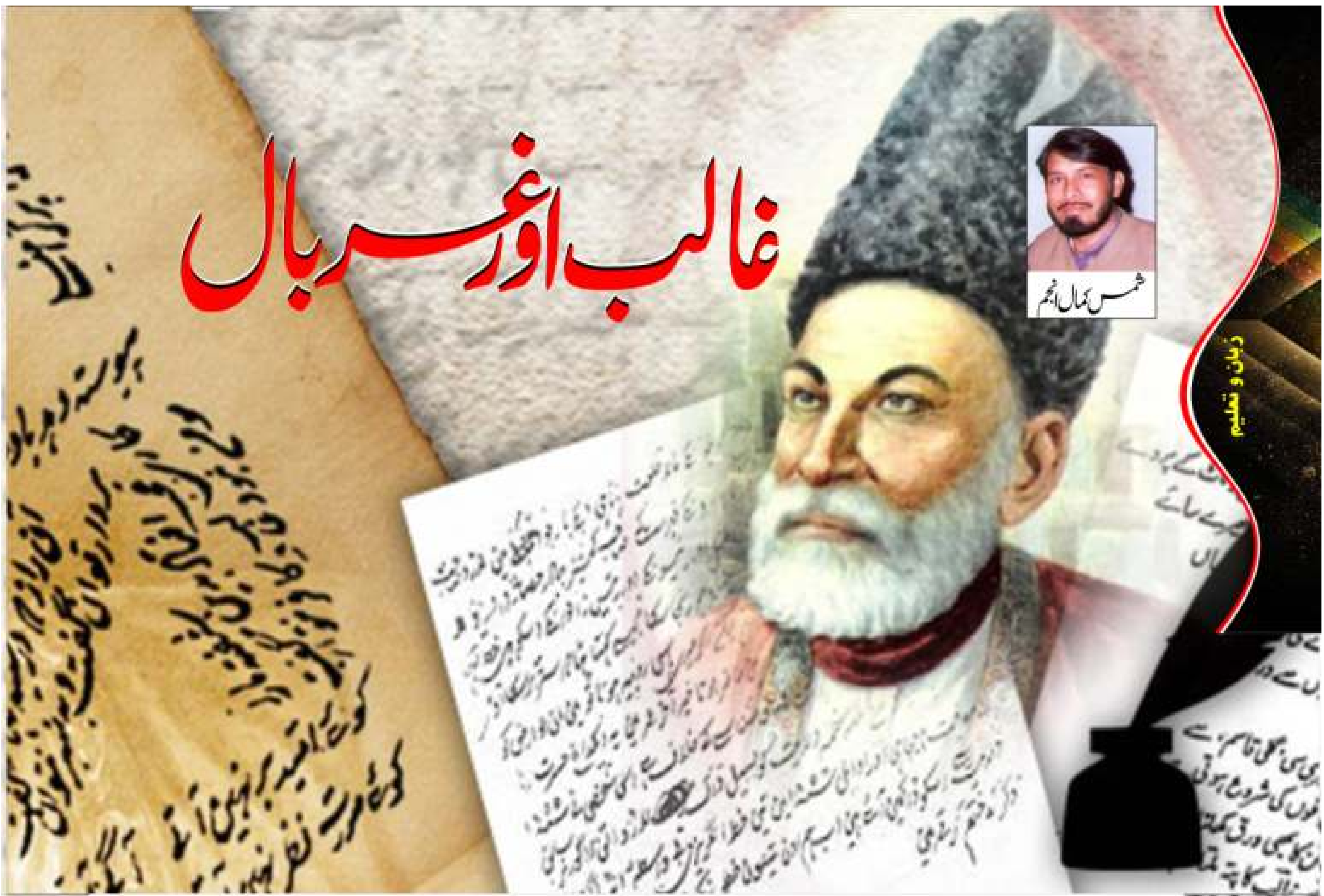

اردو میں جن شعرا، ادبا اور مصنفین نے مکتوب نگاری کا اہتمام کیا ان میں علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، سرسید احمد خان، محمد حسین آزاد، مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور اکبر الہ آبادی کے علاوہ مرزا اسداللہ خاں غالب کا بھی نام آتا ہے۔ اردو کے جن مشاہیر نے ان کے مکاتیب کے مجموعے مرتب کیے ہیں ان میں مرزا محمد عسکری، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مہیش پرشاد، مولانا غلام رسول مہر اور خلیق انجم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مرزا غالب کے خطوط مختلف نوعیت کے ہیں جن میں بہت سارے مکاتیب ایسے ہیں جن میں غالب نے ادبی نکات کی تشریح وتوضیح کی ہے۔ اشعار کے معنی سمجھائے ہیں اور شعرا کے متعلق رائے زنی بھی کی ہے۔ مرزا محمد عسکری نے 'ادبی خطوط غالب' میں مرزا غالب کے ایسے ہی خطوط کا انتخاب کیا ہے۔ یہ سارے خطوط مرزا غالب کی علمی و ادبی اہمیت اور ان کی عالمانہ عظمت پر دلالت کرتے ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں کہ ''الفاظ کا صحیح اور برمحل استعمال ادب اور شعر کی جان ہے۔ غالب کو اس کا شدت سے احساس تھا۔ وہ لفظ کی اصل حیثیت اور اس کے معنی کے تعین میں بڑی احتیاط برتتے تھے اور ایک ہی طرح کے دو لفظوں میں جو فرق وامتیاز ہے وہ ان کی نکتہ رس نظر سے اوجھل نہ رہتا تھا۔ چنانچہ مختلف خطوط میں انھوں نے نامراد اور بے مراد، ندامت وخجالت، انتظار وانتظاری، برکشیدن وورکشیدن، خراب وخرابہ، شگفتی وشگفت نیم نگاہ، نیم ناز وغیرہ پر جس طرح تنقیدی نظر ڈالی ہے وہ نہایت درجہ قابل توجہ ہے'' (غالب پر چند مقالے ص 123)

انھوں نے اپنے ادبی خطوط میں کئی مقامات پر عربی الفاظ پر بھی نظر ڈالی ہے اور لغت عرب کے حساب سے ان کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لغت عرب میں اپنی بے بضاعتی کا خاکسارانہ اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں کہتے ہیں ''میں عربی کا عالم نہیں، مگر نرا جاہل بھی نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں۔ علماء سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں'' (غالب کے خطوط 2/91)

ایک جگہ لکھتے ہیں'' زمان لفظ عربی ازمنہ جمع۔ دونوں طرح فارسی میں مستعمل'' (ایضاً 2/89) ایک اور جگہ لکھتے ہیں'' قراب کونسا لفظ غریب ہے جس کو اس طرح پوچھتے ہو؟ خاقانی کے کلام میں اور اساتذہ کے کلام میں ہزار جگہ آیا ہے۔ قراب اور سراب دونوں لغت عربی الاصل صحیح ہیں'' (ایضاً 2/118)

میاں داد خاں سیاح کو لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''ایک قاعدہ تم کو معلوم رہے، عین کا حرف فارسی میں نہیں ۔ جس لغت میں عین ہو، اس کو سمجھنا کہ عربی ہے'' ۔ (غالب کے خطوط 2/554) یعنی فارسی میں اگر کوئی ایسا لفظ مستعمل ہے جس میں حرف عین ہو تو وہ عربی الاصل ہوگا۔ عین والی بات تو سمجھ میں نہیں آئی نہ کسی کی طرف اس کی نسبت معلوم ہوئی۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ عربی میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس میں عین اور حاء ایک ساتھ آئے ہوں۔ مرزا غالب نے جو لکھا ہے اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس لفظ میں عین ہو وہ عربی الاصل ہوگا۔ حالانکہ عربی میں یہ بات زیادہ مشہور ہے کہ جس لفظ میں حرف ضاد ہو وہ عربی الاصل ہوگا۔ عرب اس بات پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ضاد کا لفظ کسی اور زبان میں نہیں پایا جاتا۔ اسی لیے عربی کو زبان ضاد بھی کہا جاتا ہے۔ اہل عجم کے لیے اس لفظ کا صحیح تلفظ بہت مشکل پڑتا ہے۔ ضاد اور ظاء قریب المخرج بھی ہیں۔ ان کے مخارج کی تشریح وتوضیح میں کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ جسے

ضاد کا صحیح تلفظ نہیں آتا وہ قرآن بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا۔

اس کے بعد مرزا غالب اسی خط میں لفظ 'غربال' کی تشریح کرتے ہیں اور کہتے ہیں " بعد معلوم ہونے اس قاعدے کے یہ سمجھو کہ غربال غین نقطہ دار، بکسور اور رائے قرشت اور بائے موحدہ اور لام، یہ لغت فارسی ہے۔ ہندی اس کی چھلنی ہے اور مرادف اس کی پرویزن۔ یعنی فارسی میں چھلنی کو 'غربال' اور 'پرویزن' کہتے ہیں اور 'چھلنی' ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو کوئی نہ جانے۔ رہا 'غریال' یا 'عریال' عین سعفص اور یائے تحتانی سے فصیح و غیر فصیح کیا بلکہ غلط محض و محض غلط ہے۔ ہاں اگر عربی میں 'چھلنی' کو 'عریال' کہتے ہوں تو فارسی 'غربال' اور عربی 'عریال'، مگر میں ایسا گمان کرتا ہوں کہ 'غربال' کا عربی میں کچھ اور اسم

ہوگا۔ 'عریال' نہ کہتے ہوں گے۔......قصہ کوتاہ 'غربال' بہ معنی چھلنی کے لفظ فارسی الاصل صحیح اور فصیح ہے۔ اور 'غریال' اگر کسی فرہنگ عربی میں مثل 'قاموس' اور 'صراح' وغیرہ کے بہ معنی 'چھلنی' کے نکلے تو اس کو مانو ورنہ یہ 'برہان قاطع' والے کی خرافات میں سے ہے۔

(غالب کے خطوط 2/554)

مرزا غالب کی اس تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ 'غربال' عربی نہیں فارسی ہے۔ 'غربال' کے وزن پر دوسرے الفاظ 'غریال' یا 'عریال' کوئی لفظ نہیں، غلط محض اور محض غلط ہے۔ 'غربال' فارسی الاصل ہے۔ اس مفہوم میں عربی میں کوئی اور لفظ پایا جاتا ہوگا۔ عربی میں اسے 'عریال' نہیں کہا جاتا ہے۔

مرزا غالب کی یہ بات درست نہیں ہے کہ 'غربال' بکسر الغین عربی نہیں فارسی الاصل ہے۔ عربی میں اس کے لیے کوئی اور لفظ مستعمل ہوگا۔ کیونکہ غربال عربی الاصل ہے۔ فارسی میں مستعمل ہے۔ عربی کی تقریباً قدیم وجدید سبھی قوامیس میں یہ لفظ پایا جاتا ہے۔ اور چھلنی کے معنی ہی میں مستعمل ہے۔ کسی نے اس کو فارسی سے معرب نہیں بتایا۔

تاج العروس میں ہے غربله ای الدقیق ونحوه غربلة: نخله یعنی آٹے وغیرہ کو صاف کرنا۔ حدیث میں بھی یہ لفظ وارد ہوا ہے۔ صاحب تاج العروس لکھتے ہیں "اسی مفہوم میں یہ لفظ ایک حدیث میں بھی وارد ہوا ہے۔ فرمایا: کیف بکم اذا کنتم فی زمان یغربَل الناس فیه غربلة" یعنی تمھارا کیا حال ہوگیا جب لوگ ایسے زمانے میں سانس لیں گے جب وہ ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔

لسان العرب میں ہے غربل الشئی نخله یعنی چیزوں کی چھان بین کرنا صاف کرنا۔ والغربال ما غُربل به۔ "غربال" اس آلے کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کی چھان پھٹک کی جاتی ہے۔

معجم الوسیط میں ہے "من غربل الناس نخلوه یعنی جو لوگوں کی چھان بین کرتا ہے لوگ اس کی چھان بین کرتے ہیں۔ 'الغربال': سوراخوں والا دف کی مانند ایک آلہ جس کے ذریعے دانوں کو گند وغیرہ سے صاف کیا جاتا ہے۔ ہاں "غریال یا عریال" عربی میں کوئی لفظ نہیں۔

پروفیسر نذیر احمد کہتے ہیں " غالب کا گمان بالکل صحیح ہے کہ عربی میں عریال نہیں کہتے ہوں گے"

(غالب پر چند مقالے ص 177)

غالب لکھتے ہیں کہ 'عریال' اگر قاموس وصراح میں چھلنی کے معنی میں نکلے تو اس کو مانو ورنہ یہ برہان قاطع والے کی خرافات میں سے ہے"۔ واضح ہو کہ صحاح میں یا عربی کے کسی اور قاموس میں عریال کا لفظ نہیں پایا جاتا۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں کہ 'عریال' جب کوئی لفظ ہی نہیں تو اس کے قاموس اور صراح میں ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ (غالب پر چند مقالے ص 185)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ برہان قاطع میں غریال یا عریال مطلقاً نہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ عربال بھی نہیں۔ البتہ گربال موجود ہے۔ صاحب برہان قاطع غربال سے اچھی طرح روشناس ہے۔ (ایضاً ص 184) آنند راج نے ذکر کیا ہے کہ بعض کے نزدیک غربال گربال کا معرب ہے اور بفتح اول بھی مستعمل ہے۔ (آنند راج، ج 4 ص 2037 بحوالہ غالب پر چند مقالے ص 178) یہ غریال یا عریال صاحب برہان قاطع نہیں بلکہ غالب کی

مرزا غالب نے 'غربال' کے بال کی جو کھال نکالی ہے وہ ان کی اپنی اختراع ہے جسے انہوں نے صاحب برھان قاطع کی طرف منسوب کردیا۔ ادبا وشعرا اور علما کبھی کبھی اس طرح کی علمی موشگافیاں کرتے رہتے ہیں۔ خیر اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو فارسی واردو کے ساتھ ساتھ عربی کی بھی اتنی معلومات تھی کہ وہ اس طرح کے الفاظ پر بحث کرسکتے تھے۔

ایجادات میں سے ہے جسے انھوں نے بلاوجہ صاحب برہان قاطع کے سر منڈھ دیا۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں" 1857 کے ہنگامے میں گوشہ نشیں ہوکر انھوں نے برہان قاطع کی قطع وبرید میں جو وقت کھپایا اگر یہ فرصت اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات وحادثات اور ادبی تجربات ومحسوسات کی پیونکاری میں صرف کرتے تو اردو زبان کو ایک ایسی تصنیف دے جاتے جو عظمت ورفعت میں کسی طرح دیوان غالب سے کم نہ ہوتی"

(غالب کی آپ بیتی ص 11)

قصہ مختصر یہ کہ لفظ 'غربال' عربی میں بہت مشہور ہے۔ عربی کی قدیم وجدید قوامیس میں یہ لفظ وارد ہوا ہے۔ الغربال کے عنوان سے مشہور لبنانی ادیب میخائیل نعیمہ کی تنقید کے موضوع پر ایک کتاب ہے جو بہت مشہور ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ مشہور مصری نقاد اور ادیب عباس محمود عقاد نے لکھا ہے اور کہا ہے کہ اگر میخائیل یہ کتاب نہ لکھتے تو میں لکھتا۔

مرزا غالب نے 'غربال' کے بال کی جو کھال نکالی ہے وہ ان کی اپنی اختراع ہے جسے انھوں نے صاحب برہان قاطع کی طرف منسوب کردیا۔ ادبا وشعرا اور علما کبھی کبھی اس طرح کی علمی موشگافیاں کرتے رہتے ہیں۔ خیر اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہی ہے کہ مرزا غالب کو فارسی واردو کے ساتھ ساتھ عربی کی بھی اتنی معلومات تھی کہ وہ اس طرح کے الفاظ پر بحث کرسکتے تھے۔

■

Dr. Shams Kamal Anjum
Head Dept of Arabic
Baba Ghulam Shah Badshah University
Rajori - 185234 (J&K)
Mob.:09419103564

افق لکھنوی کی رامائن یک قافیہ

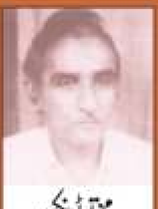

مختار ٹونکی

نقد و نگاہ

ہندوستان اگر ایک کثیر المذہبی ملک و مملکت ہے اور سرزمین ہند پر دنیا کے تمام مذاہب مثلاً ہندو دھرم، جین دھرم، بودھ دھرم، عیسائی مذہب، یہودیت، دین اسلام وغیرہ اپنے مختلف فرقوں اور شاخوں کے ساتھ موجود ہیں تو اسی وجہ سے اردو شاعری میں مذہبیات پر مشتمل کافی ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ تقریباً ہر مذہب کی مقدس کتب، تعلیمات و عقائد، مذہبی رہنماؤں کے حالات، منظوم صورت میں بکثرت ملتے ہیں، ہندو دھرم تو ہندوستان کا قدیم و عظیم دھرم ہے۔ اردو نثر و نظم میں اس کی تمام کتب مثلاً وید، پران، اپنشد، رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا وغیرہ کے تراجم کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اے جے مالوی نے اپنی کتاب 'اردو میں ہندو دھرم' میں بھگوت گیتا کے اردو تراجم کی تعداد بیاسی درج کی ہے، جس سے نہ صرف گیتا کی اہمیت و مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اردو شعراء و ادبا کی وسیع النظری، کشادہ دلی اور مذہبی رواداری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اردو کے ہندو شعرا نے ہی گیتا کے منظوم تراجم نہیں کیے بلکہ مسلم شعرا نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اسی طرح ہندو دھرم کی مذہبی کتاب رمائن کو بھی متعدد شعرا نے اردو میں منظوم جامہ پہنایا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اردو میں رامائن کے شعری تراجم کی تعداد بیس سے اوپر ہے۔ جن شعرا نے میدان سخن میں اپنے فکر و فن کے جوہر دکھائے ان میں شنکر دیال فرحت، بانکے بہاری لال بہار، سورج نرائن مہر، جگن ناتھ خوشتر، دوار کا پرشاد افق لکھنوی، قیس خلیلی، سورج پرشاد تصور، بنواری لال شعلہ، شیو پرشاد ساحل اور مہدی نظمی کے نام خصوصیت سے لیے جاسکتے ہیں۔

واضح ہو کہ اردو شاعری میں شری رام چندر جی کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ دکن کے صوفی شاعر شاہ تراب سے لے کر علامہ اقبال تک نے رام کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شری رام چندر جی وشنو کے ساتویں اوتار تسلیم کیے جاتے ہیں اور بہ حیثیت دیوتا و اعلیٰ انسان ان کی ہستی نہایت قابل احترام ہے۔ شری رام اجودھیا کے راجہ دشرتھ کے بیٹے تھے۔ وہ رانی کوشلیا کے بطن سے تھے۔ ان کی شادی راجہ جنک کی بیٹی سیتا سے ہوئی تھی۔ رانی کیکئی ان کی سوتیلی ماں تھی۔ ایک جنگ میں کیکئی نے راجہ دشرتھ کی جان بچائی تھی۔ راجہ دشرتھ نے اس کے عوض میں اس کی دو شرطیں پوری کرنے کا قول دیا تھا۔ جب راجہ دشرتھ نے رام کو راج پاٹ سونپنا چاہا تو کیکئی نے اپنی دو خواہشات پوری کرنے کو کہا۔ ایک یہ کہ رام چندر کو چودہ برس کا بن باس دیا جائے، دوسرے یہ کہ اس کے بیٹے بھرت کو اجودھیا کا راجہ بنایا جائے۔ رام چندر جی باپ کے قول کو نبھانے کے لیے اپنی بیوی سیتا اور بھائی لکشمن کو لے کر بن باس کے لیے چلے گئے۔ راجہ دشرتھ کا صدمے سے انتقال ہو گیا۔ بھرت نے راجہ بننے سے انکار کر دیا۔

شری رام چندر جی جنگلوں میں پھرتے پھرتے ناسک کے قریب پہنچے۔ جہاں سے لنکا کے راجہ راون نے سیتا کو اغوا کر لیا۔ رام چندر جی نے ہنومان جی کی مدد سے لنکا پر حملہ کیا، جنگ میں راون مارا گیا، لنکا تباہ ہوئی اور رام چندر جی سیتا کو لے کر واپس اجودھیا آئے اور برسوں تک عدل و انصاف سے راج کیا۔

رام چندر کی یہ کہانی رشی والمیک نے سنسکرت میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ گوسوامی تلسی داس نے اسے اودھی ہندی میں 'رام چرتر مانس' کے نام سے لکھا ہے۔ والمیکی رامائن کا شمار دنیا کی عظیم ترین رزمیہ Epic نظموں میں ہوتا ہے اور اسے مذہبی، تہذیبی لحاظ سے ہی نہیں، ادبی لحاظ سے بھی شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔

رامائن کے منظوم تراجم میں منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی (1864-1913) کا ترجمہ 'رامائن یک قافیہ' اپنے شعری محاسن اور ادبی اوصاف کی وجہ سے نہایت وقیع درجہ رکھتا ہے۔ افق لکھنوی کو اپنے معاصرین میں جو مقبولیت اور شرف حاصل تھا، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے ناسخ اسکول سے تھا۔ ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے انھیں ادبی اور شعری ماحول ورثے میں ملا۔ منشی شنکر دیال فرحت (1830-1890) ناسخ کے نمائندہ شاعر افق کے حقیقی ماموں تھے۔ انھوں نے بھی رامائن کو منظوم کرنے میں کمال سخنوری دکھایا ہے۔ چنانچہ افق نے انھیں سے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور پھر اپنی دھواں دھار شاعری سے پورے لکھنؤ میں ہلچل مچا دی۔ یوں تو افق لکھنوی نے بھی اصناف نظم و نثر میں اپنی لیاقت علمی اور صلاحیت فطری کا مظاہرہ کیا ہے اور اردو شعر و ادب کے تابناک ماتھے پر جاوداں نقش چھوڑے ہیں کیونکہ افق نہ صرف قادر الکلام اور پرگو شاعر تھے بلکہ ایک فاضل ادیب، قابل قدر صحافی اور اعلیٰ درجے کے مدیر بھی تھے۔ کئی ناول، ڈرامے تراجم اور دیگر یادگار کتابیں ان کو صاحب علم و فضل و کمال ثابت کرتی ہیں جن کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے لیکن سر دست ہمیں 'رامائن یک قافیہ' سے سروکار ہے۔

'رامائن یک قافیہ' 1885 میں پہلی بار مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ دوسری بار اس کی اشاعت 1914 میں بابو منوہر لال بھارگو کے زیر اہتمام اسی مطبع سے عمل میں آئی۔ افق لکھنوی نے صرف بیس سال کی عمر میں یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ افق کی تاریخ پیدائش اور اس کی اولین اشاعت سے اس کی تطبیق کی جاسکتی ہے۔ تقریباً تیرہ سو اشعار پر مشتمل اور کم و بیش 500 محاوروں کو اپنے دامن میں سموئے۔ یہ ایک یادگار اور بے مثال کارنامہ ہے 'رامائن یک قافیہ' کے بارے میں چند اہل نظر کے بیانات ملاحظہ ہوں:

گوپی ناتھ امن نے لکھا ہے:

''رامائن یک قافیہ ترسٹھ صفحات کی کتاب ایک ہی قافیہ میں ہے۔ زور قلم کا یہ حال ہے کہ ایک بار اگر رام چندر جی کا سراپا واقعات کی روشنی میں بیان کرتے ہیں تو دوبارہ تشبیہات اور استعاروں میں۔''

پروفیسر فضل امام رضوی رقم طراز ہیں: ''افق کا شعری شاہکار ان کا یک قافیہ رامائن ہے۔ پوری رامائن ایک ہی قافیہ میں منظوم ہے جس سے ان کی قدرت کاملہ کا اندازہ ہوتا ہے۔''

اجے کمار سنگھ کا کہنا ہے: ''رامائن یک قافیہ اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ اپنی طرح کی انوکھی کتاب ہے جس میں صرف ایک قافیہ کا استعمال ہے۔''

اور اطہر مسعود فرماتے ہیں: ''رامائن یک قافیہ بڑی

مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس کتاب میں ایک ہی قافیہ کو نظم کیا گیا ہے۔ ان بیانات اور توضیحات سے یہ گمان ہوتا ہے کہ پوری رامائن بقید یک قافیہ منظوم کی گئی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ افق کی قادرالکلامی اور شوکت بیانی میں کوئی شک نہیں۔ انھوں نے رامائن کے واقعات بیان کرنے میں بڑا زورِ قلم دکھایا ہے۔ لیکن ایک ہی قافیہ کا کوئی التزام نہیں ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ انھوں نے صرف قافیہ کا اہتمام کیا ہے اور ردیف کی ضرورت نہیں سمجھی ہے۔ اس لیے ان کی 'رامائن یک قافیہ' کو ایک ہی قافیہ پر مشتمل قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اسے 'رامائن بقید قافیہ' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ رام چندر جی کے سراپا سے متعلق وہ عرض کر رہے ہیں:

مرحبا صد مرحبا شاباش اے فکر بلند
آفریں صد آفریں اے تیزی طبع رواں
واہ کس انداز سے لکھا سراپا کیوں نہ ہو
کیسی خوبی سے دکھائے جوہر حسن بیاں
ذکر اعضا میں نئی لیلائیں کی ہیں منضبط
ایک مصرع میں بیاں کی داستاں کی داستاں
کیا عجب کہ خوش ہو جو پڑھ کر اس کو ہر نازک خیال
کیا عجب صاد فرمائیں جو اس پر قدرداں
ڈر یہ ہے لیکن کہیں شاید نہ مضموں آفریں
اس میں حسن نظم کی معجز نمائی ہے کہاں
استعارہ کی نہ کچھ خوبی نہ تشبیہوں کے لطف
پھر بھلا زور طبیعت کا ہو کیوں کر امتحاں
ہے مناسب پھر نئے سر سے دکھاؤں سحر طبع
پر کرے معجز نمائی خامۂ معجز بیاں

بلاشبہ ان اشعار میں زبان و بیان کی چاشنی ہے۔ جذبہ و احساس کی صداقت اور عقیدت کی وارفتگی ہے۔ بیانیہ کا اسلوب بھی زبردست ہے لیکن ہر شعر میں قافیہ مختلف ہے جس سے یک قافیہ کی توجیہ و تکرار غلط ہو جاتی ہے۔

افق نے اپنی رامائن یک قافیہ کے منظوم ترجمہ میں اپنا ایک نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں رامائن ایک ایسی کتاب ہے جو ہمیں زندگی گزارنے کے بہترین رہنما اصول فراہم کرتی ہے۔ اور رام چندر جی کی مثالی زندگی اس کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ افق کی نظر میں..

سات چیزیں آدمی پاتا ہے ان کے دھیان سے
زندگی، عیش، امن، آسائش، طرب، فرحت، اماں

رامائن کے رنگارنگ پہلو ہیں تو افق نے بھی اپنی رنگیں بیانی سے سلسلہ وار ان رنگوں میں جاذبیت پیدا کی ہے۔ انھوں نے شروع میں رامائن کی خوبیاں بتا کر رام چندر جی کے اعضائے جسمانی کی تصویر کشی کی ہے پھر ان کے وطن، ملک اودھ کی خصوصیات اور وہاں کے لوگوں کی معاشرتی زندگی کے بارے میں لکھا ہے:

نظم اردو کر رہی ہے سحرِ اعجاز بیاں
خامۂ رنگیں ہے تلسی داس جی کا ہم زباں
ملکِ اودھ ہے اک میانِ کشور ہندوستاں
سجدہ گاہِ مہر و مہ امیدگاہِ دوجہاں
آبرو سب تیرتھوں کی دیو استھانوں کا فخر
ہر پرستش گاہ کی حرمت ہر اک معبد کی شاں
ذرے ذرے کے تصرف میں ہیں قطعاتِ زمیں
بوٹہ بوٹہ زر سے ہے آسودہ حال و شادماں
الغرض ہیں خرم و خنداں یہاں سب گل کی طرح
اس گلستاں میں بہم ہے لطفِ کشتِ زعفراں

کہنے کو تو یہ ترجمہ ہے مگر افق کے پرشکوہ انداز اور الفاظ کے در و بست کی خوبیوں نے ایسے چار چاند لگائے ہیں کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی خوش بیانی ان کے طرز بیان پر دال ہے۔ افق اس زمین کے پروردہ تھے جہاں شاعری لازمۂ زندگی تھی مستزاد یہ کہ اردو کے ساتھ عربی و فارسی اور دیگر کئی زبانوں پر ان کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ اشعار میں بھاری بھرکم مگر خوبصورت الفاظ کا استعمال انھوں نے بڑے سلیقے سے کیا ہے اور کہیں بھی شعریت کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ راجہ دشرتھ کی شخصی صفات قلم بند کرنے میں ان کے قلم کی جولانی ملاحظہ ہو:

تھے سری دسرت یہاں کے حکمران نامور
مرد میدان و توانا و شجاع و پہلواں
اہلِ جرأت اہلِ ہمت اہلِ طاقت، اہلِ زور
ببر و ضرغام ہزبر، ضیغم و شیر ژیاں
عادل و فریاد رس نصفت شعار و دادگر
ملک گیر و ملک بخش و خسرو کشورستاں

آگے چلیں تو منظر نامہ بدلتا ہے... سیتا جی باغ میں اپنی سکھیوں کے ساتھ گل گشت کو گئیں تو اس کا جمالیاتی نقشہ وہ اس طرح کھینچتے ہیں۔ جو لفظیات انھوں نے شعر کے روپ میں ڈھالی ہیں، وہ لائق توجہ ہیں۔ فرماتے ہیں:

ہم نشیں، ہجولیاں، سکھیاں، خواصیں ساتھ تھیں
سب کی سب خورشید طلعت سب کی سب ابرو کماں
یاسمیں رخ، یاسمن بر، سنبلیں مو، سرو قد
نرگسیں دیدہ، سمن لب، گلبدن، غنچہ دہاں

سیتا جی کے پرکشش حسن کو دیکھ کر رام چندر جی مبہوت رہ جاتے ہیں اور لکشمن بھی تحیر میں پڑ کر رام سے مکالمے پر اتر آتے ہیں:

رام سے بولے لکھن یہ کون ہے رشک چمن
جس کا قد ہے سرو سنبل گیسو عنبر فشاں
آنکھ نرگس، عارض روشن ترنج انگور لب
سیب غبغب، غنچۂ نورس دہن، سوسن زباں
رام جی بولے یہ ہے ابرو کماں شاید وہی
حسن جس کا دیکھ کر ہے جاں بلب شیو کی کماں

یہاں واضح رہے کہ افق نے نثر میں بھی رامائن کا ترجمہ کیا تھا یعنی رامائن جیسے رزمیہ کو عوامی زبان میں پیش کر کے عام قارئین کے لیے رام کتھا کو سہل بنا دیا تھا۔ اسی لیے پروفیسر احتشام حسین کو بطور اعتراف کہنا پڑا:

"ان کا اعلیٰ ترین کارنامہ وہ ہے جو رامائن کا ترجموں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ خاص طور سے ان کے منظوم ترجمے ان کی قدر زبان اور قدرت اظہار کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔"

افق نے رامائن کے سات کانڈوں کے مختلف مناظر کو بڑی چابکدستی اور فنی گیرائی سے منظوم کیا ہے۔ چاہے وہ رام چندر جی کا بن باس جانے کا منظر ہو کہ لکشمن کے ذریعے سوپنکھا کی ناک کاٹ لیے جانے پر اس کے بھائیوں کے رام و لکشمن کو گھیر لیے جانے کا منظر ہو یا پھر رام و راون کی جنگ کا منظر ہو۔ جذبات نگاری اور کردار نویسی سے بھی انھوں نے اپنے فن کو عروج بخشا ہے۔ جنگ کے دوران جب راون کے تیر سے لکشمن زخمی ہو کر گر پڑتے ہیں تو رام جذبات سے بے قابو ہو کر کہہ اٹھتے ہیں:

مچ گیا کہرام ہر سو رام چلانے لگے
ہر سپہ سالار کی آنکھوں سے آنسو تھے رواں
رام کہتے تھے اٹھو لچھمن نہ دو تکلیفِ ہجر
وقت مشکل اس قدر بے اعتنائی الاماں
ساتھ آئے تھے کہ نہ ہو مجھ کو رنج سفر
چھوڑے جاتے ہو مجھے تنہا مصیبت میں کہاں

بہرکیف افق کی 'رامائن یک قافیہ' اپنی مختلف النوع ادبی اور شعری خوبیوں کی وجہ سے اردو زبان کے سرمایۂ سخن میں متاع بے بہا کی حیثیت رکھتی ہے اور قابل فخر امتیاز کی حامل ہے۔ اتنا زبردست کارنامہ انجام دینے پر بھی افق رامائن کے اختتامیہ میں اس کے مرغوب خلائق ہونے کی تمنا کرتے ہیں مگر اس میں بھی شعریت کا دامن نہیں چھوٹنے دیتے۔ دیکھیے:

اے کلیدِ فکر قفلِ شعرگوئی بند کر
اے چراغ شاعر کب تک رہے گا گلفشاں
کر گذارش ماہتاب آبرو بڑھتا رہے
سرخرو رکھے افق کو آفتاب روح و جاں
وردِ لب، وردِ زباں، وردِ دہن ہر نام ہو
ہو یہ رامائن پسندِ خلق و مرغوبِ جہاں

■

Mukhtar Tonki
Kali Paltan Road, Pul Mohal Khan,
Tonk 0 304001 (Raj)

شیویہ ترپاٹھی

دبستانِ لکھنؤ کی شاعری اور ریتی کالین کاویہ
تقابلی مطالعہ

زبانیں صرف وسیلۂ اظہار نہیں ہوتیں بلکہ انسان و سماج کے تمام حرکات وسکنات، عادات واطوار، اور تہذیبی لین دین کی مکمل عکاس ہوتی ہیں۔ زبان کی حد یا وسعت کو دو طریقوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ زبان کا پہلا یا اندرونی دائرہ قدرے محدود ہوتا ہے، جس میں زبان اپنے ادب کے ذریعے اپنے بولنے والوں کی ایک مخصوص تہذیب، تمدن اور تاریخ کی نمائندگی کرتی ہے۔ دوسرا بیرونی دائرہ اس وسیع ترین علاقے (Space) کا احاطہ کرتا ہے جس میں کوئی زبان اور اس کا سماج دیگر زبانوں سے لسانی، سماجی وتہذیبی لین دین میں مشغول رہتے ہیں۔ ہندوستان عہدِ قدیم سے گوناگوں تہذیبوں، ثقافتوں، مذہبوں اور ان سے جڑی زبانوں و بولیوں کا گہوارہ و جولان گاہ رہا ہے۔ گریرسن کے لنگوسٹک سروے آف انڈیا (1928) کے مطابق یہاں 364 زبانیں اور بولیاں بولی جاتی تھیں۔ 2016 کے تازہ سروے کے مطابق ہندوستان میں 880 زبانیں بولی جاتی ہیں اور 33 زبانوں کو الگ الگ صوبوں میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ فطری طور پر یہ زبانیں، ان کے بولنے وبرتنے والے اور ان کی تاریخیں اپنے ارتقا کے سفر میں مختلف موقعوں پر ایک دوسرے سے رابطے میں آتے ہیں۔ اس سفر میں کبھی یہ زبانیں ندی کے دو پاٹوں کی طرح ایک راہ پر گامزن رہتی ہیں، کبھی دو مخالف سمتوں میں چل پڑتی ہیں، کبھی ایک دوسرے کو کسی نقطے پر کاٹتے ہوئے گزرتی ہیں، تو کبھی کچھ دور تک چل کر ایک دوسرے میں مل جاتی ہیں۔

ہندوستان کی ہزاروں برس کی لسانی تاریخ میں ہند آریائی کی مختلف شاخیں مختلف ادوار و علاقوں میں، کئی صورتوں میں پھیلی نظر آتی ہیں۔ ان میں سے دو زبانیں ہندی اور اردو علاقائی اعتبار سے ایک ہی خطۂ ارض میں رائج ہیں۔ یہ دو زبانیں اپنے مشترکہ محور، منبع، طول وعرض، سماجی ومعاشی پس منظر، لسانی ارتقا کے مراحل ومحرک رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے ان زبانوں میں تخلیق ہونے والے ادب بھی مواد و فارم، فکر وفن، جذبات وجمالیات کے چند مشترکہ ومماثل پہلو رکھتے ہوں گے۔ ہندی اردو دونوں زبانوں کے ناقدین ومحققین نے ان پہلوؤں کا تجزیہ کیا مگر اس میدان ادب میں ابھی بے شمار امکانات پوشیدہ ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں انھیں میں سے ایک پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہندی ادب کے ریتی کال کی کویتا اور اردو ادب میں دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں موضوع ومواد، پیش کش، زبان وبیان، اسلوب وآہنگ، کے اعتبار سے حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً دونوں ہی جگہ درباری سرپرستی یا درباروداری کا غلبہ تھا۔ لوکک پریم/عشقِ مجازی اور اس میں بھی سنیوگ/وصال کا پہلو حاوی تھا۔ معشوق کی سراپا نگاری/نکھ شکھ ورنن میں وہ زورِ قلم صرف کیا گیا کہ زمین وآسمان کے قلابے ایک ہو گئے۔ کویتا اور شاعری میں افکار وجذبات سے زیادہ آچاریتو/پانڈتیہ/استادی وفنی مہارت کی نمائش کا شوق تھا۔ اس قسم کی مماثلتوں کے بے شمار نمونے ریتی کالین کویتا اور دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان مماثلتوں کا تنقیدی نقطۂ نظر سے تقابلی مطالعہ کر کے ہی ان اسباب وعوامل کی تلاش کی جاسکتی ہے جو ان کی بنیاد ہیں۔ اس عمل کے لیے تجزیاتی وسماجی طریقۂ کار اور بین التونی نقطۂ نظر بہتر ہیں جو اس موضوع کے تعلق سے چند نکات مثلاً ریتی کال اور دبستان ۸

> **ہندی کویتا میں بھکتی کال کے بعد ریتی کال کی آمد اور اردو شاعری میں دبستان دھلی کے پاکیزہ و حقیقی عشق کے بعد دبستان لکھنو کے مجازی عشق و شہوانیت کا زور بھی انھیں سماجی حالات کی دین ہے۔ بھکتی کاویہ یا صوفیانہ شاعری جب یکرنگی، قنوطیت، مایوسی، بے عملی اور ترک دنیا تک محدود ہو گئی تو اس کا رد عمل ہونا لازمی تھا۔ دھرم پر حکومت کا قبضہ تھا اور مہنت، پجاری، مولوی و برھمن مذھبی تعلیم کے نام پر صرف اندھی تقلید کا درس دے رہے تھے۔**

۸لکھنؤ کی شاعری کا اپنے سماج سے رشتہ، سیاسی و معاشی تبدیلیاں، ادیب قاری اور سرپرست کے باہمی رشتے، ادیب کے اندر تخلیق کار اور انسان کی کشمکش، ادبی اقدار زمانہ اور آفاقی انسانی اقدار کے مابین تعلق اور زیر مطالعہ ادب کی موضوعی وسعت پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

ہندی کے زیادہ تر علما مثلاً آچاریہ رام چندر شکل، ڈاکٹر نگیندر وغیرہ نے ریتی کال کا زمانہ تقریباً 1650 سے 1850 تک مانا ہے۔ لفظ 'ریتی' ایک خاص قسم کی طرز تخلیق یا روایت کو واضح کرتا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں چلن یا روایت۔ اس دور کے کویوں نے اپنے کلام میں ایک خاص طرز کو برتا جس میں سب سے پہلے کاویہ کی تخلیق کے لکشن/شرطیں یا لوازمات گنائے جاتے تھے اور پھر ان کی مثال کے طور پر کلام پیش کیا جاتا تھا۔ لکشن بتا کر مثال دینے کا چلن اس دور کی پرمپرا یا ریتی ہی بن گئی تھی۔ زیادہ تر کویوں نے النکار، رس، نایک نایکا بھید، دھونی، گن، دوش وغیرہ کے لکشن اور اُداہرن/مثال پیش کرنے کی ایک ریتی سی ڈال دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کو ریتی کال اور ان کویوں کو آچاریہ کوی کہا گیا۔ ریتی کال کی ابتدا شاہجہاں کے دور میں ہو چکی تھی۔ اکبر اعظم کا دور جہاں ہندی بھکتی کاویہ کا عہد زریں تھا وہیں شاہجہاں کا عہد ادیبوں، شاعروں، مصوروں، سنگ تراشوں اور ہر قسم کے فنکاروں کی حوصلہ افزائی و نوازش کا دور تھا۔ جارج اے ہوا کو اپنی کتاب 'دی سوشیولوجی آف فلم آرٹ' میں جو وسیع اور درمیانی ماڈل پیش کرتا ہے وہ ادبیات پر بھی عائد کیے جا سکتے ہیں۔ وسیع تناظر میں سیاسی، سماجی و معاشی حالات اور ان کے نتیجے میں ہونے والی اقداری، فکری، تخلیقی، علامتی، طبقاتی و علمی تبدیلیاں کسی فنی تحریک یا لہر کو پیدا کرتی ہیں۔ جبکہ فوری طور پر کسی تخلیق کو متاثر کرنے والے عوامل ہیں: تخلیق کار، قاری یا سامعین، سرپرست، نقاد اور ناشر۔ ریتی کال میں سرپرستوں کا قدرے زیادہ اثر ادب پر نظر آتا ہے۔ درباداری کے دور کا آغاز ہو چکا تھا اور شاہجہاں کی ادب دوستی و فراخ دلی نے دیگر ریاستوں کے راجا و حکام کو بھی متاثر کیا۔ درباری کویوں اور شاعروں کا ایک نیا طبقہ ابھرا جس کا قلم اپنے سرپرستوں کی مرضی کو بھانپ کر چلتا تھا۔ کویتا سرپرستوں کے دل بہلاؤ کا ذریعہ بن گئی تھی اور کوی کا مقصد اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کر کے انعام و اکرام پانا تھا۔ شاہجہاں کے بعد کا وقت مغل سلطنت اور ہندی کویتا کے آثار کا دور تھا۔

دبستان لکھنؤ کی داغ بیل پڑنے کا زمانہ اورنگ زیب کی وفات (1707) کے بعد دلی حکومت کے زوال سے خیال کیا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک بہت سی نئی طاقتیں سر اٹھانے لگیں تھیں۔ مرہٹے، جاٹ، سکھ، روہیلے طاقتور ہونے لگے۔ دور دراز کے صوبے آزاد ہو گئے۔ دبستان لکھنؤ کا ارتقاء و ترقی نادر شاہ کے دلّی پر حملے (1739) اور احمد شاہ ابدالی کی متواتر یورشوں کے سبب دلّی کی تباہی سے منسلک ہے۔ پلاسی کی جنگ (1757) میں انگریزوں کی جیت کے کچھ وقت بعد ہی دلّی کے بادشاہ شاہ عالم کو الہ آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ بنگال و بہار کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ جگہ جگہ نئی نئی حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ اودھ کی حکومت کو انگریزوں کو دی گئی بڑی رقم کے بدلے نام نہاد بادشاہت حاصل ہو گئی۔ دلّی میں جب شعرا کا کوئی پرسان حال نہ رہا تو بڑی تعداد میں شعرا نے دیگر حکومتوں کی جانب کوچ کیا جن میں لکھنو خاص تھا۔ یہاں ظاہری حالات بہتر تھے۔ رنگ ونشاط، لطف و خوشی، عیش و عشرت کا احساس تھا۔ دربار کی جانب سے شعرا کی سرپرستی ہوئی تو شعرا کا جمگھٹ لگ گیا۔ رفتہ رفتہ لکھنؤ کا اپنا رنگ پنپنے لگا جو زبان و انداز بیان، فنکاری و صناعی، جذبات و خیالات کے انتخاب و برتنے میں دلّی سے قدرے مختلف تھا۔ دبستان دہلی کی سنجیدگی، گہرائی، متانت، گداز، اداسی، حقیقت عشق و زندگی اور فنا کے مضامین کے برعکس دبستان لکھنو میں شوخی، ولولہ، رنگینی، عیش و سرمستی، عشق مجازی، معشوق کے سراپے اور شاعری کے بجائے استادی و فنی صناعی پر زیادہ زور دیا گیا۔ کیشو کا دوہا کاویہ میں النکار کی اہمیت واضح کرتا ہے۔

جَدَ پِی سُجاتی سُلچھنی سُبَرن سَرس سُو ورِتّ
بھوشن بِن نہ براجئی کویتا، بنیتا، مِتّ

اور آتش کے یہ دو اشعار شاعری میں رنگینی فکر، الفاظ کی چست بندش اور صناعی کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔

کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا خاکہ خیال
فکر رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرواز کا
بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

دراصل ریتی کال ہو یا دبستان لکھنؤ دونوں ہی اپنے وقت کے سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات کے عکاس ہیں۔ وہ دور جاگیردارانہ/سامنتوادی قدروں کا تابعدار تھا اور جاگیردارانہ نظام کی تمام خامیاں مثلاً سماجی و معاشی تفریق، چھوا چھوت، اخلاقی قدروں کا زوال، قدامت پسندی، کمزوروں کا استحصال، کامگاروں و پیشہ وروں کی مفلسی، عورتوں کی سماجی بدحالی اور ان کا استعمال کی شے میں تبدیل ہوتے جانا، ستی پرتھا، کم عمری کی شادیاں، عیش وعیاشی، شراب کباب شکار و حرم تک محدود شاہوں و حکاموں کی زندگی اس سماج میں موجود تھیں۔ ہندی کویتا میں بھکتی کال کے بعد ریتی کال کی آمد اور اردو شاعری میں دبستان دہلی کے پاکیزہ و حقیقی عشق کے بعد دبستان لکھنو کے مجازی عشق و شہوانیت کا زور بھی انھیں سماجی حالات کی دین ہے۔ بھکتی کاویہ یا صوفیانہ شاعری جب یکرنگی، قنوطیت، مایوسی، بے عملی اور ترک دنیا تک محدود ہو گئی تو اس کا رد عمل ہونا لازمی تھا۔ دھرم پر حکومت کا قبضہ تھا اور مہنت، پجاری، مولوی و برہمن مذہبی تعلیم کے نام پر صرف اندھی تقلید کا درس دے رہے تھے۔ اردو شاعری کا معشوق حقیقی سے مجازی اور مجازی سے بازاری ہو گیا۔ عشق میں وصال اپنی پاکیزگی کھو کر عیاشی محض رہ گیا۔ میر کے فلسفہ عشق

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

سے اردو شاعری کہاں آ کر ٹھہری اس کی صرف ایک مثال جلیل مانکپوری کے کلام سے پیش ہے:

مزے کی بات ہے میں تو ادھر منہ چومتا جاؤں
ادھر تم دیتے جاؤ اپنے منہ سے گالیاں مجھ کو

عاشق فراق/ورہ میں اس قدر کمزور و ناتواں ہو گیا ہے کہ تلاش کرنے پر بھی نظر نہیں آ رہا۔ اس مضحکہ خیز ومبالغہ آمیز خیال کو کس طرح باندھا گیا ہے اس کی ایک بانگی بہاری کے دوہے سے

کری ورہ ایسی تو گیل نہ چھارت پیچ
دینے ہوں چسما چکنی چاہے لہے نہ مچ

ناسخ کے شعر

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

یا ظفر کے الفاظ میں

ناتوانی نے بچائی جان میری ہجر میں
کونے کونے ڈھونڈتی پھرتی قضا تھی میں نہ تھا

سراپا نگاری /نکھ شِکھ ورنن میں معشوقہ کی پتلی کمر/کٹ کا بیان ملاحظہ ہو۔ بہاری کا دوہا

جیوں۔جیوں جوبن جیٹھ دن، کچ متی اتی اَدھکات
تیں۔تیوں چھن۔چھن کٹ چھپا چھین پرت نت جات

اور آبرو کا شعر

گرچہ قائل ہوں تجن تیری کمر معدوم کا
سخت مشکل ہے بیاں اس رمز نامعلوم کا

ایسا نہیں کہ یہ زمانہ ادبی قحط سالی کا زمانہ تھا بلکہ اس دور میں تو درباروں کی سرپرستی سے تمام فنون و ادبیات کے ذخیروں میں خوب اضافہ ہوا۔کمی تھی تو تخلیقی آزادی کی۔لینن نے کہا تھا کہ ''جو سماج دولت کی طاقت پر مبنی ہو، جہاں عوام کا بڑا طبقہ غریبی میں رہتا ہو اور مٹھی بھر رئیس جونک کی طرح موجود ہوں وہاں کسی قسم کی تخلیقی آزادی کی بات کرنا بے معنی ہے۔''یہ قول زیر بحث ادوار پر صادق آتا ہے۔اس ادب میں آمد کے بجائے آورد تھا۔اس کا محرک جذبہ، خیال و تخیل کی ولولہ خیز اڑان نہیں بلکہ انعام و اکرام حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ایسا نہیں کہ ریتی کال یا دبستانِ لکھنؤ کا تمام تر کاویہ اور شاعری اسی لیک پر چلتی رہی۔دربار سے دور رہنے والے ریتی مکت اور ریتی اثر کوی بھی ہوئے اور اودھ میں بھی عشقیہ شاعری کے علاوہ کربلائی مرثیہ کو خوب ترقی حاصل ہوئی۔نمائندہ ریتی کوی بہاری نے راجہ جے سنگھ جو اپنی نئی دلہن کی محبت میں اس قدر ڈوبے تھے کہ راج کاج ہی فراموش کر بیٹھے تھے کے لیے لکھا تھا

نہیں پراگ نہیں مدھر مدھو، نہیں وکاس اہی کال
الی کلی ہی سوں بندھیوں، آگے کون حوال

یعنی کہ جو بھنورا بغیر کھلی، پراگ اور رس سے عاری کلی میں اتنا ڈوبا ہے اس کا آگے کیا حال ہوگا۔بہاری نے رعایا کی بدحالی کا تذکرہ اپنے دوہے میں کس خوبی سے کیا ہے اس کی مثال ملاحظہ ہو

دؤسہ دؤ واج پر جان کو،کیوں نہ بڑھے دکھ دوند
ادھک اندھیرو جگ کریں،مل ماوس روی چند

ریاستوں اور جاگیروں کا انتظام ان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ریتی کال تب پروان چڑھا جب مغلوں کے حکومت میں آنے سے ہندو ریاستوں کے راجائوں کا سیاسی اور ساتھ ساتھ اخلاقی زوال شروع ہوا۔وہیں دبستان لکھنؤ کی داغ بیل تب پڑی جب مغل حکومت کا زوال ہوا اور اقتدار نئے حاکم انگریزوں کو حاصل ہوا۔غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ سیاسی اقتدار کی اس منتقلی میں تقریباً اتنا ہی وقفہ ہے جتنا ریتی کال اور دبستان لکھنؤ کی ابتدا میں۔

یعنی دو راجاؤں (رجواڑے اور ان کے حاکم مغل بادشاہ) کی حکومت ہونے پر رعایا کی تکلیفوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے، جیسے کہ اماوس کی شب آفتاب و مہتاب کے مل جانے سے تاریکی دوگنی ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی آزادی فکر کی مثال دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر خواجہ حیدر علی آتش کے یہاں بھی ملتی ہیں لیکن شاعری کا حاوی رنگ وہی رہا جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔یہ کوی اور شاعر اصلاحی و اخلاقی کارنامے تو انجام نہ دے سکے لیکن انھوں نے زبان کی بہت خدمت کی۔اپنے پانڈتیہ کی نمائش کے شوق میں ہی لیکن اگر ریتی کوی سنسکرت کاویہ شاستر کو لکشن گرنتھوں کی صورت میں ہندی ادب میں منتقل نہ کرتے تو بہت ممکن ہے کہ سنسکرت کاویہ شاستر کی اس روایت کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ریتی کویوں نے برج بھاشا کو بھی اس کی منتہا تک پہنچایا۔یہی کام دبستان لکھنؤ کے شعرا نے اردو کے تعلق سے انجام دیا۔زبان کی تراش و خراش، الفاظ کے صحیح استعمال، ذخیرہ الفاظ میں داخل و خارج الفاظ، تذکیر و تانیث، روزمرہ و محاورے، تشبیہ و استعاروں، مختلف صنعتوں، قواعد زبان کے سلسلے میں ان شعرا نے بہت عرق ریزی کی۔

زبان، بیان، فکر، خیال و صناعی کے لحاظ سے ریتی کاویہ اور دبستان لکھنؤ کی شاعری کی مماثلتوں کا ایک مضمون میں احاطہ کر پانا ممکن نہیں لیکن مندرجہ بالا نکات سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ ایک خطہ ارض میں رائج ان دونوں ہم عصر زبانوں کا سماجی، سیاسی اور معاشی پس منظر کافی ملتا جلتا ہے۔زبانوں کے تقابلی مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اپنے ارتقاء کے سفر میں زبان و ادب کم و بیش ایک سے مرحلوں سے گزرتے ہیں۔کوئی زبان اپنے سماجی پس منظر میں کسی خاص مرحلے سے جلد گزر جاتی ہے اور کوئی قدرے تاخیر سے۔یہی سبب ہے کہ ریتی کاویہ اور دبستان لکھنؤ کی سمت و رفتار بھی ایک سی ہے۔ادبی ارتقا کی راہ میں ادبا و شعرا کے پیش نظر کبھی آدرش ہوتے ہیں، کبھی انسانی فلاح و بہبود، کبھی خالص جمالیاتی حظ، کبھی دولت اور شہرت و عزت کی خواہش تو کبھی سماجی ناانصافیوں کی مخالفت۔ریتی کال اور دبستان لکھنؤ نے بھی اپنے مخصوص پس منظر میں ان میں سے ایک مقصد کا انتخاب کر لیا۔

ان دو ادبی روایتوں میں مماثلتوں سے قطع نظر ایک واضح فرق جو نظر آتا ہے وہ یہ کہ دبستان لکھنؤ کی ابتدا ریتی کال کے تقریباً 80-70 برس بعد ہوئی۔اس کی وجہ بھی اس وقت کے سیاسی حالات میں پوشیدہ ہے۔حکومت/ستا کا ادب/ساہتیہ پر سیدھا اثر پڑتا ہے۔مکتی بودھ نے کہا تھا (ترجمہ) ''ادب کا مطالعہ انسانی اقدار کا مطالعہ ہے۔'' مغل حکومت میں اکبر کے دور تک تو سلطنت کے استحکام کی کوششیں جاری تھیں۔جہانگیر اور شاہ جہاں کو ہر طرح سے مضبوط سلطنت وراثت میں حاصل ہوئی۔عیش و عشرت کی راہیں کھلنے لگیں مگر سیاسی ذمے داری کا احساس ابھی باقی تھا۔ہندو ریاستیں مغلوں کے زیر دست ان کی ماتحت تھیں۔سماج حاکم اور محکوم میں بٹا تھا۔حاکم تھے بادشاہ اور ان کے زیر سایہ امیر، منصبدار اور ہندو راجا۔محکوم تھے متوسط طبقے کے سرکاری کارکن، تاجر، کوی، شاعر، فنکار و ارباب نشاط اور نچلے طبقے کے مزدور و کسان۔حاکموں کی مرضی کے مطابق متوسط طبقے کے چند افراد ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تخلیقی عمل میں لگے رہتے تھے۔نچلے طبقے کی نہ سماج میں سنوائی تھی نہ ادب میں۔کٹھ پتلی راجاؤں اور نام نہاد سلطانوں کے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا۔ریاستوں اور جاگیروں کا انتظام ان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ریتی کال تب پروان چڑھا جب مغلوں کے حکومت میں آنے سے ہندو ریاستوں کے راجاؤں کا سیاسی اور ساتھ ساتھ اخلاقی زوال شروع ہوا۔وہیں دبستان لکھنؤ کی داغ بیل تب پڑی جب مغل حکومت کا زوال ہوا اور اقتدار نئے حاکم انگریزوں کو حاصل ہوا۔غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ سیاسی اقتدار کی اس منتقلی میں تقریباً اتنا ہی وقفہ ہے جتنا ریتی کال اور دبستان لکھنؤ کی ابتدا میں۔

■

Dr. Shaivya Tripathi
Urdu Department
Bareilly College
Bareilly - 243001 (UP)

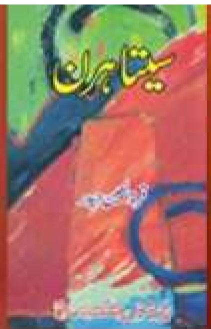

نقد و نگاہ

گلشن مسرت

قرۃ العین حیدر کا فن

(’جلاوطن‘ کے آئینے میں)

قرۃ العین حیدر کا فکشن اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کا آغاز اس وقت ہوا جب ملک کے سماجی اور سیاسی حالات میں تغیرات کا دور جاری تھا۔ سیاسی حالات روز بروز تبدیل ہوتے جارہے تھے۔ یہ ایک ایسا زمانہ تھا جب ماضی کی قدریں دم توڑتی نظر آرہی تھیں، حال میں اضطرابی کیفیت تھی اور مستقبل شبہات کے گھیرے میں تھا۔ قرۃ العین حیدر نے تقسیم سے کچھ قبل لکھنا شروع کیا اور جلد ہی اپنے مخصوص علمی نظریے اور منفرد اسلوب کی بدولت اردو افسانے میں اپنی پہچان بنالی۔ اردو افسانے کی تاریخ میں جن چند شخصیات کو افسانے میں کسی نہ کسی اہم تبدیلی کے لیے یاد کیا جاتا ہے ان میں قرۃ العین حیدر کا نام اہم ہے۔ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری میں اسلوب کی انفرادیت کے ساتھ ایک خوبی یہ ہے کہ وہ نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلو پر بھی گہری مشاہدانہ نظر ڈالتی ہیں۔ وہ افسانوں میں عصری شعور کی روشنی میں انسانی تہذیب اور حیات وکائنات کے مسائل کا فلسفیانہ شعور بڑی دیانت داری سے پیش کرتی ہیں۔ انھیں ماضی کی بازیافت اور وقت کے تسلسل کی گرفت میں مکمل دسترس حاصل ہے۔

قرۃ العین حیدر موضوع اور مواد کے لحاظ سے اپنے ہم عصروں سے الگ نظر آتی ہیں۔ تقسیم کے بعد اُن کے موضوعات میں تنوع آیا۔ تقسیم کے برے نتائج، ہجرت، بے وطنی کا احساس، سرحد کے دونوں طرف انسانوں کی ذہنی کشمکش، اونچی سوسائٹی کا تہذیبی واخلاقی زوال، سیاسی وسماجی اقدار کا کھوکھلا پن، طبقاتی تضادات، ایک بہتر زندگی کی خواہش، رومانیت سے گریز، وقت کا جبر اور ان تمام موضوعات کو انھوں نے جس فنی مہارت سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ورنہ اس سے قبل ان کے افسانوں میں سماجی پہلو سے چشم پوشی صاف ظاہر تھی۔ 1960 کے بعد قرۃ العین حیدر کا شمار اردو کے ممتاز ترین مصنفین میں ہونے لگا تھا۔ وہ ہندوستان کے ان بڑے فنکاروں میں شامل تھیں جن کا کینوس بہت وسیع تھا۔ کوئی ایسا ثقافتی اور تمدنی موضوع نہیں تھا جو ان کے قلم سے اچھوتا رہ گیا ہو۔ اپنے اس وسیع تناظر میں وہ تاریخ وتہذیب کے پس منظر کے ساتھ انسان کی کائناتی بے سروسامانی کو شدت کے ساتھ نمایاں کردیتی ہیں۔

اردو افسانے کو انفرادیت عطا کرنے والی قرۃ العین حیدر اپنے مخصوص انداز میں سماجی رشتوں اور تہذیبوں کی بازیافت کرتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کو قدرت نے جو حساس دل اور باریک بیں نظر عطا کی اس میں علم واستدلال کی قوت اور باطن سے ہم رشتہ ہونے کے روحانی شغف نے مزید پختگی عطا کی۔ قرۃ العین حیدر تاریخ، تہذیب و تمدن پر عالمانہ گرفت رکھتی ہیں۔ وہ بیک وقت ماضی اور حال دونوں میں سانس لیتی ہیں اور اپنے تاثرات اور جذبات کو اپنی تخلیقات میں شامل کردیتی ہیں۔ ان کے اکثر افسانے خاصے طویل ہوتے ہیں چونکہ وہ جس تہذیبی، سماجی، اور تاریخی پس منظر کے سہارے کہانی کا تانا بانا بنتی ہیں اس کے لیے افسانے کا قالب کم پڑتا نظر آتا ہے۔ دراصل ان کی تخلیقات کسی ایک فرد یا واقعہ تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ ان میں وہ پورے معاشرے، قوم اور ملک کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں جو ان کے دائرۂ کار کی وسعت کی غماز ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کو اقدار کی شکست وریخت کی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس شکست وریخت کو وہ صرف دو لفظوں میں ہی بیان نہیں کرتیں بلکہ ایک ایسی فضا تیار کرتی ہیں کہ قاری خود ان قدروں کے خاتمے کا عینی شاہد نظر آتا ہے۔

انھیں کسی کی اندھادھند پیروی کرنا پسند نہیں۔ فن یوں بھی کسی ازم اور کسی نظریے کا پابند نہیں ہوتا۔ تاہم فن کی تخلیق میں فکری اور علمی محرکات وعوامل کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قرۃ العین حیدر عالمی ادب خصوصاً مغربی ادب سے گہری واقفیت اور وابستگی رکھتی تھیں۔ چونکہ بذاتِ خود وہ بے پناہ صلاحیتوں کی مالک تھیں اس لیے انھوں نے اپنی راہ خود منتخب کی۔ قرۃ العین حیدر کی فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف گوپی چند نارنگ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

”قرۃ العین حیدر جو پہلے سے لکھ رہی تھیں بلا کی ذہانت اور عمیق مشاہدہ رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں خاص طور سے اودھ کی جاگیردارانہ اقدار کے مٹنے کا نوحہ اور ان سے متعلق Nostalgia ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فن، ہیئت، اسلوب واظہار کے تجربوں ہی نے انھیں انفرادی حیثیت عطا کی۔“

(گوپی چند نارنگ اردو افسانہ روایت اور مسائل)

قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں جو حالات اور ماحول تھا اس سے چشم پوشی ممکن نہیں تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے افسانوں میں ان تمام حالات کی عکاسی کی جہاں زندگی کی اعلیٰ قدریں اپنی معنویت کھوچکی تھیں۔ 1947 کے بعد لکھے گئے افسانوں میں ان افسانوں کی تعداد زیادہ ہے جو محض تقسیم ہند کے ردعمل کے طور پر لکھے گئے جن میں بٹے ہوئے خاندانوں کی روداد، ہندو مسلم بھائی چارگی اور آپسی نفرت ودشمنی، کشت وخون، غارت گری، ملکی انتشار، ملک وعوام کے حالات وواقعات اور نفسیاتی کیفیات کا بخوبی تجزیہ شامل تھا اور انھیں موضوعات کو افسانہ نگاروں نے بڑی ذہانت، چابکدستی اور خوش اسلوبی سے اپنے افسانوں میں برتا۔ کبھی حالات کو من وعن اور کبھی افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا۔ ملکی تقسیم ایک

ایسا سانحہ ہے جس کا اثر دونوں ملکوں پر آج بھی نمایاں ہے۔ تقسیم صرف ایک کاغذی کاروائی نہیں تھی بلکہ اس نے دو قوموں اور تہذیبوں کا بٹوارہ کر دیا تھا جس کا براہ راست اثر دونوں ملکوں کے عوام پر پڑا جواب دو حصوں میں بانٹ دیے گئے تھے۔ کسی بھی حساس ذہن و دل سے اس ملکی بحران سے چشم پوشی ممکن ہی نہ تھی۔ ادب چونکہ سماج کا آئینہ ہوتا ہے، اس لیے اردو ادب کی شاید ہی کوئی ایسی صنف ہو جس نے اس سانحے کا اثر قبول نہ کیا ہو۔ اس سے پیدا شدہ صورت حال، فسادات، ہجرت اور اس کے کرب کا تذکرہ نہ ہو۔ صنف افسانہ چونکہ زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان مانا گیا ہے اس لیے اس عظیم سانحہ کا سب سے زیادہ اثر بھی اسی صنف ادب نے قبول کیا۔ آزادی کے بعد اردو افسانہ جن حالات اور تاثرات کی روداد بیان کرتا ہے وہ فرقہ وارانہ فسادات، نقل مکانی، مہاجرین کی آبادکاری، جمہوری نظام کا قیام، نئی منصوبہ بندی اور ان پر عمل، اس کے علاوہ معاشی اور سیاسی مسائل تھے جو اردو افسانوں کا موضوع رہے۔ جن افسانہ نگاروں نے اس بحرانی دور میں ہیجان سے اجتناب برتتے ہوئے اعتدال سے کام لیا اور انسانی قدروں کا خیال رکھا ان میں قرۃ العین حیدر کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

افسانہ 'جلاوطن' تقریباً 9 ابواب پر مشتمل قرۃ العین حیدر کا مشہور و معروف افسانہ ہے جو سماجی نقطۂ نظر سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ افسانے میں 1947 کے فسادات، ان کی وجوہات، اس کے سماج پر پڑنے والے اثرات اور تقسیم سے قبل کے حالات کا کافی گہرائی سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ سیاسی اور سماجی حالات کس طرح انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، کس طرح دو تہذیبیں آپس میں ٹکراتی ہیں اور انتشار کا شکار ہوتی ہیں اس کا مؤثر بیان 'جلاوطن' میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ 'جلاوطن' میں قرۃ العین حیدر کے فن کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انھیں دوسروں سے منفرد بناتی ہیں اور ان کے فن کا خاصہ ہیں۔ تقسیم وطن ان کے افسانوں میں ایک تہذیبی المیے کی حیثیت رکھتا ہے۔ افسانہ 'جلاوطن' میں بھی برصغیر ہند کے ہندو مسلم گھرانوں کی باہمی یگانگت خلوص و محبت کے تذکرے کے ساتھ ہی تقسیم کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں کے واضح اثرات ملتے ہیں اور اس کے کردار اپنے عہد کی بیکراں تنہائی اور زندگی کے پچھتاووں میں جلاوطنی کی زندگی کا جبر سہتے نظر آتے ہیں۔ افسانے میں کشوری، کھیم وتی، کنول کماری اور آفتاب رائے اہم کردار ہیں، پوری کہانی انھیں کرداروں کے اردگرد گھومتی ہے سیاسی اور سماجی حالات ان کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کا افسانے میں خوبصورت بیان ملتا ہے۔

افسانے کے ابتدائی حصے میں صدیوں پرانی ہندو مسلم تہذیب، اتحاد، تعلیمی نظام، معاشرتی نظام کا فرق اور سیاسی حالات کا تذکرہ ہے۔

''کیا کیا ڈرامے مہادیوی کنیا پاٹھ شالا نے نہ کر ڈالے...... 'نل دم یتی'...... اور 'شکنتلا ہریش چند' اور 'راج رانی میرا' اور اوپر سے ڈانس الگ...... گربھا بھی ہو رہا ہے کہ ''آ تیرے گنگا پار تیر جمنا بیچ میں ٹھاڑے ہیں نندلال'' ...... ''اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی لیجیے کہ میں تو گردھر آگے ناچوں گی''...... جی ہاں اور گگری ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھیاری چلو پنگھٹ بھرو ایانی...... اور ساتھ ساتھ منو دراسین گیتا ہے کہ فرانے سے ہارمونیم بجارہی ہے۔ ایسے ہونے کو تو مسلمان کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلام گرلز اسکول وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں۔ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاصی بے سری آوازوں میں پڑھ دیا۔ تم ہی فخر انبیا ہو یا نبی سلام علیک، چلیے قصہ ختم۔ ایک مرتبہ ایک سرپھری ہیڈ مسٹرس جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی 'روپ متی باز بہادر' خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروایا تو جناب عالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پر پکیٹنگ کر ڈالی اور روز نامہ 'صدائے حق' نے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں شائع کیا۔ ''ملت اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا'' مسلمانوں! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا۔ بنات اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم۔ اسکول کو بند کرو۔''

اس اقتباس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی و تعلیمی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے معاشرتی تفریق کے ساتھ ہی سیاسی شعور کی ترجمانی بھی ملتی ہے کہ ایسے وقت میں تقسیم تو کیا مسلم لیگ کی شناخت ہی واضح نہیں تھی۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے افسانے ماضی کی بازیافت کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی تصور کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔ افسانے میں جونپور کے ایک قصبے کی کہانی بیان کی گئی ہے جہاں بلا مذہب و تفریق پہناوا، تیوہار یہاں تک کہ زبان اور محاورے بھی یکساں تھے۔

''مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لیے منہ نیلا نیلا کیے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے...... برسو رام دھڑا کے سے۔ بڑھیا مرگئی فاقے سے، گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا...... ہاتھی گھوڑا پالکی...... جے کنہیا لال کی۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک لاپتیں۔ پھر گگری موری ڈھرکائی شام...... کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ گیت کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزا پور اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دلی تک پھیلا ہوا تھا ایک مکمل اور واضح تصویر تھا جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔''

کہانی اپنے فطری انداز میں تہذیب و ثقافت کے رنگ بھرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا ہوا سماجی اور سیاسی نظام مشترکہ تہذیب پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ کشوری اور کھیم وتی سہیلیاں ہیں جو نئی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ سیاسی حالات کا اثر بھی انھیں دونوں پر زیادہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ کالج اور یونیورسٹی کے سیاسی ماحول میں اس قدر گم ہو جاتی ہیں کہ اپنے بچپن کے رشتے کو بھی فراموش کر دیتی ہیں۔ کھیم وتی ہندو مہا سبھا اور کشوری مسلم لیگ کی نمائندہ بن جاتی ہیں اور لمحہ بہ لمحہ مذہبی، تہذیبی اور سیاسی کشیدگی کے دور کی ابتداء ہوتی ہے۔ آفتاب رائے اور ڈپٹی سید جعفر عباس دونوں ہی اس مشترکہ تہذیب کے دلدادہ تھے۔ سیاسی تغیرات اور بدلتے سماجی نظام اور اس کے زیر اثر بکھرتی تہذیبی قدروں سے نالاں اور افسردہ ہوتے ہیں۔

''جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں...... جب جنگ چھڑی اور کانگریس وزارت نے استعفیٰ دے دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔''

ان حالات سے جب آفتاب رائے کو دو چار ہونا پڑتا ہے تو ان کو بھی بہت افسوس ہوتا ہے یہاں تک کہ اس اضطراری کیفیت میں وہ اپنی نوکری تک سے استعفیٰ دے دیتے ہیں۔ حالانکہ آفتاب رائے کے کردار میں بڑی دلکشی اور آئیڈیلزم ہے۔ کنول کماری اور آفتاب رائے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں مگر اظہار نہیں کر پاتے آفتاب رائے محبت سے زیادہ ذمے داریوں کو اہم تصور کرتے ہیں اور بغیر اطلاع کے ولایت چلے جاتے ہیں۔ کنول کماری کی شادی ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو بھول کر بھی نہیں بھولتے ماضی کی یادیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ کنول کماری اپنی اس زندگی کے لیے جو اس نے پسند نہیں کی تھی آفتاب رائے کو ذمے دار ٹھہراتی ہے۔ آفتاب رائے آخر تک خود کو پانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور کنول کماری انھیں کھو کر بھی نہیں کھوتی۔ کنول کماری کو چاہنے کے باوجود وہ اُسے اپنے اختیار سے کھوتے ہیں۔ چونکہ قرۃ العین حیدر کے کرداروں

میں انفرادیت پائی جاتی ہے اور اس انفرادیت کو قائم رکھنے کے لیے ان کے کردار کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ لطیف و نازک جذبات ہونے کے باوجود ان کی انا انھیں ان کے اظہار سے باز رکھتی ہے جیسا کہ آفتاب رائے کے کردار میں ظاہر ہے۔

''اس نے طے کرنا چاہا کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پر یہ وحی اترنی چاہیے تھی کہ یہ مہاپرش آسمان پر سے خاص اس کے لیے بھیجا گیا ہے لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے یا روزانہ آ کر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اس سے طبلہ اور جے جے ونتی سنے۔ پوریاں ہوا کر کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے اور یہ کنول کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے۔''

اپنی اس جلاوطنی کے بارے میں کنول کماری اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتی ہے۔ وہ یوں تو بظاہر مطمئن اور آسودہ زندگی گزار رہی ہے لیکن ایک کبھی نہ ختم ہونے والے انتظار میں بیٹھی ہے۔

''آفتاب رائے بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہو سکتی تھی، اس سے ویس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔''

انھیں واقعات کے درمیان سانحۂ تقسیم بپا ہوتا ہے۔ فسادات شروع ہوتے ہیں اور نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ملک کے حالات یکسر بدل جاتے ہیں۔ مسلمان کثیر تعداد میں ہجرت کرنے لگتے ہیں جو قوم پرست اپنا ملک چھوڑ کر نہیں جاتے ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ کشوری کی حالتِ زار سے لگایا جا سکتا ہے۔ اپنے خاندان میں کشوری اور اس کے بابا ہندوستان چھوڑ کر نہیں جاتے بیٹا پاکستان چلا جاتا ہے اس طرح خاندان کے سامنے معاشی دشواریاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے سے ایسے بہت سے خاندان تھے جنھیں ان دشواریوں کا سامنا تھا۔ ایسا ہی ایک خاندان کشوری کا تھا جب وہ ملازمت کی کوشش کرتی ہے تو اپنے ہی ملک میں مسلمان ہونے کے سبب اسے ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بابا جن کی قوم پرستی کے متعلق سب کو معلوم تھا انھیں بھی بیماری کے باوجود بخشا نہیں جاتا۔

''ملک آزاد ہو گیا۔ کھیم وتی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جون پور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے نادعلی کا ورد کیا کرتے۔ اور پولیس ہر وقت ان کو تنگ کرتی۔''

تقسیم سے قبل اور بعد میں رونما ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کا اندازہ محرم کے دو مناظر سے ہو جاتا ہے۔ جہاں پہلے محرم کا چاند نکلنے کے ساتھ ہی گلی کوچوں اور گھروں میں رونقیں بڑھ جاتی تھیں محرم کے باوجود ایک خوشگوار ماحول ہوتا تھا جس میں ایک دوسرے پر چھینٹا کشی بھی ہوتی لیکن تقسیم کے بعد ان خاندانوں کے آدھے سے زیادہ لوگ ہجرت کر چکے تھے اور جو بچے تھے وہ یہاں کے حالات سے پریشان ہو کر ہجرت کرنے پر آمادہ تھے۔ ماحول پر ایک عجیب افسردگی تھی جو باتیں قبل تقسیم انہیں محفلوں میں خوش گوار ماحول پیدا کرتی تھیں آج ان باتوں سے کسی کو کوئی غرض نہیں تھی۔ سب اپنی اپنی افسردگی میں گم تھے۔

'عاشورہ کی شب لیلیٰ' بوا مدن نے جو حسب معمول عینک گھر بھول آئی تھیں۔ دوبارہ غلط پڑھنا شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اداسی اور اکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بگن نے آواز ملائی ...... چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم سا زرد اُجالا بکھیرتی رہی۔ آنگن کا گیس کا ہنڈہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اس تاریکی میں کشوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔''

کشوری اور اس کے جیسے دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ آفتاب رائے بھی جلاوطن نظر آتے ہیں۔ وہ جس مشترکہ تہذیب کے دلدادہ تھے اور جن اقدار کے پرستار تھے وہ ٹوٹ گئی تھیں۔ تقسیم کے بعد جو تغیرات اور شکست و ریخت کا دور جاری ہوا۔ زمین داری کا خاتمہ ہوا۔ ایسے حالات میں آفتاب رائے اپنے معاشرے میں اجنبی نظر آتے ہیں اور اپنی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ کشوری کو جب ملازمت نہیں ملتی تو وہ ملک کے باہر وظیفے کے لیے کوشش کرتی ہے اور برطانیہ چلی جاتی ہے۔ وہاں ایک بار پھر اس کی ملاقات کھیم وتی سے ہوتی ہے مگر وہ کشوری سے ٹھیک سے پیش نہیں آتی، اس تقسیم کے گزر جانے کے بعد بھی دونوں کی کڑواہٹ دور نہیں ہوتی۔ اور اسے پاکستانی ہونے کا طعنہ بھی دے دیتی ہے۔ کشوری کو اپنی جلاوطنی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اپنی اور اپنے جیسے تمام افراد جو اس تنہائی اور جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں ان کے تاثرات کا اظہار یوں کرتی ہے۔

''ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کے دور نے اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک سرد لڑائی کے محاذ پر اسے اپنے اور دنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے۔''

ان تمام حالات اور اپنے مرکزی خیال کو تقویت بخشتے ہوئے کہانی اپنے اختتام پر پہنچتی ہے۔ کہانی کا اختتام شکست خوردہ انسانوں کو ایک نئے عہد اور مستقبل کی بشارت دیتا ہے اور حوصلہ بخشتا ہے۔

''کنول رانی...... کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آ جاؤ۔ اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر اس خوبصورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔ ''پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے۔'' کشوری نے آہستہ سے دہرایا۔ ''ہم اس طرح زندہ رہیں گے۔ ہم یوں آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہو گئی۔ ہمارے سامنے آج کی صبح ہے مستقبل...... ہے...... ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے۔'' لیکن کنول کماری؟............ تم اب بھی رو رہی ہو۔''

قرۃ العین حیدر ایک مؤرخ کی حیثیت سے کہانی بیان کرتی ہیں جس کو پڑھنے سے پورے عہد کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی صورت ہمارے سامنے واضح ہو جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ آفاقیت، سیاسی شعور اور داخلی مشاہدات کی ترجمانی بھی شامل ہے جس کے سبب ان کی فکری اور فنی خوبیوں کے ساتھ معاشرے کی ایک بہت واضح تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اور قرۃ العین حیدر اپنی رومانی دنیا سے حقیقت کی دنیا کا سفر طے کرتی نظر آتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے یہاں کھو کر پانے کا احساس ملتا ہے۔ ان کے افسانوں سے یہ ظاہر ہے کہ ماضی کی قدریں انھیں کس قدر عزیز ہیں۔ قرۃ العین یہ واضح کرتی ہیں کہ اس کا مستقبل بھی نہیں ہوتا جو قوم اپنے ماضی کو فراموش کر دیتی ہے۔ بیتے دنوں کی یاد سے پیدا ہونے والی کسک ان کے فن کی بنیادی شناخت قرار دی گئی ہے۔ بلاشبہ جلاوطن تقسیم کے پس منظر میں لکھا ہوا ایک خوبصورت افسانہ ہے جس میں قرۃ العین حیدر کا فن اپنی اس انفرادیت کا جا بہ جا ثبوت پیش کرتا ہے جس کے لیے ان کا فکشن مشہور ہے۔

اس افسانے کا عنوان بہت رمزیہ ہے۔ جلاوطن کا لفظ صرف اس کیفیت کو ظاہر نہیں کرتا جب انسان اپنے وطن سے دور کر دیا جاتا ہے بلکہ یہ جلاوطنی کچھ زیادہ عمیق اور وسیع تناظر کی خبر دیتی ہے کہ کس طرح سماجی حالات اور سیاسی جبر نے بے شمار انسانوں کو ان کی تہذیب و ثقافت سے دور کر کے ان کی ذات کے اندر سجے حسین آئینہ خانوں کو شکست کر کے ان کے وجود کو ذات کے باہر لق و دق صحرا میں صرصرِ بے اماں سے لڑنے کے لیے تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔

■

Dr. Gulshan Masarrat
Career Convent Girls Degree College
Sector 5, Vikas Nagar
Lucknow - 226022 (UP)
Email.: gulshan119@gmail.com

مقیم احمد

سیماب اکبرآبادی اور اصلاحِ سخن

علامہ سیماب اکبرآبادی 5 جون 1882 کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور بیسویں صدی کے نصف اول کے اختتام تک اردو شعروادب کے افق پر چھائے رہے۔ وہ بہت وسیع المطالعہ اور کثیرالجہت شخصیت کے مالک تھے۔ سیماب نے اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ مروجہ علوم وفنون اور ادبیات اردو، علم عروض، عربی اور فارسی کی تحصیل وتکمیل میں بسر کیا اور تعلیمی زندگی کے مختلف مراحل میں متعدد اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ سیماب شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ ایک طرف انھوں نے شاعری کی اصناف مثلاً غزل، نظم، رباعی، مرثیہ، قطعات میں اپنی قادرالکلامی کا ثبوت پیش کیا تو دوسری طرف نثر میں بھی گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔ شروع میں انھوں نے غزلیں لکھیں اور اصلاح کے لیے داغ کو استاد بنایا اور 1898 میں داغ کے باقاعدہ شاگرد ہوئے۔ شاعری کے میدان میں سیماب نے اتنی ترقی کی کہ آگے چل کر خود ایک کامیاب استاد کے مرتبے پر فائز ہوئے اور ان کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ تیار ہوا۔ انھوں نے صدہا شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں دیں۔ جس طرح داغ نے حیدرآباد میں ایک دفترِ شعری اصلاح کے لیے قائم کیا تھا، اسی طرح سیماب نے بھی اپنے وطن آگرہ میں 1922 میں 'قصرالادب' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔

سیماب اکبرآبادی کے تخلیقی ذہن کے تنوع کا اندازہ ان کتابوں سے کیا جاسکتا ہے، جو انھوں نے یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ نیستاں (1925) کارامروز (1934) سازوآہنگ (1941) اور شعرانقلاب (1947) میں شائع ہوئے۔ اسی دوران سیماب اکبرآبادی نے غزلوں میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی غزلوں کا پہلا دیوان کلیم عجم (1936) دوسرا سدرۃ المنتہیٰ (1946) اور تیسرا لوح محفوظ (1979) میں شائع ہوئے۔ اسی دوران دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں سے متاثر ہوکر انھوں نے رباعیاں لکھیں، جو 'عالم آشوب' کے نام سے شائع ہوئیں۔ ان کے دو مجموعے سرودِ غم اور نفیرِ غم 1943 میں شائع ہوئے، جو عزائی نظموں اور سلاموں پر مشتمل ہیں۔ 'الہام منظوم' کے نام سے مثنوی مولانا روم کی چھ جلدوں کا انھوں نے ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ سیماب نے 'وحی منظوم' کے نام سے قرآن مجید کا مکمل ترجمہ کیا، جس کا عم پارہ چھپ چکا ہے۔

1923 میں آگرہ میں مستقل قیام کے بعد سیماب اکبرآبادی نے اپنے آپ کو اردو ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور علمی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ آگرہ میں ان کے گرد فیض سخن حاصل کرنے کے لیے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ جمع ہوگیا تھا۔ خود ان کے ذہن میں کئی رسائل اور تصنیفات کے منصوبے زیر ترتیب تھے۔ چنانچہ استقلال حاصل ہونے کے بعد ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا، اور اس کے تحت سب سے پہلے ایک علمی اور اشاعتی ادارہ 'قصرالادب' کی بنیاد ڈالی۔ 'قصرالادب' کے دفتر میں ہی باقاعدہ تلامذہ کے کلام پر اصلاح دیتے اور خود تخلیقی عمل جاری رکھے ہوئے تھے۔ آگرہ میں مستقل قیام کے بعد ان کے سامنے دو امور تھے۔ پہلا پورے خاندان کی کفالت، دوسرا اردو ادب میں بحیثیت شاعر اپنا سکہ رائج کرنا۔ 'قصرالادب' کے قیام سے یہ دونوں چیزیں حاصل ہونے لگیں لیکن آمدنی اتنی قلیل تھی کہ اس سے پورے خاندان کی کفالت اور تصنیفی اخراجات کا پورا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ اس پہ فیاضی کا عالم یہ تھا کہ 'قصرالادب' میں اصلاح سخن کے لیے آنے والے شاگردوں کی ضیافت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔

اصلاح سخن کوئی آسان کام نہیں، ایک غزل یا ایک نظم کی اصلاح میں اتنی قوت وصلاحیت صرف ہوتی ہے جتنی ایک غزل یا نظم کہنے میں۔ سیماب اکبرآبادی نے اصلاح سخن کے متعلق لکھا ہے:

''اصلاح سخن سے لسانی، فنی اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے کسی استاد کا شاگرد ہونے سے ایک ادارۂ خیال (اسکول) سے نسبت ہو جاتی ہے اور ایک ہموار راستہ چلنے کو مل جاتا ہے۔ جو شاعر کسی کا شاگرد نہیں وہ زبان اور محاورے سے اختلاف میں ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے۔ اسالیب وتراکیب کے استعمال کے لیے اس کے پاس کوئی سند نہیں ہوتی اور وہ متروکات ومختارات کی عہد بہ عہد تبدیلیوں سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔''

(ابراحسنی اور اصلاح سخن، مرتبین عنوان چشتی ونعیم الدین رضوی، اردو سماج جامعہ نگر 1990، ص 135)

سیماب اکبرآبادی کے مندرجہ بالا اقتباس سے

اصلاح سخن کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے اور اصلاح سخن کی روایت پر عمل اور اس کی ضرورت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بقول سیماب ''اصلاح کی ضرورت شعر کی اکثریت پر مبنی ہے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ معمولی اصلاح سے بھی شعر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور فنی خامیاں دور ہونے سے شعر نکھر جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ شاعری ایک فن ہے اور اصلاح بھی ایک قسم کا خاموش درس ہے۔ جس طرح دوسرے فنون کے لیے ماہر معلم کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح فن شعر کے لیے بھی ماہر شاعر کی رہنمائی ضروری ہے۔ اس سے لسانی، فنی اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اصلاح کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شاعر کے پاس اسالیب وتراکیب کے استعمال کے لیے ایک سند ہوجاتی ہے۔ وہ زبان و محاورات کے اختلافات میں بھٹکنے سے بچ جاتا ہے اور متروکات و مختارات وغیرہ کی تبدیلیوں سے اسے آگاہی ہوجاتی ہے۔

سیماب اکبرآبادی کا شمار اردو کے ممتاز اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ سیماب شروعاتی دور میں اپنے تلامذہ کی پوری پوری بیاضوں پر اصلاح کر دیتے تھے لیکن جب شاگردوں کی تعداد بڑھ گئی تو سیماب نے پابندی لگا دی کہ ایک وقت میں صرف ایک غزل یا ایک نظم ہی بطور اصلاح بھیجی جائے۔ 1935 میں سیماب نے ایک مکتوب میں ضیا فتح آبادی کو لکھا:

''... مجبور ہوں کہ قصرالادب ہندوستان میں ایک مستند مرکزیت حاصل ہو چکا ہے تلامذہ کا مرجوعہ بڑھتا جارہا ہے اور اسی کے ساتھ میری پریشانیاں بھی۔ اس لیے کہ تمام وقت اصلاح ومشورت ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔ اصلاح کے علاوہ ادبی استفسار اس قدر آتے ہیں کہ شاید کسی مفتی اعظم کے پاس مذہبی فتوے بھی نہ آتے ہوں۔ ان واقعات کے ماتحت اقتصادی حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

(سیماب اکبرآبادی، حامد اقبال صدیقی، ساہتیہ اکادمی 2009، ص96)

جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے تو ہر مصلح سخن کا اپنا الگ انداز اور طریقہ ہوتا ہے۔ مصلحین سخن بالعموم ایسے ہوتے ہیں جو اشعار کی اصلاح تو کرتے ہیں مگر توجیہ یا وجہ اصلاح تحریر نہیں کرتے۔ شاگرد کی اس رستہ پر گاڑی چلتی رہتی ہے شاعر اپنی مشق ومزاولت سے صاف اور رواں شعر کہنے لگتا ہے مگر تادمِ آخر اس کا کلام عیوب سے پاک نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسے عیوب کا عرفان ہی نہیں کرایا گیا اپنی غلطی پر وہ مطلع ہی نہیں ہو سکا، نتیجتاً جو غلطی وہ پہلے دن کرتا ہے فارغ الاصلاح ہونے کے بعد بھی کرتا رہتا ہے۔ چونکہ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی کو بتایا نہ جائے کہ یہ بات غلط ہے وہ ہمیشہ اسے درست ہی سمجھتا ہے اور مسلسل اس کا اعادہ کرتا رہتا ہے۔

سیماب اکبرآبادی عموماً شعر کی اصلاح کے ساتھ توجیہ نہیں لکھتے تھے۔ اس میں ان کی بے پناہ مصروفیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی مقصود تھا کہ شاگرد اصلاح کی وجہ پر غور کریں، اس طرح ان کے تلامذہ زبان، لغت اور اساتذہ کے دواوین سے استفادہ کے عادی ہو جاتے تھے اور روح اصلاح پر غور کرنے سے ان کی ذہنی تربیت ہوتی تھی۔ اگر ہم سیماب کے طریقۂ اصلاح پر غور کریں تو ان کا طریقۂ اصلاح اس وقت کے اساتذہ سے مختلف تھا۔ سیماب صرف لفظوں کے ہیر پھیر سے شعر کو بامحاورہ موزوں یا بامعنی بنانے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ شعر کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔ عموماً 'غیر مہذب' یا رمی اشعار کو یکسر قلم زد کر دیتے اور اصلاح کے وقت اس بات کا خصوصاً خیال رکھتے تھے کہ ان کی اصلاح شاگرد کی علمی اور ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہو۔

'دستور الاصلاح' سیماب اکبرآبادی کی مشہور تصنیف ہے۔ اس کا سنہ تصنیف (مکتبہ قصرالادب، آگرہ) 1940 ہے۔ اس کتاب کے زیادہ تر اجزا رسالہ 'شاعر' میں شائع ہوچکے ہیں۔ یہاں اس بات کا محل نہیں کہ 'دستورالاصلاح' کا مفصل یا مجمل تعارف پیش کیا جائے یا اس کتاب کے ابواب یا عناوین یا جزئیات پر بحث کی جائے البتہ اشارے کے طور پر عناوین کو رقم کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ کتاب کی اہمیت وافادیت کسی حد تک آشکار ہوجائے۔ جیسے تمہید، اصلاح کلام سے پہلے اصلاح نظام، مجلسی و اجتماعی اصلاح، ضرورتِ اصلاح، اصلاح لینے کا طریقہ، اصلاح دینے کے طریقے، جو عرصے سے میرے معمولاتِ اصلاح میں شریک ہیں، شعرائے متقدین کے طریقۂ اصلاح، شعرائے متاخرین کا طریقۂ اصلاح، موازنۂ اصلاح اور ایک اور موازنۂ اصلاح شامل ہیں۔ یہ بات تو برسبیل تذکرہ ہوئی، اصل توجہ طلب بات جو میں کہنا چاہتا ہوں اور جس کا تعلق موضوع گفتگو سے براہ راست ہے وہ یہ کہ سیماب اکبرآبادی نے اس کتاب میں کئی قدیم اور جدید اساتذہ کی اصلاحیں بھی درج کی ہیں۔ اس کے بعد ان کا محاکمہ بھی کیا ہے۔

محاکمہ کے تعلق سے غور طلب اور مفید طلب امر یہ ہے کہ قدیم اساتذہ نے جو اصلاحیں کی ہیں، ان میں سے بیشتر کی توجیہ کا علم نہیں ہوتا۔ سیماب کا محاکمہ اپنے آپ میں توجیہ بھی پیش کرتا ہے۔ سیماب کی توجیہ، محاکے اور پھر اصلاح سے اختلاف واتفاق کی گنجائش تو نکلتی ہے لیکن اس سے ان کی استادی پر حرف نہیں آتا۔ یہ بات ہر حال میں اہمیت رکھتی ہے کہ سیماب اکبرآبادی نے اساتذہ کی اصلاحوں کی توجیہ بتانے کی طرف توجہ کی اور جس سے زبان ولسان کے مباحث کے نئے در وا ہوئے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ سطور میں قدیم اساتذہ کی اصلاحیں اور ان پر سیماب کی توجیہ کو درج کر دیا جائے۔

اساتذہ شعرا کی اصلاح پر توجیہ کے نمونے:

شاہ مبارک آبرو

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقط
اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

اصلاح میر

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقط
کس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

توجیہ سیماب:۔ 'کس قدر' سے مصرع میں زور پیدا ہوگیا ہے۔

خواجہ آتش لکھنوی

درماں سے اور درد ہمارا ہوا دو چند
مرہم سے زخم سینہ میں ناسور پڑ گیا

اصلاح مصحفی

درماں سے اور درد ہمارا ہوا دو چند
مرہم سے داغ سینہ میں ناسور پڑ گیا

توجیہ سیماب: میری رائے ناقص میں خواجہ آتش کا شعر محتاج اصلاح نہ تھا۔ ناسور زخم ہی میں پڑتا ہے۔ اور درد بھی زخم ہی تھا۔

آباد لکھنوی

ایک دن دیکھا تھا تیرے عارض شفاف کو
آنکھ نرگس کی بنی ہے چشم حیراں باغ میں

اصلاح ناسخ

ایک دن دیکھا تھا اس کے عارض شفاف کو
دیدۂ نرگس بنا ہے چشم حیراں باغ میں

توجیہ سیماب: اصلاح کے بعد شعر میں چستی اور سلاست پیدا ہوگئی۔ 'آنکھ نرگس کی بنی ہے'۔ پانچ الفاظ کا جملہ تھا۔ اصلاح کے بعد چار ہی لفظ رہ گئے اور مفہوم وہی رہا۔ یہ ایجاز واختصار اردو، فارسی شاعری کی جان ہے۔ اسی سے شعر کی بندش میں چستی پیدا ہوتی ہے۔ پہلے مصرع میں بھی 'اس کے' 'تیرے' سے زیادہ فصیح ہے۔

خواجہ آتش

تختی ایا ہے میرے لیے سامان عیش
سنگ در کو بھی سمجھتا ہوں میں زانو حور کا

اصلاح مصحفی

سختی ایام ہے میرے لیے سامان عیش
خشت بالیں کو سمجھتا ہوں میں زانو حور کا

توجیہ سیماب: سنگ در پر سر رکھ کر سویا نہیں کرتے، بلکہ یا تو اس پر سجدہ کیا جاتا ہے یا سر ٹیکا جاتا ہے۔ 'خشت بالیں' سختی ایام کے لیے بہت مناسب چیز ہے۔ اینٹ پر سر رکھ کر اکثر سوتے ہیں۔ لفظ 'بالیں' نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ اور اب شعر واقعی بلند ہو گیا ہے۔

جلیل الدین حسین صوفی

خاک تاباں کی نہ ہو کحل بصر
نہ کھلے شاہد مطلب پہ نظر

اصلاح غالب

خاک تاباں کی نہ ہو کحل بصر
نہ پڑے شاہد مطلب پہ نظر

توجیہ سیماب: 'کسی چیز پر نظر کھلنا' محاورۂ اردو نہیں ہے۔ 'نظر پڑنا' کہتے ہیں۔ اصلاح میں یہ محاورہ صحیح ہو گیا۔

سیماب اکبرآبادی

ہوئے ہیں خاک ہم برق جمال یار سے جل کر
ہماری قبر میں بھی طور کا عالم نکلتا ہے

اصلاح داغ

ہوئے ہیں خاک ہم برق جمال یار سے جل کر
ہمارے ڈھیر میں بھی طور کا عالم نکلتا ہے

توجیہ سیماب: قبر کو 'ڈھیر' سے بدل دینا کمال اصلاح ہے۔ معنی تو وہی قبر کے رہے مگر خاک ہونے کا ثبوت ڈھیر سے مل گیا۔ ظاہر ہے کہ جل کر خاک ہو جانے والا خاک کا ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ قبر کا ذکر ہی فضول ہے۔

عاجز لکھنوی

بے سروسامانیاں میری نہ پوچھو عشق میں
ساکن صحرا ہوں دیکھو خانہ ویرانی میری

اصلاح احسن

بے سروسامانیاں میری نہ پوچھو عشق میں
خاک چھنواتی ہے گھر گھر خانہ ویرانی میری

توجیہ سیماب: ساکن صحرا ہونے سے خانہ ویرانی کا تاثر کمزور ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ جب صحرا میں سکونت اختیار کر لی گئی تو معناً ایک سامان پیدا ہو گیا۔ اصلاح کے بعد 'گھر گھر خاک چھنوانے' نے پھر وہی خانہ ویرانی پیدا کر دی۔ دوسرے مصرع میں 'دیکھو' برائے بیت تھا وہ بھی نکل گیا۔

انصافی

نماز عشق کا میری تمنا کو خیال آیا
اسی دم کعبۂ دل سے اٹھی تکبیر نالوں کی

اصلاح نوح

نماز عشق کا کیا آرزوؤں کو خیال آیا
یکا یک کعبۂ دل سے اٹھی تکبیر نالوں کی

توجیہ سیماب: پہلے مصرع میں تمنا کو 'آرزوؤں' سے بدلنے کا خیال 'نالوں' کے تشبیے سے پیدا ہوا 'اسی دم' بھرتی کا لفظ تھا وہ بھی اصلاح میں نکل گیا۔ لیکن میرے خیال میں اگر پہلا مصرع اصلاح کے بعد لفظاً لفظاً قائم رکھا جائے تو 'کیا' کے مقابلے میں 'کیوں' دوسرے مصرع میں لانا ضروری ہے۔ ورنہ پہلے مصرع میں بجائے 'کیا' کے 'جب' ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ 'تکبیر اٹھنا' میرے خیال میں غلط ہے۔ تکبیر بلند ہونا، تکبیر کی آواز آنا اور 'تکبیر ہونا' بولتے ہیں۔ شور اٹھنا، طوفان اٹھنا، فتنہ اٹھنا صحیح ہے۔ 'تکبیر اٹھنا' صحیح نہیں ہے۔

شاہ مبارک آبرو کے شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ 'اس قدر' تھا میر تقی میر نے اپنے تذکرہ کی ترتیب کے وقت اپنے شعر پر اصلاح دیتے ہوئے 'کس قدر' کا لفظ تجویز کیا۔ بظاہر اس تبدیلی سے کچھ خاص فرق نظر نہیں آتا، لیکن ذرا سا غور کیا جائے تو بات کھل جاتی ہے کہ میر کی معمولی سی اصلاح نے شعر کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔ اسی لیے سیماب نے بجا طور پر کہا ہے کہ مصرع میں زور پیدا کر دیا ہے۔ ظاہر 'اس قدر' سے بہت زیادہ کا یقین ہوتا ہے لیکن 'کس قدر' میں بہت زیادہ کے ساتھ ساتھ حیرت، استعجاب، لاعلمی اور تشکیک کا پہلو بھی نہاں ہے۔

آخری شعر میں غور طلب بات یہ ہے کہ سیماب اکبرآبادی نے نہ صرف توجیہ کی ہے، بلکہ اپنی اصلاح کا ذکر کیا۔ سیماب نے اصلاح نوح کی جو توجیہ پیش کی ہے وہ درست ہے اور اصلاح کے بعد وہ نقائص دور ہو گئے جو شعر میں قبل از اصلاح تھے۔ اس کے علاوہ سیماب نے اصلاح کے تعلق سے دو تجویزیں دی ہیں۔

1۔ پہلے شعر میں نوح کی اصلاح کو لفظاً برقرار رکھا ہے، لیکن دوسرے مصرعے میں 'یکا یک' کی جگہ 'کیوں' کا لفظ رکھ دیا ہے۔ اس طرح شعر کی اصلاح شدہ شکل حسب ذیل ہوگی:

نماز عشق کا کیا آرزوؤں کو خیال آیا
کیوں کعبۂ دل سے اٹھی تکبیر نالوں کی

اب ہم دیکھتے ہیں کہ سیماب کی اس اصلاح نے شعر کی بلندیوں میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ کیونکہ سیماب کی اصلاح کے بعد شعر میں ایک طرف انشائیہ لب و لہجے کی شان پیدا ہو گئی ہے اور دوسری طرف تشکیک کا پہلو بھی نکل آیا ہے۔

2۔ دوسری تجویز یہ کہ اصلاح نوح میں ترمیم کی جائے اور 'کیا' کی جگہ لفظ 'جب' رکھا جائے۔ اس صورت میں شعر حسب ذیل ہوگا:

نماز عشق کا جب آرزوؤں کو خیال آیا
یکا یک کعبۂ دل سے اٹھی تکبیر نالوں کی

سیماب کی اصلاح 'جب' سے کعبۂ دل سے نالوں کی تکبیر اٹھنے کی دلیل تو ملتی ہے یعنی جب آرزوؤں کو خیال آیا، تب تکبیر اٹھی۔ لیکن سیماب کا 'جب' نوح کے 'کیا' کا جواب نہیں بن سکا۔ اور اس صورت میں نوح کی اصلاح 'نماز عشق کا کیا آرزوؤں کو خیال آیا' ہی بہتر اور ارفع معلوم ہوتی ہے۔

میں نے صرف چند اساتذہ کی اصلاحوں پر سیماب کی توجیہات کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ورنہ سیماب نے اور بھی اساتذہ کی اصلاحوں کو درج کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا جائزہ بھی لیا ہے۔ درج بالا چند مثالوں سے سیماب کی استادانہ صلاحیت اور اصلاح سخن کے باب میں سیماب کے مقام و مرتبے کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔ چونکہ سیماب اکبرآبادی بنیادی طور پر اپنے عہد کے اہم شاعر تھے بلکہ استادی و شاگردی کی روایت میں گزرے عظیم اساتذۂ سخن میں سے ایک تھے۔ اس لیے انھوں نے 'دستورالاصلاح' استاد اور مبتدی دونوں طرح کے شعرا کی رہنمائی کے لیے لکھی ہے۔ اس لیے سیماب اکبرآبادی کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنے شاگردوں کے کلام پر اپنی اصلاحوں اور توجیہات کا ذکر بھی کردیں۔ سیماب نے یہ کیا بھی۔ لیکن اس مختصر سے مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس پہلو کا بھی جائزہ لیا جائے۔ اصل مقصد تو سیماب کے اصلاح سخن کے حوالے سے اہمیت وافادیت کو جاننا اور سمجھنا تھا۔

اس مختصر سے مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ سیماب اکبرآبادی اور اصلاح سخن سے متعلق ان کی دین کا تذکرہ کر دیا جائے، ورنہ سیماب اکبرآبادی کی اصلاح کے بارے میں لکھنے کے لیے اتنے صفحات کافی نہیں۔ میں نے یہی کوشش کی ہے کہ ایک بحث شروع ہو جس میں سیماب اکبرآبادی کی اردو شاعری کو دین کو موضوع بحث بنایا جائے اور اردو شاعری میں ان کے اپنے کارنامے کو یاد رکھا جائے۔ غالباً میں نے اپنے ہدف کو پار کر لیا ہے۔

■

Muqeem Ahmad
I-23, 4th Floor, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025

مدثر رشید فیروز

اردو افسانہ اور کشمیر

کشمیر صدیوں سے تہذیبی و تمدنی رنگ بدلتا رہا ہے۔ آبی ذخیرے سے لے کر ریل کی آمد تک اس وادی نے کئی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ کشمیر کبھی ستی سر تھا مگر تالاب کا پانی خارج ہو کر کب سوکھا اور بستی میں کب تبدیل ہوا، اس پر ابھی تحقیق جاری ہے۔ لوگ بستے گئے، بستیاں آباد ہوتی گئیں، قبیلے بنے، قبیلوں کے سردار مقرر ہوئے اور پھر قبیلوں کے درمیان جنگیں ہوتی رہیں، پھر بیرونی قوموں نے اس کو اپنی آماجگاہ بنایا اور اس طرح آپس میں بولیوں کا میل جول اور مخلوط زبانوں کی ترویج ممکن ہوئی۔

دور جدید تک آتے آتے کشمیر میں کئی زبانیں بول چال کے لیے اختیار کی گئیں لیکن ادب خاص طور پر چار زبانوں میں مرتب ہوتا گیا۔ سنسکرت، کشمیری، فارسی اور اردو۔ قابل غور بات یہ ہے کہ کشمیر میں جو زبان آخر میں داخل ہوئی وہ اردو تھی جس کو آج کشمیر میں سرکاری زبان کا رتبہ حاصل ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں 1889 میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور اقتدار میں اردو زبان کو سرکاری زبان کا رتبہ حاصل ہوتے ہی یہ زبان یہاں کے تہذیب و تمدن، ثقافت اور ادب کے قریب آگئی۔ رفتہ رفتہ ادیب اس زبان کی وساطت سے اپنے خیالات کا اظہار شعری و نثری اصناف میں کرنے لگے۔ اُدھر برصغیر میں اسی دور میں کئی بڑے شاعروں کے علاوہ افسانہ نگاروں نے بھی جنم لیا جن میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ ان افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور قدرت اللہ شہاب کا تعلق کشمیر سے بالواسطہ طور پر رہا ہے اس لیے کشمیر کی جھلک منٹو کے افسانوں میں کہیں کہیں اور کرشن چندر کے افسانوں میں اکثر نظر آتی ہے۔ برصغیر کے ان بڑے افسانہ نگاروں کی دیکھا دیکھی کشمیر کے افسانہ نگار بھی اس صنف میں قسمت آزمائی کرنے لگے جن میں پریم ناتھ پردیسی، اختر محی الدین، پریم ناتھ در، پشکر ناتھ، ڈاکٹر برج پریمی، نور شاہ، حامدی کشمیری، مخمور حسین بدخشی جیسے افسانہ نگاروں کے نام شہرت سے سرفراز ہوئے۔ بیرون ریاست کے افسانہ نگاروں نے جہاں اپنے افسانوں میں عام طور پر کشمیر کی خوشنما اور دلفریب جھلکیاں دکھائیں، وہیں کشمیرزاد افسانہ نگاروں نے خصوصاً کشمیر اور کشمیر کے حالات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ جس دور میں اردو افسانہ کشمیر میں پر پھیلانے لگا وہ سیاسی بحران اور تقسیم ملک کا زمانہ تھا جس کی وجہ سے کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے اپنے دور کی تباہی، مفلسی اور لاچارگی کی تاریخ بن کر ابھرے خواہ وہ بیرون ریاست افسانہ نگاروں کے قلموں سے تخلیق کی گئی کہانیاں ہوں یا کشمیرزاد افسانہ نگاروں کے۔

بیرون ریاست کے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے جو افسانے کشمیر کے پس منظر میں لکھے ان میں 'ٹیٹوال کا کتا' اور 'آخری سلیوٹ' اہم ہیں۔ 'ٹیٹوال' کشمیر کی وادی نیلم کا علاقہ ہے جہاں سے 1947 کی جنگ کے بعد سیز فائر لائن گزرتی ہے۔ اس سیز فائر لائن کے ایک طرف پاکستان اور دوسری طرف بھارت کی فوج ہے۔ منٹو کا افسانہ 'ٹیٹوال کا کتا' اسی صورت حال پر لکھا گیا ہے۔ 1947 کے بعد کشمیر کی سرحدی جھڑپیں اور ایک دوسرے کی چوکیوں پر قبضہ کرنے کی کوششیں جاری رہیں، اور اسی پہلو کو منٹو نے 'ٹیٹوال کا کتا' افسانے میں بیان کیا۔ کچھ اسی طرح کا موضوع افسانہ 'آخری سلیوٹ' میں بھی ملتا ہے جہاں کشمیر کی سرحد اور فوجیوں کے مورچے نظر آتے ہیں۔

کشمیر کے پس منظر میں لکھنے والے افسانہ نگاروں میں سب سے اہم کرشن چندر ہیں۔ کشمیر سے دلچسپی کے حوالے سے خود کرشن چندر نے افسانوی مجموعہ ''کشمیر کی کہانیاں'' کے دیباچے میں اعتراف کیا ہے:

''میرے بچپن کی حسین ترین یادیں اور جوانی کے بیش قیمت لمحے کشمیر سے وابستہ ہیں'' (کرشن چندر، دیباچہ، کشمیر کی کہانیاں)

کرشن چندر کے کئی افسانے کشمیر کے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کی منظر کشی، دیہاتی زندگی اور رومانی کیفیت کا ملا جلا سنگم ملتا ہے۔ وہ اپنے افسانوی مجموعے 'الجھی لڑکی کالے بال' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''کشمیر کی جھیلیں اور آبشار، پہاڑ اور وادیاں، دھان کے کھیت، اور زعفران کی خوشبو، گھٹا عورت کی آنکھوں کی طرح برستی ہوئی اور برف کے گالے سفید گلاب کی پتیوں کی طرح بکھرے ہوئے لوگوں نے دھنک کے سات رنگ دیکھے ہیں۔ لیکن میں نے دھنک

میں اتنے رنگ دیکھے ہیں جو میری دو زندگیوں کے لیے کافی ہیں۔'' (ایضاً، دیباچہ، ابھی لڑکی کالے بال)

کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ 'جنت اور جہنم' کا موضوع کشمیر کی خوبصورت وادی اور فطرت کا تخلیق کردہ حسن اور کشمیر کی غربت ہے۔ افسانے کا پلاٹ وادی کا سرمائی دارالخلافہ سرینگر اور اس کے مضافات کے علاقے ہیں۔ اسی طرح 'بندوالی، کفارہ، سڑک کے کنارے، کشمیر کو سلام، جیل سے پہلے اور جیل کے بعد، لاہور سے بہرام گلہ تک، چاند کی رات' جیسے کئی افسانے ایسے ہیں جو کشمیر کے پس منظر میں یا کشمیر کے حوالے سے لکھے گئے ہیں جن میں کشمیر اور کشمیریت کو جاننے کے لیے کافی کچھ مواد ملتا ہے۔ افسانہ 'بندوالی' میں کشمیر کے مشہور جھیل ڈل کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

''ڈل کی نیلی نیلی لہروں پر آفتاب کی آخری کرنیں لرزاں تھیں۔ ہوا میں پھولوں کی بُو بسی ہوئی تھی۔ ہمارے ارد گرد کنول کے پھول تیر رہے تھے اور ان کی نازک پتیوں پر پانی کے قطرے ٹکے ہوئے تھے۔ کسی کی پلکوں پر آنسوؤں کی طرح اور شفق کی ارغوانی روشنی میں چمک رہے تھے کسی کے گلے میں سرخ منکوں کی طرح''

(ایضاً، افسانہ، بندوالی)

قدرت اللہ شہاب نے، جو اپنی تصنیف شہاب نامہ کے لیے مشہور ہیں، بھی کشمیر کے پس منظر میں چند افسانے تخلیق کیے ہیں جن میں محض کشمیر کی خوبصورتی سے متاثر ہونے کا پہلو ہی نہیں بلکہ یہاں کے حالات وکیفیات کا بھی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ان افسانو ں میں 'پکے پکے آم' اور 'پھوڑے والی ٹانگ' اہمیت کے حامل ہیں۔

کشمیری لال ذاکر نے کشمیر سے قلبی وابستگی کی بنا پر کئی افسانے کشمیر کے پس منظر میں لکھے۔ ان کے افسانوی مجموعے 'جب کشمیر جل رہا تھا' اور 'چنار چنار چہرے' میں کئی افسانے کشمیر سے وابستہ ہیں۔

آزادی سے قبل لکھنے والے آزادی کے بعد بھی فعال رہے اور انھوں نے کشمیریوں کی کسمپرسی، غربت اور بے روزگاری پر متعدد افسانے لکھے۔ ان افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، حامدی کشمیری، تیج بہادر بھان، نور شاہ، ڈاکٹر برج پریمی، مخمور حسین بدخشی، پشکر ناتھ، کلدیپ رعنا، شبنم قیوم وغیرہ نمایاں ہیں۔ آزادی کے بعد جو نئی نسل سامنے آئی ان میں عمر مجید، وحشی سعید ساحل، ڈی کے کنول (بعد میں دیپک کنول کا نام اختیار کیا)، وریندر پٹواری، شمس الدین شمیم، جان محمد آزاد قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے کشمیر کے حالات کو جیا اور ان ستم رسیدہ واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ان میں نور شاہ، عمر مجید، دیپک بدکی، دیپک کنول، وریندر پٹواری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے چند ایک مہاجر بن کر وادی سے ہجرت کر گئے مگر ان کی کشمیر سے وابستگی بدستور جاری رہی۔

ریاست کے اول الذکر افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں میں کشمیر اور کشمیریت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ پردیسی نے اپنے افسانوں میں ریاست کی صحیح عکاسی کر کے کشمیر کو اصلی رنگ و روپ میں پیش کیا۔ وہ کشمیر کی خوبصورتی ہی نہیں بلکہ بدصورتی کو بھی منظر عام پر لاتے ہیں۔ وہ کشمیر کی غربت، بھوک، افلاس، پسماندگی، معاشی و اقتصادی بدحالی، بے کاری، بیگار کی لعنت کو اپنے افسانوں میں حقیقی طور پر پیش کرتے ہیں۔ پردیسی کے افسانے 'ٹھیکہ بٹی'، 'ان کوٹ'، 'اگلے سال' اور 'دیوتا' کشمیر کی حقیقی صورت حال کی خوب عکاسی کرتے ہیں۔ وادی کے حالات کے بارے میں وہ خود یوں رقمطراز ہیں:

''کشمیر کا ہر باشندہ بذات خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہ دی۔ یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ غلامی ہے، افلاس ہے، شخصی راج ہے۔''

(پریم ناتھ پردیسی: میں اور میرے افسانے)

افسانوں کے مجموعے 'بہتے چراغ' کی کہانیوں میں کشمیر کی اصلی روح کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے اور فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ کشمیریوں کے مصائب اور مسائل، ان کے اصلی مزاج اور تیور، سادگی اور شرافت، عادات اور خصائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ پردیسی نے کشمیر کے حالات کو زیر نظر رکھ کے وہاں کی معاشرت اور اخلاقی قدروں کے علاوہ ریاست کی غلامانہ ذہنیت کی ترجمانی بھی کی ہے۔ بقول ڈاکٹر برج پریمی:

''ریاست میں اس سے پہلے اردو کا مختصر افسانہ اس قدر منجھی ہوئی صورت میں نظر نہیں آتا۔ پردیسی نے کشمیر کو اپنے افسانوں میں پہلی بار پیش کیا اور ہزاروں لاکھوں کشمیریوں کو زبان بخشی۔''

(برج پریمی، افسانہ: خوابوں کے دریچے، مشمولہ: سپنوں کی شام)

'کشمیریت' پردیسی کے روم روم میں رچی بسی تھی۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان کے افسانے کشمیر کی ایک بولتی تصویر ہیں۔ ان کے افسانوں کے اکثر کردار کشمیر کے زندہ کردار ہیں جو آٹھوں پہر ان کے آس پاس زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں، کبھی ستم رسیدہ حالات میں بھی خاموش رہتے ہیں تو کبھی معمولی سی خوشی سے چونک اُٹھتے ہیں۔ ان کرداروں کا ہر عمل مصنف کے درون میں چھپی خواہشات اور درد و کرب کا آئینہ ہے۔ چاہے وہ 'کیچڑ کا دیوتا' کا 'ممسو' یا 'نندی' ہو یا پھر 'دھول' کی 'مہتہ بی'۔ وہ اپنے کرداروں کو اپنے معاشرتی پس منظر میں پورے نفسیاتی عوامل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ چاہے وہ 'امام دین' ہو یا 'جاوید'، 'وشومبر' ہو یا 'گنگا دھر'، 'ٹھیکہ بٹی' ہو یا 'امام صاحب'۔ ان کے بارے میں پروفیسر حامدی کاشمیری رقمطراز ہیں:

''پردیسی نے کشمیریت کو داخلی سطح پر محسوس کر کے اس کی مصوری کی ہے۔ ان کے افسانوں کے کرداروں کے رویے، محسوسات اور عقائد پردیسی کی شخصیت کے مختلف پہلو کو روشن کرتے ہیں۔''

(ایضاً، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما، ص 29)

ڈاکٹر برج پریمی جن کو کشمیر سے والہانہ محبت تھی اور کشمیر کے اردو ادب سے متعلق کئی محققانہ اور ناقدانہ تصانیف شائع کیں، جن میں 'جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما' اور 'کشمیر کے مضامین' سرفہرست ہیں، نے اپنے افسانوی مجموعے 'سپنوں کی شام' میں 16 مختصر افسانے تحریر کیے ہیں جو اکثر کشمیر کے حوالے ہی سے لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے کشمیر کے غریب کسانوں اور مزدوروں کی بدحالی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ برج پریمی کی رگ رگ میں کشمیریت کا جذبہ تھا۔ ان کا ہر افسانہ اسی جذبے کی پہچان ہے۔ افسانہ 'خوابوں کے دریچے' میں وہ کشمیر کے سرد ترین موسم کی عکس بندی یوں کرتے ہیں:

''دسمبر کی ایسی ہی کالی اور بھیانک رات میری یادوں کے افق پر ابھرتی ہے روح کو منجمد کرنے والی سائیں سائیں کرتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اب بھی میرے روم روم کو جھنجھوڑ دیتی ہیں اور جوتی کا جوالامکھی کی طرح تپتا ہوا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے جم جاتا ہے اور میرے من میں اتھل پتھل مچ جاتی ہے۔''

(حامدی کاشمیری، ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب، ص 122)

ان کا افسانہ 'میرے بچے کی سالگرہ' میں کشمیر کا رنگ جگہ جگہ ابھرتا ہے۔ افسانہ 'سپنوں کی شام' میں کشمیر کے ایک ضلع بڈگام کے ایک گاؤں کا پس منظر ہے۔ 'وحشی کی موت' میں کشمیری مفلسوں کا احوال ہے۔ افسانہ 'شرنارتھی' جس کا موضوع 1947 کے بعد کے حالات ہیں ایک حقیقی تاریخی واقعہ کے روپ میں ابھرتا ہے۔ برج پریمی نے اس افسانے میں شیام کا المیہ کردار پیش کر کے کشمیریوں کی مظلومیت کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین زور لکھتے ہیں:

''انھوں نے کشمیری تہذیب تمدن و ادب کو لازوال

تخلیقات سے مالا مال کیا جن میں کشمیر کی صحیح روح تھرکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے وہ حقیقی معنوں میں کشمیری عوام کے نباض تھے۔'' (محی الدین زور کشمیری، برج پریمی کے افسانے اور کشمیر، مشمولہ: برج پریمی: حیات و ادبی خدمات، مرتب: پریمی رومانی، ص 173)

پشکر ناتھ، جو کشمیر کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں، کے چار افسانوی مجموعے 'اندھیرے اجالے'، 'ڈل کے باسی'، 'عشق کا چاند اندھیر اور کانچ کی دنیا' شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے کشمیر کی ثقافت اور سماجی زندگی کی جو تصویریں اپنے افسانوں میں پیش کیں ان میں کشمیر کی حقیقی زندگی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ان کے شاہکار افسانہ 'درد کا مارا' کا مرکزی کردار کشمیر کا مہمان نواز، ہمدرد اور انسان دوست تاجر 'صمد جو' ہے جس کو جنوبی ہند کی ایک لڑکی سمجھ نہیں پاتی اور صمد جو کی شفقت اور ہمدردی کو دھوکا قرار دیتی ہے۔ یہ افسانہ ایک طرف سیاسی معنویت کا بھی حامل ہے اور کشمیر کے پورے درد کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ 'جوڑا ابابیلوں کا' افسانے میں کشمیر کی یخ بستہ سردی کا ایک منظر بڑی چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے۔ کشمیر کے پہاڑوں پر آباد گوجر لوگوں کی دنیا سے 'ایک بوند زہر' اور 'ٹراوٹ مچھلی' جیسے افسانے تخلیق کیے گئے ہیں۔

اگرچہ ایک طرف متذکرہ بالا افسانہ نگاروں نے کشمیر کی کسمپرسی اور معصومیت کے موضوعات کو قلم بند کیا ہے تو وہیں ان کے بعد آنے والے افسانہ نگار ایک ایسے دور سے گزرے جس نے کشمیر کے ادیبوں کو دو گروہوں میں بانٹ دیا۔ ایک گروہ کشمیر کو مجبوراً چھوڑ کر جموں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گزر بسر کرنے لگا، دوسرا گروہ کشمیر کے دکھ سکھ کو افسانوں میں قید کرتا گیا۔

جو افسانہ نگار کشمیر کے برے دور سے گزر کے اپنے روایتی تہذیب و تمدن اور ثقافت کو یک طرفہ چھوڑ کر کشمیر سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے ان کے افسانوں میں اپنے وطن سے جدائی اور ہجرت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں ویریندر پٹواری، دیپک بدکی، دیپک کنول وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ویریندر پٹواری، جنھیں دیگر پنڈتوں کے ساتھ کشمیر چھوڑنا پڑا، کے کئی افسانوی مجموعے (ایک ادھوری کہانی، اُفق، آفتوں کے شہر میں، دائرے، دوسری کرن، بے چین لمحوں کا تنہا سفر، آخری دن، فرشتے خاموش ہیں، آواز سرگوشیوں کی، وغیرہ) منظر عام پر آئے ان کی کہانیوں کے پس منظر میں کشمیر ہر طرف نظر آتا ہے۔ انھوں نے کشمیر کے مصائب کو موضوع بنایا۔ انھوں نے اس سسکتی وادی کا کرب گھول کر اپنے افسانوں میں بھر دیا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں عصری آگہی کے سلگتے ہوئے احساس کو پیش کرتے ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی ان کی کہانیاں سلگتے ہوئے کئی تاریخی سوالات چھوڑ جاتے ہیں۔ حقانی القاسمی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ویریندر پٹواری کی کہانی میں کشمیر کا درد نظر آتا ہے۔ اس زمیں کا نوحہ۔ اس مٹی کا مرثیہ جو کبھی جنت تھی۔'' (حقانی القاسمی، ویریندر پٹواری، مشمولہ: عصری تحریریں، مرتب: دیپک بدکی، ص 56)

ویریندر پٹواری کے کئی افسانے کشمیر کے واقعات اور لوگوں کی علامتیں بن کر ابھرتے ہیں افسانہ 'سزا' جہاں کشمیری پنڈتوں کی علامت کا استعارہ بنتا ہے وہیں 'دھواں' توڑ پھوڑ اور تحریک کی علامت نظر آتا ہے۔ افسانہ 'ریچھ' میں انسان کی خون ریزی کو دیکھ کر ریچھ شرمسار ہو جاتا ہے۔ افسانہ 'قیدی' میں وہ کشمیر کے حالات کا یوں جائزہ لیتے ہیں:

''پہلی بار احساس ہوا کہ اچھا انسان نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان ہوتا ہے۔ مگر بُرا انسان ایک شیطان ہوتا ہے شیطان ایک طوفان ہوتا ہے جو بھائی کو بھائی سے جدا کر کے اپنے مقصد کی خاطر دونوں کو قربان کر دیتا ہے۔''

(ویریندر پٹواری: قیدی، افق، ص 79)

ویریندر پٹواری کے افسانوں میں کشمیر کا تہذیبی اور ثقافتی پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جس کی مثال 'برف، دسرتھ، لالہ رخ' جیسے افسانوں میں ملتی ہے 'برف' افسانہ میں حالات کی وجہ سے بیروزگاری کا مسئلہ اجاگر کیا گیا ہے، 'دسرتھ' میں برف کا موسم اور 'لالہ رخ' میں کشمیر میں ہندو مسلم اتحاد کو ابھارا گیا ہے۔

کشمیر کے حالات پر لکھنے والے افسانہ نگاروں میں دیپک بدکی سرفہرست ہیں ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے ہیں جن کے عنوان ہی سے کشمیر کی خوشبو آتی ہے جیسے ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات اور روح کا کرب۔ ان کے علاوہ ان کا ایک افسانچوں کا مجموعہ 'مٹھی بھر ریت' بھی شائع ہوا ہے۔ ان کے افسانے نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر سے باہر گزارا ہے۔

کشمیر کے پس منظر میں ان کا افسانہ 'منتے مکان کا ریپ' میں خالی مکان کا استحصال دکھایا گیا ہے۔ یہ وہ منظر نامہ ہے جو کشمیر کے جبر و استحصال کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ افسانے میں مہاجر پنڈتوں کا کرب اور کشمیر میں ہو رہے ظلم و تشدد کو یوں تخلیقی روپ دیا گیا ہے جیسے کوئی کہانی نہیں بلکہ تاریخ کا ایک حقیقی واقعہ ہو۔ پنڈتوں کا چھوڑا ہوا مقفل گھر، دہشت گرد کا اندر گھس کر توڑ پھوڑ کرنا، پھر فوجیوں کے ہاتھوں مکان کو گولیوں سے چھلنی کرنا کشمیر کے درد و الم کی بھرپور وضاحت کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو جو منظر نامہ اس افسانے میں سامنے آتا ہے وہ دنیا کے کسی مقام سے وابستہ ہو سکتا ہے جہاں امن و امان کے بدلے انتشار پھیلا ہو۔ ایسی ہی صورت حال ان کے کئی افسانوں میں نظر آتی ہے جہاں کشمیر میں ہونے والے استحصال اور زیادتی پر ردعمل ظاہر ہوتا ہے مثلاً گھونسلا، مخبر، سفید کراس، چنار کے پنجے، وفادار کتا، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی وغیرہ۔ 'ریزہ ریزہ حیات' میں وہ کشمیر کی بد قسمتی، معاشی اور سیاسی بدحالی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نہ ہوا میں وہ تازگی رہی تھی اور نہ پانی میں وہ مٹھاس، ہوا میں بارود کی وہ تیز بدبو بسی ہوئی تھی جبکہ پانی میں شورے کی تیزابیت گھلی ہوئی تھی۔ مغل باغات میں بھی وہ پہلی سی چہل پہل نہیں تھی اور نہ ہی کھیتوں میں وہ مدھر گیت گونج رہے تھے۔ اگر تھا تو بس سونی سڑکیں، پولیس چوکیاں اور ڈرے سہمے لوگ۔''

(دیپک بدکی: ریزہ ریزہ حیات، ص 48)

'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' افسانہ ایک ایسے پنڈت بزرگ کے احساسات کی عکاسی کرتا ہے جو نقل مکانی پر مجبور ہوا لیکن کشمیر کی محبت وہ کبھی ترک نہ کر سکا وہ حیران ہے کہ آخر اس کا حق سکونت یکدم کیسے ختم ہو گیا۔ اس افسانے میں کشمیری مکان کی بناوٹ اور اس کی طرز تعمیر کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مگر ان کے یہاں صرف اس دور کا المیہ ہی نہیں ملتا بلکہ ان دنوں کی تصویریں بھی ملتی ہیں جب کشمیر میں حالات اچھے تھے۔ اس حوالے سے ان کے افسانے 'شیر اور بکرا'، 'اچانک'، 'ورثے میں ملی سوغات'، 'ویوگ'، 'آؤ کچھ اور لکھیں'، 'پہاڑوں کا رومانس'، 'اداس لمحوں کا کرب'، لمحوں نے خطا کی ہے، ٹھنڈی آگ، یوم حساب وغیرہ افسانے کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں کشمیر کی تہذیب اور ثقافت کا رنگ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ افسانہ 'کبھی ہم سے سنا ہوتا' میں انسانی نفسیات اور استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سیدہ نسرین نقاش، دیپک بدکی کے افسانوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

''دیپک بدکی کی لگ بھگ سبھی کہانیاں حقیقت پر مبنی ہیں۔ وہ کچلے ہوئے اور خوف زدہ انسانوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ مسخ چہروں کو اپنے قلم سے

حقیقی خدوخال دینے میں مصروف ہیں، وہ ہونٹ جو جبر و استحصال کے اندھیروں میں اپنی مسکراہٹ اور دلکشی کو کھو چکے ہیں وہ ان کے لیے البیلی ہنستی گاتی زندگی کے خواہاں ہیں جہاں ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو، محبت ہی محبت ہو۔''

(نسرین نقاش: اسباق، جولائی ستمبر 2007، ص 54)

کشمیر کے ایک اور افسانہ نگار دیپک کنول ہیں جو پہلے ڈی کے کنول کے نام سے افسانے و ڈرامے لکھتے تھے۔ انھوں نے کشمیری پنڈتوں کی دربدری اور بے گھری پر افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'برف کی آگ' کے سبھی افسانے کشمیر کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں جن میں 'مخبر'، 'تفتیش'، 'شعلے'، 'حیوانوں کی بستی'، 'کراس فائرنگ اور سزا' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حامدی کاشمیری اور نور شاہ نے قریباً پچاس سال پہلے لکھنا شروع کیا۔ حامدی صاحب نے اس کے بعد شاعری اور تنقید کو اپنایا مگر نور شاہ صاحب صنف افسانہ کے ساتھ ہمیشہ جڑے رہے اور ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھتے رہے۔ ان کی یادداشتوں پر مبنی چند کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ دونوں قلم کاروں کے زیادہ تر افسانے رومانوی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں کشمیر کا پس منظر بنیادی ہے۔ زندگی کا حسن و جمال حامدی کاشمیری کے یہاں نمایاں ہے ان کے افسانوی مجموعے 'سراب' اور 'برف میں آگ' میں عشقیہ کہانیاں ہیں جو کشمیر کے قدرتی مناظر کے پس منظر میں بھلی لگتی ہیں اور وادی کے نچلے طبقے کے لوگوں کی کسمپرسی بھی ہے۔ ان کے افسانہ 'اندھیرے کی روشنی' میں کشمیر کی روز مرہ زندگی اور جھیل ڈل میں رہنے والوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ 'بہار آنے تک' افسانہ وادی کی بے روزگاری اور غریبی کی ترجمانی کرتا ہے۔ مظہر امام، حامدی کاشمیری کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' حامدی کاشمیری کے افسانے کشمیری زندگی کے عکاس ہیں۔ آج کم لوگوں کو احساس ہوگا کہ آج سے کئی سال پہلے کشمیر کے نچلے طبقے کی زندگی بیچارگی اور کسمپرسی کی شکار تھی۔'' (مظہر امام: بحوالہ شیرازہ (جموں کشمیر میں اردو افسانہ نمبر)، کلچرا کادمی سرینگر، ص 31)

نور شاہ کے نو افسانوی مجموعے (بے گھاٹ کی ناو، ویرانے کے پھول، من کا آنگن اداس اداس، ایک رات کی ملکہ، گیلے پتھروں کی مہک، بے ثمر سچ، آسمان، پھول اور لہو، کشمیر کہانی) منظر عام پر آئے ہیں جن میں رومانوی افسانوں کے علاوہ کشمیر کی ثقافت، سماجی اور سیاسی کروٹوں کو بھی انھوں نے موضوع بنایا ہے۔ نور شاہ کشمیر کے حسین مناظر کا شیدائی ہے اور رومانیت، انسان دوستی، رواداری ان کے فن کا بنیادی عنصر ہے جس وجہ سے وہ اپنے افسانوی مجموعے 'بے ثمر سچ' میں لکھتے ہیں:

'' یہ وہ جگہ ہے جہاں پہاڑ، پانی اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ وادی کے اس حصے میں میرے احساس جمال کی پرورش ہوتی ہے اور وہ جن کو میری آنکھوں نے سمیٹ لیا ہے لاشعوری طور پر میری کہانیوں میں منعکس ہوتا ہے۔'' (نور شاہ، بے ثمر سچ، ص 7)

عمر مجید جدیدیت کے علمبردار تھے۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کی عکاسی جگہ جگہ ملتی ہے ان کا افسانہ 'شہر کا اغوا' شروعات میں ہی کشمیر کے حالات کی تصویر کشی کرتا ہے:

'' یہ کون سی جگہ ہے، کیسی خاموشی ہے، یہ ویرانی کا عالم، یہ ڈرانے والی خاموشی، یہ مکان، یہ دکانیں، یہ سڑکیں خالی کیوں ہیں۔ اس شہر میں رہنے والے لاکھوں لوگ کہاں چلے گئے۔'' (عمر مجید: شہر کا اغوا، مشمولہ: شیرازہ (اشاعت خصوصی یادگار عمر مجید)، ص 112)

عمر مجید کی کہانیاں کشمیر کے گرد گھومتی ہیں وادی کے حالات نے ان کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا ہے ان کے موضوعات دکھ درد، غربت اور امن پسندی وغیرہ ہیں۔ ان نکتوں کو ابھارتے ابھارتے ان کے یہاں کشمیری تہذیب و ثقافت کے نمونے بھی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں نور شاہ لکھتے ہیں:

'' اسلوب کا ستھرا پن ان کی کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کشمیر، کشمیریت اور کشمیر کی زندگی ان کے محبوب ترین موضوعات ہیں۔'' (عمر مجید/ مرتب: سلیم سالک، عمر مجید کے بہترین افسانے، ص 27)

ترنم ریاض عصر حاضر کی ایک نمایاں خاتون افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں کشمیر کی فضائیں اور ارد گرد کے حالات پوری طرح موجود ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے، جن کے عنوان ہی کشمیر کے حوالے سے علامتی جہتیں واضح کرتے ہیں، منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'یہ تنگ زمین' اسی وادی کا استعارہ ہے جو اپنے مکینوں کے لیے تنگ ہو چکی ہے۔ 'ابابیلیں لوٹ آئیں گی' انصاف کی خواہش کا استعارہ ہے کہ آخر ایک دن ظلم کی یہ آندھی تھم جائے گی اور 'یمبر زل' جو بہت ہی نازک پھول (نرگس) ہے اور گرمی سے برگ برگ جھڑ جاتا ہے یہ پھول گویا کشمیر کی حسین وادی کا استعارہ بنتا ہے جو لخت لخت ہو چکی ہے۔ ان کے افسانہ 'مجسمہ' میں کشمیر کے تہذیب اور تاریخی ورثے کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیریت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں پھرن، ٹوپی، سماوار، پیالے، اخروٹ پکنے کا موسم، پیپر ماشی اور دستکاری وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ افسانہ 'یمبر زل' کشمیریت کے حوالے سے ان کا ایک شاہکار افسانہ ہے جس میں کشمیری تہذیب و ثقافت کی شناخت نظر آتی ہے اسی طرح افسانہ 'کشتی، حور، برف گرنے والی ہے، پھول، ماں' وغیرہ کشمیر کے پس منظر میں ہی لکھے گئے ہیں۔ ان کے افسانوں کے بارے میں دیپک بدکی رقمطراز ہیں:

'' ترنم ریاض نے اپنے انفرادی کرب کو غم کائنات کا حصہ بنا لیا ہے۔ ایک جانب شہر آشوب اور دوسری جانب بڑے شہر کی مصنوعی زندگی کا المیہ......افسانہ نگار ہم عصر زندگی سے اپنے پلاٹ چنتی ہیں اور آس پاس کے ماحول سے کردار ڈھونڈ نکالتی ہیں''

(دیپک بدکی: عصری تحریریں، ص 91)

زاہد مختار، جو عصر حاضر کے ابھرتے ہوئے قلم کار ہیں شاعری اور صحافت کے علاوہ افسانوی ادب میں بھی خاصی مہارت رکھتے ہیں ان کے دو افسانوی مجموعے 'جہلم کا تیسرا کنارہ' اور 'تحریریں' منظر عام پر آئے ہیں۔ 'جہلم کا تیسرا کنارہ' افسانوی مجموعے کے اکثر افسانے کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے کئی افسانے کشمیر کے عام انسان کا درد و کرب بیان کرتے ہیں جن میں 'سورج کا پہلا اندھیرا، سحر ہونے تک، لمحے کا سفر، پل صراط، پہلا چہرہ' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا افسانہ 'جہلم کا تیسرا کنارہ' ایک ایسے انسان کی روداد ہے جس کا ہاؤس بوٹ سیلاب نگل لیتا ہے پھر زندگی کی کشمکش میں انھیں ہر وقت حالات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ پہلے ہاؤس بوٹ قہر خدا کا شکار ہوتا ہے پھر جہلم کے کنارے ان کا بنایا آشیانہ قہر آدم کا شکار ہوتا ہے یوں وہ بے سروساماں ہوتے ہیں۔ ویریندر پٹواری ان کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' کشمیر میں رہنے والے لوگوں کو آج بھی جسمانی، ذہنی اذیتوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ وہ زاہد صاحب نے اپنی کہانیوں بعنوان پل صراط اور سورج کا پہلا اندھیرا میں بیان کیا ہے۔'' (زاہد مختار، تحریریں (ویریندر پٹواری: جہلم کا تیسرا کنارہ....)، ص 82)

مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کے علاوہ کئی اہم اور قابل ذکر افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں کئی افسانے کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔

■

Mudassir Rashid Feeroz, Research Scholar, Punjabi University, NH 64, Urban Estate Phase II, Patiala District, Patiala, Punjab 147002 (Punjab)

افصح ظفر

شاہد احمد شعیب
بغاوت میں روایت کا شاعر

شاہد احمد شعیب سے میرا تعارف پہلی بار اس وقت ہوا جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی سروس میں بحیثیت لکچرر ہو کر مستقلاً گیا واسی بن چکے تھے اور ہم دونوں علم و عمل کی دنیا میں اچھی طرح داخل ہو چکے تھے۔ دونوں ذاتی اور ادبی طریقے پر ایک دوسرے کا ساتھ دینے لگے تھے۔ ہم دونوں چھوٹے موٹے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے۔ شعیب بے حد ملنسار، بے حد احباب پسند اور مطالعہ میں مگن رہنے والے شخص تھے۔

شاہد احمد شعیب نے عام طور پر نظمیں تخلیق کی ہیں ویسے کبھی کبھی غزلیں بھی کہتے رہے ہیں۔ جب ان کی شاعری کی عمر تقریباً پچیس سال ہوئی تو پہلا مجموعہ 'لے سانس بھی آہستہ' کے نام سے شائع ہوا جس میں نظموں کی تعداد کافی تھی اور تھوڑی سی غزلیں بھی تھیں۔ یہ پہلا مجموعہ تخلیقی لحاظ سے تھا تو بڑا ہی طاقتور (Powerfull) مگر اس کی پذیرائی اتنی نہیں ہوئی جس کا مستحق وہ مجموعہ تھا! اس کی وجوہات کئی ایک ہو سکتی ہیں ان وجوہات میں ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس مجموعے کی نظمیں اور غزلیں عام طور پر Performing Art کا درجہ نہیں رکھتی تھیں اور پھر یہ کہ جن شعریات کی ترویج شعیب کی نظموں اور غزلوں سے ہو رہی تھی' اس کا چلن ابھی تک عام نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ ن۔ م۔ راشد سے لے کر عمیق حنفی تک ایک سے ایک اہم شاعر اس قسم کی نظم نگاری کی دنیا میں آتے رہے مگر وہ اُردو کی روایتی نظم نگاری کی ڈگر سے مکمل طریقے پر الگ نہ ہو سکے اس کی بھی وجوہات ہو سکتی ہیں اور ہیں۔ یہ الگ موضوع ہے، اس پر بحث ہو سکتی ہے مگر اتنی بات تو طے ہے کہ اس انداز و ادا کو اپنانے والے اکثر شعراء نفی فن الذات کے شکار ہو گئے اور اردو شاعری کے پرفورمنگ آرٹ والے مزاج سے اپنے آپ کو عام طور پر الگ تھلگ رکھتے رہے' اسی لیے ان کی نظم نگاری قبول عام کی سند حاصل نہ کر سکی۔ شعیب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور ان کا مجموعہ 'لے سانس بھی آہستہ' عوام میں مقبول نہ ہو سکا۔ مگر فکر و نظر والے لوگ کیوں خاموش رہے' یہ ایک سوالیہ نشان ہے؟ اردو میں عام طور پر شعراء کو ادبی منچ پر زندہ رہنے کے لیے رسالوں میں لگاتار چھپتے رہنا پڑتا ہے۔ اگر شاعری کی اچھی بری چیزیں چھپتی رہتی ہیں تو ان کو شرف شہرت و مقبولیت ملتی رہتی ہے۔ اگر وہ چھپنے چھپانے سے گریز کرتے ہیں تو لوگ انھیں بھلا دیتے ہیں۔

جو شعرا بے نیاز یا انا پسند ہوتے ہیں انھیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی! شاہد احمد شعیب بھی انھیں شعرا میں شامل ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ انا پسند ہیں مگر ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے نیاز ضرور ہیں شاید یہی وجہ تھی کہ ایک طویل عرصے بعد یعنی پہلے مجموعہ 'لے سانس بھی آہستہ' کی اشاعت کے 25 سال بعد اب یہ دوسرا مجموعہ میر تقی میر کے آدھے مصرعے کو یوں مکمل کرتا ہے۔

'.........نازک ہے بہت کام' پچاس سال کے شعری ریاض کے بعد شاہد احمد شعیب کے یہاں میر کا مصرعہ اس طرح دو شعری مجموعے میں یوں مکمل ہوگا مجھے اندازہ نہ تھا میر کے اس مصرعے کو اگر مکمل کر کے دیکھیں تو شاید یہ کچھ پتہ چلے.........''

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

اسی غزل میں میر کا ایک شعر اور ہے:

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

میرے خیال میں میر کے دونوں اشعار میں آفاق کا لفظ کوئی عام لفظ نہیں ہے۔ اس لفظ میں تہہ داری ہے۔ یہ اپنے اندر معنی کی تہیں رکھتا ہے۔ 'لے سانس بھی آہستہ' الفاظ کی آواز بھی برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اگر شاعر کا تخلیقی ثبات جامد نہیں ہے تو سانس کی نزاکت بھی پر معنی بن جاتی ہے اور جانے مانے الفاظ بھی ان کہے بن جاتے ہیں۔ کیا میر کے آفاق اور شعیب کے ''شبد'، 'آواز' اور 'عبارت' میں کوئی رشتہ ہے؟ شعیب کے پہلے مجموعے میں ایک نظم ہے 'میرے شبدوں کی پتنگ' اس نظم میں شعیب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ انھیں اپنے طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تخلیق شعر کے لمحے میں الفاظ کچھ بے لگام ہو جاتے ہیں۔ نظم 'میرے شبدوں کی پتنگ' یوں شروع ہوتی ہے۔

نیل گوں
وہ آسماں پھیلا ہوا
چتر' شبدوں کی پتنگیں

جھومتی گاتی ہوا کے ساتھ ساتھ

اڑ رہی ہیں

رقص کرتی چاروں جانب مڑ رہی ہیں

دراصل شاعر یہاں اپنے عجز کا نہیں بلکہ اپنے حوصلے کا اظہار کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ آگے کے بندوں میں دعویٰ کرتا ہے کہ شبدوں کی پتنگ کی ڈور اس کے پاس تھی اور اسے اپنے الفاظ اور اظہار پر قدرت بھی حاصل تھی لیکن وقت کے ساتھ جب خارجی اور باطنی طریقے پر اقدارِ حیات کشمکش اور ابہام کا شکار ہوتے ہیں تو لفظوں کی ڈور ٹوٹ

جاتی ہے اور تب شعیب کی یہ نظم یوں اختتام پذیر ہوتی ہے۔

آج کیوں — میری اجازت کے بغیر

اڑ گئیں ہیں — آسمانوں کی طرف

اور وہ شے ڈھونڈتی ہیں

جس کی خاطر

خاک اُڑاتا رہ گیا میں عمر بھر

کیا یہ شاعر کی بے بسی کا اظہار ہے؟ شاید نہیں، کیونکہ پتنگ کا اجازت کے بغیر اڑنا اور اس 'شے' کو ڈھونڈنا اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا کہ شاعر کو وہ شےِ لطیف جسے حاصل کرنے کے لیے عمر بھر مارا مارا پھرتا رہا' اسے اس نے حاصل کر لیا ہے؟ جب شاعر کو شےِ لطیف کی یہ دولت مل جاتی ہے تو اس کی آوازیں پچاس سال کے ریاض کے بعد لطیف کھنک پیدا کرنے لگتی ہیں' شعیب کا تازہ مجموعہ کلام 'نازک ہے بہت کام' کی نظم 'آوازیں'، اور 'شبد' میں شعیب کا آہنگ کافی معتبر ہو گیا ہے۔ ان دونوں نظموں میں صاف اشارا ملتا ہے کہ شاعر اس قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ ''شاعری کی خواہش ہوتی ہے کہ

شاہد احمد شعیب کے آبا و اجداد مکران سے آئے تھے۔ ان کے جدِ امجد سعد اللہ خاں اورنگ زیب کے عہد میں دس ہزاری منصب دار تھے لیکن بوجوہ فرار ہو کر نگاری ضلع گیا آ گئے۔ ان کے والد کا نام سلیم الدین احمد تھا۔ شاہد احمد شعیب 7 جنوری 1940 میں رانچی میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں تعلیم بھی ہوئی۔ بی۔اے رانچی کالج سے پاس کرنے کے بعد رانچی یونیورسٹی سے سماجیات میں ایم۔اے کیا اور انہیں ملازمت گمدھ یونیورسٹی میں سیاسیات میں ملی اور وہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔ گیا میں بود و باش اختیار کرنے کی وجہ ان کی شادی بھی تھی۔

شاہد احمد شعیب کا مجموعہ کلام ''لے سانس بھی آہستہ'' 1983 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے ساتھ ہی اہلِ نظر کی نگاہیں ان پر پڑنے لگیں۔ دوسرا مجموعہ کلام ''نازک ہے بہت کام'' 2008 میں شائع ہوا۔

وہ موسیقی بن جائے۔'' یہاں شعیب کے شبدوں کی بے لگامی کا دور ختم ہوتا ہے اور وہ آوازوں کی بے سدھ کیفیت میں جان ڈالنے کی زوردار کوشش کرتا ہے۔

جان آ جائے صدا میں

جان آ جائے صدا میں

کی تکرار دعا بھی ہے اور اعتماد بھی

دعا اور اعتماد کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب مصرعے کو ایک خاص قرأت کے ساتھ پڑھا جائے۔ شعیب کی نظم 'آوازیں' میں دونوں صورتیں موجود ہیں عام بھی اور خاص بھی' عام یہ کہ ہر شخص موسیقی کی گرہوں کو نہیں کھول سکتا وہ اپنی لطیف حسیات کو لفظ تو عطا کرتا ہے مگر اسے جمالیاتی طور پر غنائی شکل میں نہیں ڈھال سکتا۔ یہ اسے لقوہ زدہ کر دیتا ہے اور قافلہ خیال بے سدھ ہو جاتا ہے۔ دو بندوں پر مشتمل یہ نظم یعنی 'آوازیں' بڑے تیکھے انداز میں شروع ہوتی ہے۔ پہلا بند ہے:

قافلہ

آوازوں کا

بے سدھ پڑا ہے.........

اس تھکن کی توجیہہ دیکھیے اگلے مصرعے میں کس طرح ہوتی ہے۔

جانے وہ کیا ہے.........کہ میرے جسم میں

زہریلے پنجے گاڑتا ہے

میں لہو میں غرق ہوں

وحشت میں چاہوں چیخنا

لیکن زباں حرکت بھی کر پاتی نہیں ہے

قافلۂ خیال کی معذوری کا یہ عام رویہّ ہے جسے شاعر نے لفظوں کے مناسب استعمال سے تیکھا بنا دیا ہے۔ مگر جب شاعر حجرۂ خاص میں داخل ہوتا ہے تو آفاق کی وسعتیں انفس میں سما کر ایک ایسا شعری ہیجان پیدا کرتی ہیں کہ نظم کی جمالیاتی لذت اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ یقیناً یہ نظم اگر ایک خاص قرأت کے ساتھ پڑھی جائے تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اعتماد میں ڈوبا ہوا دست بہ دعا ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ نظم کا آخری بند 'اتر آ تما' کی ماورائی قوت کا اظہار کر رہا ہے۔ میں نے شروع میں اس نظم کے آخری بند کا آخری حصہ پیش کر کے دعا اور اعتماد کی بات کی تھی۔ اب آپ کے سامنے نظم کا آخری بند مکمل طور پر پیش کر رہا ہوں۔

کیسے اتر آتما کے

گیت لہراؤں فضا میں؟

ہوش آوازوں کو آئے

جان آ جائے صدا میں

جان

آ جائے

صدا میں۔

شاہد احمد شعیب کی نظم نگاری کے پس منظر میں درج بالا نظم کے ایک سرسری تجزیے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ شعیب کی نظم نگاری نئی شاعری کی دنیا میں ایک ایسی بوطیقا کا اشاریہ ہے جہاں قدیم و جدید نظم گوئی سے ایک غنائی فضا تیار ہوتی ہے۔ جو اسرار و اسطور کی ایک جانی انجانی اور ان کی جمالیاتی لطافت سے ہمکنار ہے۔ اپنے اس خیال کے جواز میں شعیب کی دوسری نظم 'شبد' پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ نظم اظہار و بیان کے لحاظ سے خود اعتمادی کا نمونہ ہے۔ اس نظم تک آتے آتے نظم نگار نازکی اور لطافت کے بے ہنگم اور بدشکل ہونے کا خوف اُس کے اعتماد کو استحکام بخشتا ہے اور وہ دعا سے آگے بڑھ کر زندگی کے تحرک میں داخل ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا خلقی اعتماد اپنے آپ کو خالق سے جوڑ دیتا ہے یہ نظم خلاقی کا ایک اچھا نمونہ ہے نظم کا پہلا حصہ دیکھیے:

تحرک

زندگی

رفتار کا چہرہ

دلِ تسکیں طلب کی گرمیِ اظہار کا چہرہ

مسرت

سرخوشی

آرام کی صورت

توازن، خامشی، اسرار جوشِ انجام کی صورت

سکونِ رشتۂ دل بھی جمالِ ربط بھی تم سے

علاجِ درد بھی تم سے کمالِ ضبط بھی تم سے

اس کے بعد دوسرا یا آخری حصہ دیکھیے:

مجھے
میرے عناصر کو
تناسب بخشنے والے
میں رشتہ توڑ لوں تم سے
کبھی ایسا نہیں ہوگا
کبھی ایسا نہیں ہوگا

الفاظ 'شبد' 'آواز' 'صدا' سچ پوچھیے تو شعیب کے یہاں صرف خزانۂ الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ لفظی خزانے انسانی نفسیات کو سارے عمرانی پس منظر میں قبول کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ الفاظ شاعر کو ایسی تقویت پہنچاتے ہیں کہ عناصر میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اظہار میں گنگناہٹ پیدا کرنے لگتا ہے اور اس کی نظم میں ایک زندگی آمیز ترنم پیدا ہو جاتا ہے اور اپنی ہیئت میں یہ نظم نئی ہونے کے باوجود روایت سے جڑ جاتی ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ نظم بغاوت میں روایت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوگا کی تکرار کسی ضد کا اشارہ نہیں بلکہ عقل و خرد کی وہ سرشاری ہے جو اس کی روح کو پر سکون کرتی ہے۔

جدید اردو نظم نگاری کی روایت ترقی پسند اور غیر ترقی پسند شعرا کی مرہون منت ہے لیکن بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے متن کے ابہامی تصور نے ایک ایسا سرّی نظام قائم کیا جس نے نظم کے آہنگ میں رخنہ سا ڈال دیا اور نظم کھردری سی چیز بن کر رہ گئی۔ شعیب کی نظم نگاری میں وہ ساری جدتیں موجود ہیں جس سے جدید نظم نگاری کی شناخت ہوتی ہے سوائے اس کے کہ اس میں آپ کو کہیں بھی کوئی بھی کھردرا پن نہیں محسوس ہوگا۔ بلکہ ان کی نظم مابعد جدیدیت کا ایک ایسا دروازہ کھول دیتی ہے۔ جہاں آرٹ کا تصور ذاتی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ شعیب کی ذات نجی ہونے کے باوجود ایسی تمدنی لطافت پیدا کرتی ہے جس سے ان کی شاعری کی ایک الگ راہ نکلتی ہے۔ اس سلسلے میں نمونے کے طور پر ان کی نظم 'میں شہر پی رہا ہوں' — پیش کی جا سکتی ہے۔

عہد جدید میں یعنی بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے اردو شعرا کے یہاں شہر اور شہری زندگی کا تصور اکثر و بیشتر نئی نئی علامتوں اور استعاروں کی شکل میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ پرانے تصور میں 'شہر' تمدن کا مثبت نمونہ تھا۔ مدنی زندگی کے رکھ رکھاؤ میں تہذیب و ثقافت کی خوشگوار پرچھائیاں شہر کے فروغ میں دکھائی دیتی تھیں لیکن نئے زمانے میں شہر کاری (Urbanisation) استحصال اور غیر انسانی رویوں کا اشاریہ بن گئی۔ احمد ندیم قاسمی نے ایسے شہر کو عقوبت خانہ کہا:

شہر ہیں یا کہ تمدن کے عقوبت خانے
عمر بھر لوگ چنے رہتے ہیں دیواروں میں

اور اسی دہائی کے آس پاس احمد ندیم قاسمی کے ہمنوا کیفی اعظمی اپنے مخصوص انقلابی رنگ میں شہر کو اس طرح پامال کرنا چاہتے ہیں:

جنگل کی ہوائیں آرہی ہیں
کاغذ کا یہ شہر اُڑ نہ جائے

شہر کاری نے جس طرح آزاد فضاؤں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے اور جس کی وجہ سے حساس شعرا احتجاج کرتے ہیں تو پھر شہر کاری کی بڑھتی اور پھیلتی 'عالم کاری' سے شعیب جیسا حساس شاعر کیسے بچ سکتا تھا۔ دیکھیے شعیب اپنی نظم 'میں شہر پی رہا ہوں' میں اپنے کرب کو کتنی ذہانت سے غصے نفرت اور انحراف میں تمام غنائی خوبصورتی کے ساتھ چار طویل بندوں میں نظم کو یوں تخلیق کرتے ہیں کہ سچ پوچھیے تو تغزل کے جھماکے کا نہیں بلکہ موسیقی کی گنگناہٹوں کا ہر بند میں زور بندھتا جاتا ہے۔ میری حقیر رائے میں یہ نظم اکیسویں صدی میں اپنے موضوع اور اپنی غنائیت کے سبب جدید نظم گوئی میں ایک نشانِ راہ ہے۔ موضوع اور ہیئت کے نئے پن کے سبب یہ نظم صحیح معنی میں ایک الگ جائزہ چاہتی ہے۔

یہ تو تھے کچھ ایسی نظموں کے نمونے جن میں شاعر حسی طور پر ملفوف رہا ہے۔ اب آئیے ایک دو ایسی نظموں کا جائزہ لیں جو شعیب کی شاعری کو دانشورانہ رنگ عطا کرتی ہیں۔ ان میں مختصر نظمیں بھی ہیں اور طویل بھی۔ یہ ہمیں شاعرانہ انداز میں ذہنی غذا بھی فراہم کرتی ہیں اور ہمیں پر لطف طور پر اکساتی بھی ہیں۔ ایک نظم 'بک شیلف' یہ ایک تجرباتی نہیں بلکہ تجربی نظم ہے۔ یہ وہ نظم ہے جو علم و عمل کے بعد حاصل ہوتی ہے 'بک شیلف' ایسے عالم کا اشاریہ ہے جو اس کے علمی خزانے کی نشاندہی کرتا ہے مگر جس کے ذریعے عملی زندگی کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ یہ علم تو سماجی اور معاشرتی علم سے حاصل ہوتا ہے۔ 'بچوں کے کھلونے' وہ گہوارہ ہیں جو عالم اور فاضل کو بھی ذہنی طریقے پرست کر دیتے ہیں۔ میری نظر میں یہ نظم علم و عرفان کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ یہ نظم کتنی خوبصورت ہے اس کا اندازہ تو پوری نظم کو پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ نمونے کے طور پر اس کے ابتدائی مصرعے دیکھیے:

میرا بک شلف
خالی ہے کتابوں سے

کلامِ شاہد احمد شعیب

○

زندگی پانے کی حسرت ہے تو مرتا کیوں ہے
شہرِ ممنوع سے ہوکر وہ گزرتا کیوں ہے

جب بھی امرت کی کوئی بوند زباں پر ٹپکی
اک عجب زہر سا رگ رگ میں اترتا کیوں ہے

چھو کے ہر شے کو گزر جاتا ہے وہ سیلِ بلا
میرے بے نام جزیرے میں ٹھہرتا کیوں ہے

ہم کو معلوم ہے لمحات کا حاصل بھی شعیب
دل مگر ڈوب کے ہر لمحہ ابھرتا کیوں ہے

○

دوستوں کی پناہ سے نکلوں
یعنی اب قتل گاہ سے نکلوں
سچ کے زہراب کو قبول کروں
خواب کی رزم گاہ سے نکلوں
زندگی تجھ سے کیا ملے آخر
کیوں نہ تیری پناہ سے نکلوں
کوئی سرگوشیوں میں کہتا ہے
اپنی حد نگاہ سے نکلوں
آئے پھر موسم سخن کاری
بے زبانی کی راہ سے نکلوں

○

پیاس کے صحرا کو دریا کر، جاں بخشی ہو، پانی دے
ہوش و خرد کی دنیا چھوٹے، تھوڑی سی حیرانی دے

ہم سیماب صفت لوگوں کو جینے کی آسانی دے
ہم کو بھی پارہ پارہ کر، موسم اک طوفانی دے

روشن کر تقدیسِ تعلق، حسن اسے لافانی دے
خواہش کو ملبوس عطا کر، لفظوں کو عریانی دے

○

مداوائے غمِ حالات کرنا چاہتا ہوں میں
خود اپنے آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں میں
نہ ہو کچھ فاصلہ تم سے، نہ قربت کا تصور ہو
ذرا یوں بھی گزر اوقات کرنا چاہتا ہوں میں
نکلنا چاہتا ہوں شہر کے اندھے اجالے سے
کسی جنگل میں روشن رات کرنا چاہتا ہوں

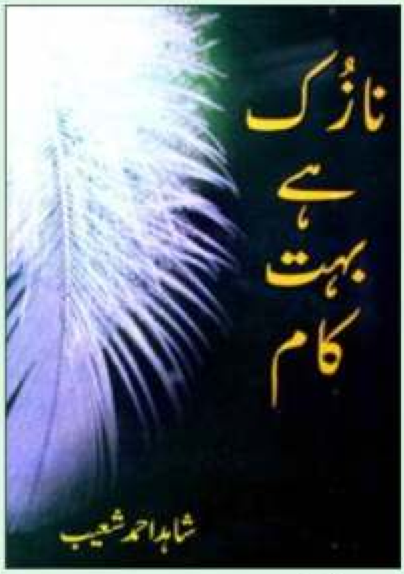

یہاں اب
میرے بچوں کے کھلونے ہیں
اور پھر اب دیکھیے اس نظم کی انتہا:
مگر اب
گیان کا سورج
ستارے تجربوں کے..... پھینک آیا ہوں
مجھے آبھاس اب ملنے لگا ہے
انوکھی روشنی میں
جگمگاتے سے نشاط افزا دنوں کا
میرا اک شیلف خالی ہے
یہاں اب میرے بچوں کے کھلونے ہیں۔

علم و دانش کی زندگی گذارنے کے بعد جب عناصر کا اعتدال کمزور ہوتا ہے تو انا اپنا راستہ ڈھونڈ کر اپنے جینے کے نئے انداز پیدا کرتی ہے اور اس طرح چراغ سے چراغ جلا کر تسکین ذات کا سامان مہیا کر لیا جاتا ہے۔ سماجی انسان اسی طور اپنی راہ زندگی تلاش کر لیتا ہے۔ کبھی وہ بک شیلف میں کتابیں سجا کر خوش ہوتا تھا اور اب وہاں بچوں کے کھلونے دیکھ کو خوش ہوتا ہے۔ دانشور ذہن کا اتنا اچھا استعارہ شعیب جیسے کہنہ مشق شاعر ہی سے ممکن ہے۔

یہاں پر میں ایک اور نظم 'بیداری' کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ نظم نسبتاً طویل ہے اور اپنے پیٹرن میں نئی ہے بادی النظر میں لغت جیسی لگتی ہے۔ یعنی پوری نظم ایک لفظ عقیدہ کی تشریح ہے مگر صحیح معنی میں ایسا ہے نہیں کیوں کہ اس نظم کے پس منظر میں پوری زندگی سمائی ہوئی ہے۔ ایسی زندگی جو بغیر ماورائیت کے ممکن نہیں مگر عہد جدید میں عقیدے کی ماورائیت بھی تنزل پذیر ہو چکی ہے۔ نظم کا پہلا مصرعہ ہی عقیدے کے استحکام کو متزلزل کر دیتا ہے۔ دیکھیے:

تزلزل کے گرداب میں پھنس چکا ہے

آگے کے مصرعے اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں:

عجب تیز رفتاری وقت ہے
آتے جاتے پلوں کا عجب سلسلہ ہے
عجب رہ گزر ہے
عجب یہ سفر ہے
کسے گوشۂ عافیت کی خبر ہے

پھر اس کے بعد کے دو مصرعے اس نظم کے پہلے بند کو یوں مقفل کرتے ہیں:

میں زندہ ہوں کس طرح
اک معجزہ ہے

دراصل عقیدہ فرد اور سماج کے رشتے میں فراست عقل اور دور بینی کی وہ ازلی تاریخ ہے جو فکر و عمل کے ریاض سے آہستہ آہستہ عقیدہ یا رسم و رواج کی شکل اختیار کر لیتا ہے مگر شاعر جو اپنی تمام تخلیقی جودت کے باوجود فہم و فراست کا گرویدہ ہے 'کہیں نہ کہیں سے' کسی نہ کسی جگہ تشنگی محسوس کرتا ہے۔ اس کی چشم باریک ہیں، محض بصارت کو مطمئن نہیں کرتی بلکہ بصیرت کی رمزیہ قوت کو بھی حاصل کر لیتی ہے مگر اس کے باوجود اس کی تشنگی برقرار رہتی ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو مراجعت چاہنے لگتا ہے۔ اب یہاں پر عقیدہ پھنستا نہیں بلکہ کھو جاتا ہے اور پھر شاعر کا جی چاہتا ہے:

چلو انتہا سے اسی ابتدا کی طرف پھر
جہاں تیز رفتاری وقت سب کی امیں ہے
جہاں شہر کاری گذرتی نہیں ہے
جہاں سات رنگی فضا جاگتی ہے
جہاں دشت و کوہ و دمن کی حسیں چھاؤں میں
حسن تہذیب کی ابتدا جاگتی ہے
جہاں کی طرب ریز خاموشیوں میں
سکوں کی صدا جاگتی ہے

یہ مراجعت مریضانہ نہیں ہے۔ اس مراجعت میں فرار کا عنصر بھی نہیں ہے۔ یہ مراجعت دراصل ایک مدافعت ہے۔ اس نظام سے جو مشینوں کی غلامی سکھاتا ہے جو مشینوں کو خدا بنا دیتا ہے۔ جہاں ارتقا کے نام پر بے سبب شور اور ہنگامہ برپا کیا جاتا ہے۔ جہاں محنت کا استحصال ہوتا ہے۔ شاعر دنیا کو اس طرح ارتقاء پذیر دیکھنا چاہتا ہے جہاں انسانی بدن میں زندگی کی شعاعیں پھوٹیں' جہاں محنت خوش ادا جاگ جاگ اٹھے' جہاں حسن کا سکون بھی ہو اور حرکت کا عمل بھی' جہاں عقائد کی زنجیر نہ کھنکے بلکہ جہاں مذہب میں وہ ایمان در آئے جو ایسی کھنک پیدا کرے جس سے انسان کی ذات اپنی پہچان آپ بن جائے۔

دراصل شاہد احمد شعیب کے اس مجموعے میں فرد کا انکشاف بھی ہے اور اس کا اسرار بھی اور یہ کیفیت اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ شعیب کو دونوں پر بھروسہ ہے۔ فرد پر بھی اور سماج پر بھی۔ اسی لیے ہمیں ان کی لفظیات کا پھیلاؤ ایک نظام تو نہیں مگر ایک سلسلہ ضرور معلوم ہوتا ہے اسی لیے ان کی نظموں میں ہمیں کہیں معنی کی روشنی سمٹ کر ایک مرکز پر آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کہیں پھسل کر کائنات میں گم ہو جاتی ہے۔ شعیب کی شاعری پردہ دری بھی کرتی ہے اور پردہ افگنی بھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پچاس سالہ ریاض کے بعد شعیب کو اچھی طرح شبدوں کی پتنگ کو قلابازی کھلانا بھی آ گیا ہے اور وہ تخلیقی طور پر نثار جمال ہو کر الفاظ کی پتنگ کو بازیاب (Boomerang) کر دینے کا فن بھی جان گئے ہیں۔

> **علم و دانش کی زندگی گذارنے کے بعد جب عناصر کا اعتدال کمزور ہوتا ہے توانا اپنا راستہ ڈھونڈ کر اپنے جینے کے نئے انداز پیدا کرتی ہے اور اس طرح چراغ سے چراغ جلا کر تسکین ذات کا سامان مہیا کر لیا جاتا ہے۔ سماجی انسان اسی طور اپنی راہ زندگی تلاش کر لیتا ہے۔ کبھی وہ بک شیلف میں کتابیں سجا کر خوش ہوتا تھا اور اب وہاں بچوں کے کھلونے دیکھ کو خوش ہوتا ہے۔ دانشور ذہن کا اتنا اچھا استعارہ شعیب جیسے کہنہ مشق شاعر ہی سے ممکن ہے۔**

مجھے خوشی ہے کہ نوے پچانوے نظموں کے مجموعے 'نازک ہے بہت کام' کی چند ایک نظموں کا سرسری تجزیہ اس بات کی غمازی ضرور کرتا ہے کہ شعیب کے فکر و فن میں لفظوں کی معنویت چوطرفہ ہو گئی ہے۔ الفاظ اور تراکیب اب ابعادی ہو گئے ہیں۔ ابعادی ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک ان کے ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے اس مجموعے میں نظم کی شعریات کے نئے رخ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

[ڈاکٹر فصیح ظفر نے یہ مضمون شاہد احمد شعیب کی حیات میں لکھا تھا جو ان کے تنقیدی مجموعہ 'بساطِ نقد' میں شامل ہے]

■

Dr. Afsah Zafar
Road No.-1/A, White House Compound
Gaya - 823001 (Bihar)
Mob.:09431476486

خان محمد رضوان

اخبار الاصلاح: حریت پسندی کا جلی عنوان

اخبار الاصلاح انیسویں صدی میں حریت پسندی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ یہ اپنے عہد کا واحد ایسا اخبار تھا، جس نے غریبوں، مزدوروں اور انسانوں پر ہو رہے معاشی و سیاسی ظلم و استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مولوی برکت اللہ کا اس اخبار کے پیچھے اصل محرک یہ تھا کہ انگریز ہندوستان کا خون چوس رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے ملک میں بھک مری چھا گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ہماری قدیم ہندوستانی تہذیب کو بھی انھوں نے بری طرح متاثر کیا ہے۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ عوام ان مسائل کے حل کے لیے آگے آئیں اور ملک کو معاشی تنگی اور سیاسی بحران سے آزاد کرانے کے لیے پرامن طریقے سے دھرنا دیں۔ وہ یہ بھی پیغام دینا چاہتے تھے کہ تمام غریب اور مزدور مل کر اتحاد کے ساتھ حکومت وقت سے اس کے لیے مطالبہ کریں اور اپیل کریں کہ وہ ہمیں ہمارے ملک کی کھلی فضا میں سانس لینے کی اجازت دے اور مزدوروں کے لیے ہر طرح کی آزادی کا اعلان کرے۔ بغیر اس کے ملک کی بھک مری ختم نہیں ہو سکتی۔ اس آزادی کو حاصل کرنے کے لیے مولوی برکت اللہ نے مزدوروں کی ایک لیگ بنائی جس کا نام 'فریڈم آف انڈیا' تھا۔

مولوی برکت اللہ 17 جولائی 1859 میں بھوپال کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کو فطرت نے انقلابی ذہن و فکر دے کر بھیجا تھا بیسویں صدی کی ابتدا میں جو سرفروش و جاں باز برصغیر کے عوام کو آزادی کا نعرۂ مستانہ سنا رہے تھے ان میں مولوی برکت اللہ کا شمار صف اول میں ہوتا ہے اور ملک کے وہ سرکردہ علما و دانش ور جو غلام ہندستان کو غلامی کے طوق سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے ان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید، شیخ الہند محمود الحسن، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے اکابر ایک دھاگے میں موتی کی لڑی کی طرح پروئے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب بلا کے ذہین تھے، وہ بچپن سے ہی کچھ کر گزرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ان کی افتاد طبع کا بین ثبوت اس وقت ملا جب وہ روایتی مذہبی تعلیم کے حصول کے دوران 1883 میں گھر والوں کو کہے بغیر روپوش ہو گئے اور بھوپال سے بھاگ کر جبل پور کے ایک عیسائی مشنری اسکول میں داخلہ لے لیا، پھر ممبئی گئے، وہاں سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آپ انگلستان چلے گئے مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، یہاں ان کی ملاقات کچھ ایسے جیالوں سے ہوئی جو انھیں نظری غذا فراہم کر سکتے تھے، ان میں مجاہد آزادی گوپال کرشن گوکھلے اور معروف انقلابی رہنما شیام جی کرشن ورما قابل ذکر ہیں۔ 1899 میں مولوی برکت اللہ انگلستان سے نیویارک پہنچے۔ 1905 میں قائد تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی ہدایت پر ایک وفد کے ہمراہ جاپان گئے۔ یہاں چند سال ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد فرانس، جرمنی اور ترکی کا سفر طے کیا۔ 1918 میں مولانا محمود الحسن کی ہدایت پر پھر ایک وفد کے ہمراہ افغانستان گئے، جہاں انھوں نے افغان حکمراں امیر حبیب اللہ کو اپنی تحریک کا حامی بنانا چاہا مگر کامیابی نہیں ملی۔

یہاں یہ بات بھی خاطر نشاں رہے کہ جب یکم دسمبر 1915 کو آزاد ہندستان کی پہلی 'جلا وطن حکومت' کا قیام عمل میں آیا تو اس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ بنائے گئے اور وزیر اعظم مولوی برکت اللہ کو مولوی برکت اللہ کی سیاسی سوجھ بوجھ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے انگلستان اور جاپان کے دوران قیام سیاسی بصیرت پر حکمراں طبقے کے درمیان ہلچل مچادی، پھر غدر پارٹی کی تشکیل کے روح رواں رہے اور جلا وطن حکومت کے بانی کی حیثیت سے اہم کارنامہ انجام دیا، یہی نہیں بلکہ انھوں نے ہندستان کی جدوجہد آزادی کا دائرہ وسیع

مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ حصول آزدی کی خاطر مشقت جھیلنے میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرا جس سے ان کی صحت بھی خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار بائیس سال غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے کے بعد احباب کی طرف سے وطن واپسی پر اصرار نیز اپنی ناگفتہ بہ حالت کے باوجود انھوں نے پردیس میں موت کو گلے لگانا پسند کیا اور امریکہ کے شہر سان فرانسسکو میں جہاں وہ غدر پارٹی کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے 27 دسمبر 1927 کو جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

یونین سے امریکہ تک اور ترکی سے ایران تک پھیلا دیا اور بنفس نفیس چین، جرمنی اور برطانیہ کا سفر کرتے رہے، گویا کہ انھوں نے جس انقلاب کا خواب عنفوان شباب میں دیکھا تھا اب پیری میں اس کے عملی نتائج دیکھ رہے ہوں۔
مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ حصول آزدی کی خاطر مشقت جھیلنے میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرا جس سے ان کی صحت بھی خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار بائیس سال غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے کے بعد احباب کی طرف سے وطن واپسی پر اصرار نیز اپنی ناگفتہ بہ حالت کے باوجود انھوں نے پردیس میں موت کو گلے لگانا پسند کیا اور امریکہ کے شہر سان فرانسسکو میں جہاں وہ غدر پارٹی کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے 27 دسمبر 1927 کو جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

اس بیچ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ عظیم انقلابی رہنما اور پان اسلام ازم کے سرپرست سید جمال الدین افغانی کی صحبت اور شاہ ولی اللہ کی تحریروں نے ان کے جذبہ حریت کو دوآتشہ کردیا تھا۔ ایک لمحہ کو ہمیں یہاں پر رک کر غور کرنا چاہیے کہ وہ کون سی چیز تھی جس نے مولانا کو فرنگیوں سے اس قدر متنفر کر دیا تھا اور مزدوروں کا غمگسار بنا دیا تھا۔ مولانا کا واحد مقصد یہ تھا کہ بیرونی فوجی مدد اور داخلی اتحاد کے ذریعے ہندستان سے برطانوی ظلم و استبداد کا خاتمہ ہو۔ مولوی برکت اللہ راسخ العقیدہ اور باعمل عالم دین تھے۔ وہ شیخ الہند کی حیات میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی تحریک آزادی کے سربراہ کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے اور کوشش کرتے رہے کہ اس تحریک کو پوری دنیا کی حمایت حاصل ہو، اسی کوشش میں وہ تا عمر مختلف ممالک کا دورہ کرتے رہے۔ مولانا مذہب سے گہری وابستگی کے باوجود جدید خیالات ونظریات کے علم بردار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے، انھیں سامراجی شکنجے سے نجات دلانے، تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے اور قدیم ذہنی سانچے سے باہر نکلنے کا درس دیا۔ اسی سبب سے عمر کا قیمتی لمحہ انقلاب کے میدان میں صرف کردیا۔ اس کا واحد مقصد ہندستانی عوام بالخصوص مسلمانوں کی ترقی، ملک کی آزادی اور خوش حالی تھا مگر ان کے نزدیک یہ تبھی ممکن تھا جب ہمیں فرنگیوں سے آزادی ملے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ مولانا کی سیاسی، دینی اور سماجی بصیرت کا اندازہ اتنی آسانی سے لگانا مشکل ہے کیوں کی مولانا کی نظر مستقبل پر تھی وہ حال پر ماتم

کناں تھے۔ انھوں نے سیاسی اتھل پتھل کا بغور مطالعہ کیا تھا اور انھوں نے اپنی نظر سے زار روس کا زوال، مسلمانوں کی عظیم سلطنت عثمانیہ کو ٹکڑے ہوتے اور خلافت کو ختم ہوتے دیکھا تھا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے افغانستان اور روس کے انقلاب کے ساتھ ہی عربوں کی قومیت کے نئے دور کے آغاز کا بھی بہ چشم خود مشاہدہ کیا تھا، لہٰذا وہ ملک وملت کے عظیم رہبر ورہنما تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس وقت سیکولر نظام حکومت کا تصور پیش کیا تھا جب فرنگیوں کے ذریعے زبان بندی کی تحریک زوروں پر تھی۔ یہ مولانا مرحوم کی ہوش مندی، دانش مندی اور سیاسی سوجھ بوجھ اور فکری بصیرت کی ایک نمایاں مثال ہے۔

الاصلاح میں شائع ہونے والے مضامین میں بالخصوص ان باتوں پر توجہ دی جاتی تھی کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد کس طرح قائم ہو، خلافت بادشاہت میں کیسے تبدیل ہوسکتی ہے اور حج افیئر میں اور دی مکہ کانفرنس وغیرہ کے ذریعے اس کی کوشش کی جاتی تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اخبار مدیر کی حریت پسندی کا نمائندہ تھا اور مدیر یہ چاہتے تھے کہ ملک اور بیرون ملک کا پڑھا لکھا طبقہ ان باتوں پر غور کرے اور ملک کو جو شدید خطرات انگریزی حکومت سے لاحق ہیں ان کے ازالے کے لیے آگے آئے۔

الاصلاح کے شمارہ نمبر 3 جولائی 1936 اور برطانوی سراغرساں ادارے کی جانب سے محکمہ داخلہ کو بھیجی گئی رپورٹ کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی برکت اللہ صاحب ہندوستان کے ایک مشہور انقلابی رہنما تھے جو کہ جرمنی میں قیام پذیر تھے اور وہیں سے پورے یورپ میں اپنی انقلابی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے جرمنی کے شہر برلن سے ایک ماہوار تجارتی وعلمی رسالہ 'الاصلاح' جاری کیا تھا۔ الاصلاح عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں اپنے مشمولات پیش کرتا تھا، الاصلاح کے مندرجات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برکت اللہ صاحب 'الاصلاح' کے ذریعے مسلمانوں کے اتحاد کے حق میں اور برطانوی استعماریت کے خلاف اپنے افکار وخیالات کو برصغیر ہندو پاک، مشرق وسطی اور ایران کے پڑھے لکھے افراد میں پھیلانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مضمون 'ہندو، سکھ، مسلمان اتحاد' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کے اکثر باشندے کنگال ہیں، جن کو نہ کھانے کو پیٹ بھر روٹی، نہ پہننے کو کافی کپڑا اور نہ رہنے کو ستھرا گھر میسر ہے۔ اول تو نو

الاصلاح عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں اپنے مشمولات پیش کرتا تھا، الاصلاح کے مندرجات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برکت اللہ صاحب 'الاصلاح' کے ذریعے مسلمانوں کے اتحاد کے حق میں اور برطانوی استعماریت کے خلاف اپنے افکار وخیالات کو برصغیر ہندو پاک، مشرق وسطیٰ اور ایران کے پڑھے لکھے افراد میں پھیلانا چاہتے تھے۔

اب اور راجہ تین سو میلوں میں تین سو سے کچھ زیادہ ہیں، باہر دیکھنے کو بہت کچھ رنگ وروپ مگر اندر سب کھوکھلے ہیں۔ زمینداروں اور سوداگروں کی بھی یہی حالت ہے۔ آخر بھوکے، ننگے اور بے گھر لوگوں سے جو کیڑے مکوڑوں

کی طرح بے شمار ہوں کیا مدنیت کو ترقی کی امید ہوسکتی ہے اور انھیں کب دم لینے کی فرصت ہے کہ باقی اور قوم کی حالت کو درست کرنے کی فکر کریں؟''

دراصل مولوی برکت اللہ کو جو دلی تکلیف تھی وہ یہ کہ انگریز ہمارے ملک کے غریب مزدوروں کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں وہ جگ ظاہر ہے، اس کے ساتھ ہمارے ملک کو بھی لوٹ رہے ہیں، اس طرح ملک ہندوستان دنیا کے جغرافیائی نقشے پر ہمیشہ ہمیش کے لیے ایک غریب ملک اور مزدوروں کا ملک قرار پائے گا جب کہ ملک ہندوستان دنیا کے نقشے پر مال ومنال کے اعتبار سے وہ خوش نصیب ملک ہے جہاں انگریز آکر خود ہمارے خام مال کو سستے داموں میں خرید کر یورپ کی منڈی میں اچھی قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور پھر ہماری ہی اشیا کو

مولوی برکت الله کو جو دلی تکلیف تھی وہ یہ کہ انگریز ہمارے ملک کے غریب مزدوروں کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں وہ جگ ظاہر ہے، اس کے ساتھ ہمارے ملک کو بھی لوٹ رہے ہیں، اس طرح ملک ہندوستان دنیا کے جغرافیائی نقشے پر ہمیشہ ہمیش کے لیے ایک غریب ملک اور مزدوروں کا ملک قرار پائے گا جب کہ ملک ہندوستان دنیا کے نقشے پر مال ومنال کے اعتبار سے وہ خوش نصیب ملک ہے جہاں انگریز آکر خود ہمارے خام مال کو سستے داموں میں خرید کر یورپ کی منڈی میں اچھی قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور پھر ہماری ہی اشیا کو ہم سے اچھی قیمت پر فروخت کر کے روپیہ کماتے ہیں۔

ہم سے اچھی قیمت پر فروخت کر کے روپیہ کماتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان سدا سے ایسا نہ تھا۔ دو سو سال کے پہلے تک ہندوستان اپنے باشندوں کی زندگی کی ضروری اشیا اور آرائش کے اسباب پیدا کرتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کی زراعت وصناعت تجارت کی بھرپور تھی اور ساری زمین ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھی اور سارے کارخانوں پیشوں اور حرفوں کے وہ مالک تھے اور تمام اندرونی اور بیرونی تجارت وہی کرتے تھے۔ اس وجہ سے ہر ایک آدمی کو روٹی، کپڑا، گھر میسر تھا۔ ایسے ملک کو علم اقتصاد میں آزاد ملک کہتے ہیں۔''

مگر جب انگریزی سلطنت کی بنیاد ڈیڑھ سو سال پہلے ہندوستان میں پڑی تو انھوں نے قانون بنائے جس سے ہندوستان کے کارخانوں کی ساختہ چیزیں انگلستان میں محصول اور انگلستان کی ساختہ چیزیں ہندوستان میں بلا محصول بکیں۔ اس اندھا دھندہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مصنوعات کا تھوڑے دنوں میں نہ دیس میں اور نہ بدیس میں کوئی خریدار رہا اور انگلستان کے کل کارخانوں کی بنی ہوئی چیزیں ہندوستان میں بکنے لگیں اور ہندوستانی کارخانے آہستہ آہستہ مٹ گئے اور حالت یہ ہوگئی کہ سوئی، تاگا، قینچی، چو، چھری، کپڑا، جوتا، رکابی، پیالہ، کھلونے، دیا سلائی کوئی چیز ایسی نہیں جو پردیس سے نہ آتی ہو بلکہ مصنوعی شکر اور ساختہ گھی بھی دوسرے ملکوں سے آتا ہے۔ ان کارخانوں اور پیشوں کے مٹ جانے سے قوم کے آدھے سے زیادہ لوگوں کی روٹی ماری گئی۔''

ماہنامہ الاصلاح میں ہندو، مسلم، سکھ اتحاد کے نام سے شائع ایک مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ 'آزادی ہندوستان لیگ' کے نام سے ایک تحریک بھی برپا کرنا چاہتے تھے جس میں وہ کسانوں، مزدوروں اور طلبہ کو انگریزی استعماریت کے خلاف متحد ہونے اور ہندوستانی زمین کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

عربی زبان میں دیے گئے ایک اشتہار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے 'الخلاف' کے نام سے انگریزی زبان میں ایک کتاب تالیف کی تھی جس میں مسئلہ خلافت کے تعلق سے لوگوں میں بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے اور خلافت کو وہ مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد تصور کرتے تھے۔ اشتہار میں لوگوں سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ عام کریں تاکہ 'الاصلاح' کی اعانت بھی ہو اور خلافت کے تعلق سے لوگوں میں بیداری پیدا ہو۔

مولوی برکت اللہ صاحب قرآن مجید کے علوم ومعارف کو یورپ میں عام کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے برلن کی ایک مسجد میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

الاصلاح میں شائع ایک اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی علوم ومعارف کی تبلیغ کے لیے انھوں نے ایک انجمن بھی قائم کی تھی۔ اشتہار میں جمعیت کے لیے ایک پریس اور چند ایسے مبلغین کی ضرورت کا اعلان شائع کیا گیا ہے جو قرآن کے علوم ومعارف پر لکچر دے سکیں۔

برکت الله صاحب کے اخبار 'الاصلاح' کی تین کا پیاں ہندوستان میں ملیں۔ محکمہ سراغرسانی کے افسر کی رپورٹ میں الاصلاح کے ہندوستان میں داخلے پر پابندی کی سفارش کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ رسالہ انگریز حکومت کے خلاف عوام کو برانگیختہ کر رہا ہے۔ اس رسالے میں عوام سے حکومت کو لگان نہ دینے کی بات بھی کہی گئی ہے۔ اس لیے اس پر پابندی لگنی چاہیے۔

برکت اللہ صاحب کے اخبار 'الاصلاح' کی تین کا پیاں ہندوستان میں ملیں۔ محکمہ سراغرسانی کے افسر کی رپورٹ میں الاصلاح کے ہندوستان میں داخلے پر پابندی کی سفارش کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ رسالہ انگریزی حکومت کے خلاف عوام کو برانگیختہ کر رہا ہے۔ اس رسالے میں عوام سے حکومت کو لگان نہ دینے کی بات بھی کہی گئی ہے، اس لیے اس پر پابندی لگنی چاہیے۔

انگریزی حکومت کے خلاف ''آزادی ہندوستان لیگ'' کے نام سے جس تحریک کی دعوت دی گئی ہے اس کے حسب ذیل مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ افسروں کے بقول قابل گرفت ہیں:

1۔ ہندوستان کی سیاسی واقتصادی پوری آزادی۔
2۔ حکومت اجنبی کی نوکری عار اور غلامی کا پیسہ مردار۔
3۔ زراعت وصناعت وتجارت تعلیم یافتہ لوگوں کا ذریعہ معاش۔
4۔ فوجی نوکری سے کنارہ۔
5۔ نئے علوم وفنون جو آج تہذیب یافتہ قوموں میں جاری ہیں تمام قوم میں پھیلانا۔
6۔ قانوناً کسانوں کا لگان کم کرانا اور مزدوروں کی اجرت کو فراخی رزق کا ذریعہ بنانا۔
7۔ قانوناً وطنی کارخانوں کو مدد دینا اور پردیسی بنی ہوئی چیزوں کو ہندوستان میں آنے سے روکنا۔
8۔ ہر عاقل بالغ کو حق انتخاب اعضائے مجلس قانونی ومجلس شوریٰ۔
9۔ زمین ملکیت قوم اور نہ ملکیت حکومت اجنبی۔

■

Mohd Rizwan Khan
D-307, MMIP, Abul Fazal Enclave
New Delhi - 110025
Mob.:9810862283

نوشین حسن

میر ناصر علی کی انشائیہ نگاری

میر ناصر علی دہلوی اردو کی ان ممتاز و معتبر ہستیوں میں ایک تھے جن کے ادبی کارناموں پر ایک مدت تک زمانے کی لاپرواہی کی گرد جمی رہی اور جب یہ گرد ہٹی تو زمانے کو معلوم ہوا کہ وہ کس قدر بلند پایہ ادیب تھے۔ میر ناصر علی تقریباً 56 سال تک اردو ادب کی ترقی اور فروغ میں منہمک رہے۔ میر ناصر علی کا زمانہ سرسید اور ان کے عناصر خمسہ کا زمانہ ایک ہی تھا۔ رفقائے سرسید کے یہاں انشائیہ نگاری کے ابتدائی نقوش ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن میر ناصر علی کے یہاں انشائیہ اپنے شباب پر دکھائی دیتا ہے۔

میر ناصر علی کا شمار اردو زبان سے محبت رکھنے والوں میں بھی کیا جاتا ہے۔ ان کا نام اردو زبان کے عظیم خدمت گار مولوی عبدالحق کے ساتھ لیا جاسکتا ہے کیونکہ مولوی عبدالحق نے جس طرح سے اپنی پوری زندگی اردو زبان کی ترقی و ترویج اور حفاظت کے لیے صرف کی اسی طرح میر ناصر علی زندگی بھر اردو کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ میر ناصر علی نہایت ہی بلیغ ذہن و فکر کے مالک تھے۔ ان کا مطالعہ عمیق اور مشاہدہ بسیط تھا۔ انھوں نے نہ صرف اپنی بلکہ دیگر زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کر رکھی تھی۔ جن میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور فرانسیسی زبانیں خاص ہیں۔ میر ناصر علی ان زبانوں کی فنی عظمت سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ اسی طرح اپنی زبان میں بھی وسعت دیکھنا چاہتے تھے کیوں کہ اس وقت تک اردو میں مکمل طور پر اتنی ہمہ گیری پیدا نہیں ہوئی تھی جبکہ دوسری زبانوں میں یہ خوبیاں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ نیز انھوں نے اردو زبان کے فروغ کے پیش نظر ڈھیروں مضامین تحریر کیے جو اردو کے تئیں ان کی محبت کا نمونہ ہیں۔ اردو کے ان مضامین میں 'اردو لٹریچر، زبان اردو لٹریچر کی خوبیاں، اردو ہندی، میری زبان اور میرا بیان، پھر وہی زبان اور وہی بیان، آج کل کی اردو لٹریچر، لطف بیان، لطیف زبان اردو، حسن زبان اردو، اپنی زندگی کی قدر، اردو زبان پر انگریزی زبان کا اثر مختلف نوعیت پر مبنی مضامین ہیں۔ لیکن ان مضامین میں اردو کے حوالے سے ایک پہلو تقریباً یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ وہ اردو زبان کی ابلاغ و ترسیل ہے۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میر ناصر علی کے یہاں اردو اوڑھنا بچھونا تھی۔ میر ناصر علی کا خیال تھا کہ اردو کی ترقی کے لیے ہندوستان کے ہر اس شہر میں، جہاں اردو والے ہیں، باہمی مشاورت سے سوسائٹیاں قائم کی جائیں اور دہلی کو مرکز بنایا جائے۔[1]

میر ناصر علی کا یہ کہنا درست ہے کہ ہر زبان کی بول چال کا ڈھنگ ایک دوسرے سے نرالا ہوتا ہے۔ باوجود اس کے ان زبانوں میں وہ قوت نہیں جس کی بنا پر وہ دوسری زبانوں کو اپنے اندر ضم کر سکیں۔ لیکن اردو ایک ایسی خوبصورت زبان ہے، جس میں نہ صرف تمام زبانوں کی خوبیاں بہ آسانی شامل ہو سکتی ہیں بلکہ اس میں ہر قسم کے مضمون کا مطلب ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہی خوبی اسے دیگر زبانوں میں ممتاز بنا دیتی ہے کہ اس میں انسان کے جی میں کچھ بھی آئے بے تکلف ہو کر کہہ سکتا ہے۔

میر ناصر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز دوران ملازمت کیا۔ ان کا پہلا رسالہ 'تیرھویں صدی' (1876) سرسید کے 'تہذیب الاخلاق' (1870) کے چھ سال بعد شروع ہوا۔ جس نے ابتدا سے ہی کافی مقبولیت حاصل کی، کیونکہ رسالے کے زیادہ تر مضامین سرسید کی نیچریت کے خلاف ایک سوچا سمجھا ردعمل تھے۔ لیکن یہ رسالہ پانچ سال تک جاری رہ سکا اور بند ہو گیا۔ بعد ازیں میر ناصر علی نے بعنوان 'زمانہ' اور 'افسانہ ایام' دو رسائل ایک کے بعد ایک اپنے بھائی نصرت علی خاں کے مطبع 'نصرت المطابع' سے شائع کیے۔ لیکن یہ بھی کچھ مصلحت کے تحت جلد ہی بند ہو گئے۔ لہٰذا انھوں نے 1908 میں ایک اور رسالہ بعنوان 'صلائے عام' جاری کیا۔ یہ رسالہ تقریباً 22 سال تک شائع ہوتا رہا۔ 'صلائے عام' کا ادبی سفر کافی طویل رہا۔ ان کے اس رسالے کی بنیاد بھی ان کے باقی دوسرے رسالوں کی طرز پر رکھی گئی تھی جس کا واحد مقصد اردو کی قدر و قیمت متعین کرنا تھی۔ دراصل یہ رسالہ میر ناصر علی کی ذاتی دلچسپی اور ذوق و شوق کا نتیجہ تھا، لیکن ان کی تمام ادبی مصروفیات اور علمی مشاغل سے قطع نظر ہم ان کی انشائیہ نگاری پر گفتگو کریں گے۔

میر ناصر علی نے اپنے پاکیزہ خیالات کو شگفتگی بیان کے ساتھ زندہ و متحرک بنا کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسی نثر کی بنیاد ڈالی جو روایتی نثر سے منفرد تھی۔ میر ناصر علی اردو کو عربی، فارسی اور انگریزی جیسی زبانوں کی خصوصیات سے بھر دینا چاہتے تھے جس طرح ان زبانوں میں مختلف اسلوب کارفرما ہیں ہماری زبان بھی اور خاص کر نثر کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں رہے۔ اس کے ساتھ میر ناصر علی کے یہاں دو اصناف ترقی پاتی ہیں۔ ایک ادب لطیف اور دوسری انشائیہ نگاری، گویا کہ ان کے یہاں رومانویت کا رجحان بھی کافی پایا جاتا ہے۔ میر ناصر علی نے اپنی ذہانت اور وسیع مطالعے کی بدولت اس صنف میں وسعت پیدا کی۔ 'مضمون پریشان' کے عنوان سے انھوں نے باقاعدہ اس صنف کی بنیاد ڈالی۔ جسے ابتدا میں مضمون، اسے (ESSAY) اور بعد میں انشائیہ کی اصطلاح سے یاد کیا گیا۔ میر ناصر علی نے 'مضمون پریشان' کے

علاوہ بھی ایسے انشائیے تحریر کیے ہیں جو اپنی نظیر آپ ہیں۔ میر ناصر علی کے انشائیوں میں۔ بلا ہے جوشش طوفان آرزو تو نہیں، کسی کے آنے کا انتظار، شہر خموشاں، غم زندگانی، بساط خیال، از گہوارہ تا گور، عجب تماشائیت، مسکرانا، عقل وعقیدہ، ذکر خوباں، غم زندگانی، ہم ہماری ہستی، حسن عالم واسباب، موت، یادش بخیر اور مضمون پریشان کے عنوان سے ڈھیروں انشائیے تحریر کیے۔ نیز میر ناصر علی نے 'مسکرانا' جیسے موضوع پر انشائیہ لکھا۔ یہ انشائیہ آج سے تقریباً ایک سو دس سال پہلے تحریر کیا گیا جبکہ اس وقت ناقدین ادب کے یہاں ایسے موضوع پر اظہار خیال کا کوئی رواج نہیں تھا۔ میر ناصر علی نے پہلی بار اس موضوع کو برتا اور بتایا کہ مسکرانا ہنسی سے کہیں زیادہ اچھا ہوتا ہے کیوں کہ ہنسی میں بھدا پن معلوم ہوتا ہے۔ مسکرانے کا کمال یہ ہے کہ اس سے دل کا حال بغیر کہے معلوم ہو جاتا ہے۔ نیز مسکرانا چہرے کا زیور ہے۔ چہرے کی شکنیں جو رنج میں پیدا ہو جاتی ہیں وہ مسکرانے سے مٹ جاتی ہیں۔ مسکرانے سے بدشکل انسان بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مسکرانے کے متعلق میر ناصر علی کچھ یوں لکھتے ہیں:

''مسکرانا تین طرح کا ہے، ننھے بچوں کا، دیوانوں کا، حسینوں کا۔ بچوں کا مسکرانا کھانے پینے کا نتیجہ سمجھ لیجیے کہ پیٹ بھرے مسکراتے ہیں۔ دیوانوں کا مسکرانا دیوانہ پن میں داخل ہے۔ غضب ڈھاتا ہے تو حسینوں کا مسکرانا، محبت میں مسکرانا بلا کا سامنا کرنا ہے۔ اس کے سامنے تمام دنیا کی فصاحت بے کار ہے۔ جن لبوں کو بات کرنے سے انکار ہو ان کا مسکرانا کیا کچھ نہیں بتاتا۔ مسکرانا ترجمان محبت ہے، اس میں زبان کی ضرورت نہیں، حیا کی جان کہ اس میں زبان سے کچھ نہیں کہنا پڑتا، اس کا اثر زبان سے زیادہ ہوتا ہے کہ زبان میں تو یہ عیب ہے کہ دل میں کچھ اور زبان پر کچھ دراصل مسکرانا دل کا حال کہہ دیتا ہے، جس میں غلطی کا گمان نہیں اس میں ایک بڑی نازک بات ہے کہ جس طرح زبان سے خیال کا اظہار ہوتا، مسکرانے سے خیال کے اثر کا پتا لگتا ہے کہ پہلی صورت کو اگر عرق سے تشبیہ دی جائے تو دوسری کو گلاب کے عطر سے۔''2

اس انشائیہ میں میر ناصر نے سلیس زبان میں نفس مضمون بیان کیا ہے۔ مسکرانا نعمت غیر مترقبہ ہے۔ مسکرانا اطمینان باطن کی علامت ہے۔ مسکرانے سے بدشکل بھی اچھا معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت تو اور بھی زیبا ترین ہو جاتا ہے۔ مسکرانے میں شائستگی پائی جاتی ہے۔ پورا انشائیہ مانوس الفاظ سے بھرا ہے۔ میر ناصر علی نے اس انشائیہ میں کہیں بھی کوئی بھی لفظ ایسا نہیں استعمال کیا ہے جو قاری

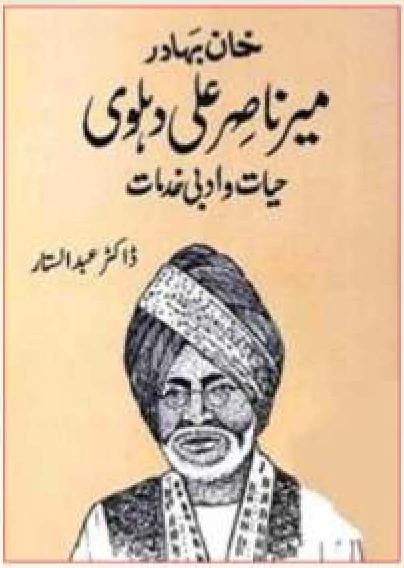

پر گراں گزرے۔ نیز انھوں نے لفظی اور معنوی صنائع و بدائع کی گتھیوں سے پرہیز کیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ جس مضمون کو بیان کر رہے ہیں اس میں کسی بھی طرح کے الجھاؤ کا دخل نہیں ہو سکتا ہے۔ نیز انھوں نے سہل ممتنع اور بے ساختہ انداز تحریر کو رنگین بیانی اور فلسفیانہ نکتہ رسی کے ساتھ بیان کیا ہے جس میں پاکیزہ خیالات کے ساتھ شگفتگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ جہاں ایک طرف قاری ان کی تحریروں سے محظوظ ہوتا ہے وہیں دوسری طرف میر ناصر علی اپنی تحریروں سے خود بھی مطمئن نظر آتے ہیں:

''اس طرز سے مجھے بڑا آرام ہے کہ ایک مضمون میں بہت مضمون پیدا ہو سکتے ہیں۔ صلائے عام کے قدر شناسوں میں سے ایک صاحب نے جو اچھے لکھنے والوں میں ہیں۔ مجھے لکھا ہے کہ مضمون پریشان کے چھوٹے چھوٹے جملے پر بڑا مضمون لکھا جا سکتا ہے۔3

مندرجہ بالا اقتباس اس بات کا شاہد ہے کہ میر ناصر علی کو بھی شعوری طور پر یہ معلوم تھا کہ وہ ایک ایسی نثر کی تخلیق کر رہے ہیں جو ان سے پیش تر مکمل طور پر وجود میں نہیں آ پائی تھی۔ لہٰذا پہلی بار انھوں نے انشائیہ کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا۔ انھوں نے انشائیہ کی عظمت کو ابتدا سے برقرار رکھا اور اس میں (انشائیہ) ذہنی ترنگ کی وہ لے پیدا کی، جسے آگے چل کر ناقدین ادب نے انشائیہ کے لیے لازمی مانا۔ نیز میر ناصر علی کے انشائیوں میں موضوع کا تنوع بھی موجود ہے جو انشائیہ کا دوسرا اہم وصف ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کے یہاں بیان کی ندرت اور شگفتگی تحریر کا خوب استعمال ملتا ہے۔ ایک انشائیہ نگاری کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ جب 'مسکرانا' جیسے موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ اس زمرے میں کئی ایسے پہلو تلاش کر لیتا ہے جو اس موضوع کی مناسبت سے ہم آہنگ ہے۔

لفظوں کے انتخاب میں غور وفکر، جامعیت اور اختصار میر ناصر علی کے انشائیوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ ایک کامیاب انشائیہ نگار کی طرح اپنے موضوع 'مسکرانا' کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور موتیوں کی طرح ہار میں پرو دیتے ہیں۔ 'ہے پی نیس' بھی بہت دلچسپ انشائیہ ہے۔ اس انشائیہ میں وہ انسان کی خوشی کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ جس کی تلاش میں وہ عمر بھر بھٹکتا پھرتا رہتا ہے۔ لیکن سچی خوشی اس کو نصیب نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''زندگی تمھاری کیسے دھوکے میں گزرتی ہے کہ رات دن تلاش ہے تو اس چیز کی جو کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ خوشی' ہے یا' ہے پی نیس' جس کے لیے تم مہد سے لحد تک سرگرداں رہتے ہو۔ کسی نے آنکھ سے نہیں دیکھی ہے' ہے پی نیس' یعنی دُنیوی راحت کو کسی خواب میں نہیں دیکھا، دنیا میں آج تک کسے چین نصیب ہوا۔' ہے پی نیس ہائے ہے پی نیس! تیرے نام کو زمانے کا مشتاق پایا، مگر تو کہاں! جسے دیکھیے تیرے تغافل کا کشتہ ہے، جس سے ملیے تیری جان کو رو رہا ہے۔ تیرے اقرار ہمیشہ جھوٹے نکلے اور تیرے اسباب بیہودہ۔ کون ہے جس پر تیرے فقرے نہیں چلتے، تیرے وعدے بھی پورے ہوتے نہیں سنے۔''4

مذکورہ بالا انشائیہ میں سوچ کا بہاؤ بھی ہے اور لفظوں کا چنندہ انتخاب بھی ہے۔ خوشی پانے کے لیے انسان کون کون سے جتن نہیں کرتا ہے۔ وہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے سے بھی قاصر ہے جو اس کے لیے سوائے شر کے اور کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ سچی خوشی پانے کے لیے ایسی منہاج پر نکل جاتا ہے، جہاں سے اس کی واپسی بہت مشکل ہوتی ہے اور آخرکار دنیا و عاقبت سے اپنے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ نیز یہ انشائیہ کا حسن ہوتا ہے کہ اس میں ایسے امکانات تلاش کیے جائیں جو زندگی سے بالکل قریب ہوں یعنی اسی کا حصہ ہوں۔ میر ناصر علی اس انشائیہ میں دور کی کوڑی لائے ہیں کہ ہر انسان اس' ہے پی نیس' کے پیچھے سرگرداں ہے اور اس کو پانے کے لیے وہ اس کے پیچھے جتنا بھاگتا ہے، وہ سراب کی طرح غائب ہوتی جاتی ہے۔ نیز اس انشائیہ کو موجودہ دور کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں تو اس کی افادیت کے پہلو اور بھی نظر آتے ہیں۔ سچی خوشی پانے کے جو طریقے موجودہ دور میں اپنائے گئے ہیں اور اپنائے جا رہے ہیں۔ اس میں سوائے ذہنی تناؤ کے کچھ اور نہیں ملتا ہے۔ مثلاً: ایکسٹرا میریٹل

> **میر ناصر علی کا انداز تحریر محض شاعرانہ ہی نہیں ہے بلکہ ایسے جمالیاتی رنگ میں رچا ہوا ہے۔ جس کا تعلق محض احساس حسن سے ہے جو معنوی کیفیات و جزئیات سے پرہے۔ جس کے لیے ماہر نفسیات کا ہونا ضروری ہے جو میر ناصر علی بلا شبہ تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے اپنی ان تحریروں میں یہ رنگ حاوی نہیں ہونے دیا۔ کیوں کہ ان کا سارا دھیان اپنی نثر کو ترقی پہنچانے کی طرف تھا۔اس لیے انھوں نے بو قلموں تحریروں کی طرف خوب توجہ دی۔**

افیرس، لیونگ ریلشن شپ وغیرہ انسان کو کچھ وقت کے لیے خوش تو کرتے ہیں لیکن قتل، خودکشی، طلاقیں اس سے بھی زیادہ بے سکونی بھری زندگی دے کر جاتے ہیں۔ نیز میر ناصر علی نے ایک ایسا انشائیہ تحریر کیا جو ہر زمانے میں ایک نئی معنویت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

میر ناصر علی کا انداز تحریر محض شاعرانہ ہی نہیں ہے بلکہ ایسے جمالیاتی رنگ میں رچا ہوا ہے، جس کا تعلق محض احساس حسن سے ہے جو معنوی کیفیات و جزئیات سے پر ہے، جس کے لیے ماہر نفسیات کا ہونا ضروری ہے جو میر ناصر علی بلا شبہ تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے اپنی ان تحریروں میں یہ رنگ حاوی نہیں ہونے دیا۔ کیوں کہ ان کا سارا دھیان اپنی نثر کو ترقی پہنچانے کی طرف تھا۔ اس لیے انھوں نے بوقلموں تحریروں کی طرف خوب توجہ دی۔ ادب لطیف کی نازک خیالیاں اور پاکیزہ بیانی کسی اور کو نصیب نہ ہوئی، یہ خوبی میر ناصر علی کی ملکیت تھی اور انھیں کے ساتھ ختم ہوگئی۔ میر ناصر علی نے نثر میں ایک ایسی طرز کو رواج دیا جو ان سے پہلے نظر نہیں آتی ہے۔ انھوں نے وارفتہ نگاری، شوخی بیان، لطیف جملوں کے ذریعے خشک مضامین کو بھی دل نشیں بنا دیا اور مستزاد یہ کہ ان کا ذوق شعری اعلیٰ ہے۔ یہ ان کے اسلوب نگارش کی وہ خصوصیات ہیں جو انھیں متقدمین اور متاخرین کے بیچ کی صف میں کھڑا کرتی نظر آتی ہے۔ میر ناصر لکھتے ہیں:

''... اگر زبان کے نمونے ہوں تو ٹکسالی جس سے میری مراد کلاسکی یعنی اساتذہ کی زبان ہے۔ مجھے اس بات کی فکر رہتی ہے کہ خیال نیا ہو اور لباس اپنا جس کے لیے میں نے ملی جلی انشا پسند کی اور اتفاق سے ایک خاص طرز نکل آئی۔''5

میر ناصر علی نے ایک ایسی طرز کو فروغ دیا جو (Original thinking) پر مبنی ہے۔ انھوں نے معمولی اور غیر معمولی موضوعات پر طبع آزمائی کی جو بڑی شیریں، بے ساختہ اور بے تکلف ہے جس میں ظرافت کا رنگ بھی خاصا نمایاں ہے۔ نیز میر ناصر علی ایک انشائیہ نگار کی طرح ماہر نفسیات بھی ہیں اور حقائق کا بیان شاعرانہ فکر و تخیل اور ادیبانہ لب و لہجے میں کرتے ہیں۔ اس لیے سننے والا ان سے جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ 'مضمون پریشان' سے ایک اقتباس پیش ہے۔ یہ انشائیہ لفظ 'انتظار' پر مبنی ہے اس انشائیہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ انتظار میں کتنی عجیب قسم کی کیفیت پوشیدہ ہوتی ہے:

''کسی کے آنے کا انتظار عبادت الٰہی سے کم نہیں کہ جس طرح عبادت کا نتیجہ عاقبت میں ملنے کی امید ہے (گو کسی نے عاقبت آنکھ سے دیکھی نہیں مگر اس کے آنے کا اور میاں سے ملنے کا بڑا اسہارا ہے) اسی طرح یار آئے نہ آئے لیکن انتظار میں جی ایسا بہلتا ہے کہ کسی مشغلے میں یہ لطف نہیں آتا۔ بلکہ وعدہ پورا ہونے میں بھی یہ بات میسّر نہیں۔ ماں کو بازار سے بچے کے آنے کا انتظار کہ دیر ہوگئی تو دو دفعہ دروازے کے کواڑوں سے جھانک آئی۔ دلہن کا چوتھی کے بعد میکے میں آنے کا انتظار کہ چھوٹے بھائی صبح سے لینے پہنچ گئے۔ نئی نئی شادی میں میاں کے آنے کا انتظار کہ کچہری کا وقت ختم ہونے کا وقت ہو گیا تو نوکر جا رہے ہیں کہ دیر کیوں لگائی... مسافروں کا سفر سے پلٹنے کا انتظار۔ مردانِ جنگ کا لڑائی سے واپس ہونے کا انتظار، کشتگان ستم کو روز جزا کا انتظار۔ ان میں سے ایک کا ذکر وعدۂ فردا سے زیادہ طویل سمجھیے لیکن دنیا کے سارے انتظاروں میں کسی حسین کو کسی کے آنے کا انتظار، قیامت کا سامنا اور غضب یہ کہ جس قدر پارسائی کا پاس ہے۔ اسی قدر اضطراب زیادہ ہے۔ وفور اضطراب اور اندیشۂ رسوائی دونوں کا جمع ہونا ہنگامۂ محشر سے کم نہیں۔''6

ایک کامیاب انشائیہ نگار کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کے کئی روپ دکھائے اور اس کی اہمیت سے روشناس بھی کروائے۔ میر ناصر علی نے ایک سچے فن کار کی طرح انشائیہ کی تمام اکائیوں کو یکجا کر دیا ہے۔ وہ انشائیہ بعنوان 'مضمون پریشان' رسالہ 'صلائے عام' میں شمارہ نمبر 2 دسمبر (1927) میں لکھتے ہیں:

''اخباروں کا دستور ہے کہ اکثر اخیر سال کا مضمون لکھتے ہیں سال کے آخر میں جانے والے سال کا ذکر کرتے ہیں۔ صلائے عام نے اس کا عمداً ذکر چھوڑ دیا کہ نزع کے وقت جب بیمار دم توڑ رہا ہو بہت باتیں کرنا مناسب نہیں۔ نعش کے سامنے زور سے نہیں بولتے۔ نہ کہ اخباروں میں اس کا شور مچایا جائے، جس بیمار کو صبح پکڑنے کی امید نہ ہو اس کو شور مچا کر بے چین نہ کرنا چاہیے، اس کو اور نہیں تو پچھلے پہر آرام سے پڑے رہنے دیجیے۔

سنہ 1927 نے پورے بارہ مہینے 365 دن اور اتنی ہی راتوں میں ہمارا ساتھ دیا۔ ہمارے رنج و راحت میں ہر وقت شریک رہا، ایسے رفیق کا ساتھ چھوٹنا گو اچھا خاصا ہنگامہ ہے مگر لاچاری ہے کہ کیا کیا جائے؟ لاچاری میں خامشی مناسب ہے... اور یہی اکثر کارگر ہو جاتی ہے۔ یار کے ظلم چپکے برداشت کرنے میں لطف ہے۔ آپ کتنا ہی بکے جائیں وہاں سب کا جواب خاموشی سمجھیے حسینوں کا اقرار زبان سے نہیں خاموشی سے ہوتا ہے، کہ ''خاموشی نیم رضا'' مشہور ہے۔''7

اس انشائیے میں انشائیہ نگار جانے والے سال کا ذکر بڑے والہانہ طریقے سے کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزرا ہوا سال کوئی آدم زاد ہے اور اس دنیا سے چل بسنے والا یعنی اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہو، دراصل انشائیہ نگار زندگی کے تجربے سے گزرتا ہے اور اسے اپنے خون کی گردش میں محسوس کرتا ہے۔

بہر حال رسالہ 'صلائے عام' میر ناصر علی کا اردو زبان کے تئیں عقیدت و محبت کا اظہار ہے جس کا ذکر انھوں نے اپنی تحریروں میں بار بار کیا ہے۔ انھوں نے باقاعدگی کے ساتھ انشائیے تحریر کیے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ میر ناصر علی ایک بہترین انشائیہ نگار ہیں اور ان کے انشائیوں سے اردو انشائیے میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

حواشی:

1. میری زبان اور میرا بیان (انتخاب مضامین خان بہادر میر ناصر علی دہلوی) ڈاکٹر عبدالستار، ص 84
2. مقامات ناصری، سید انصار ناصری، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1964، ص 380-81
3. رسالہ، صلائے عام، میر ناصر علی خاں، دسمبر، 1928 (مضمون پریشان) ص 7
4. مقامات ناصری سید انصار ناصری، انشائیہ۔ از گہوارہ تا گور، ص 184
5. ایضاً، ص 42
6. ایضاً، انشائیہ، کسی کے آنے کا انتظار، ص 530
7. ایضاً، ص 8

Nausheen Hasan
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia,
New Delhi - 110025

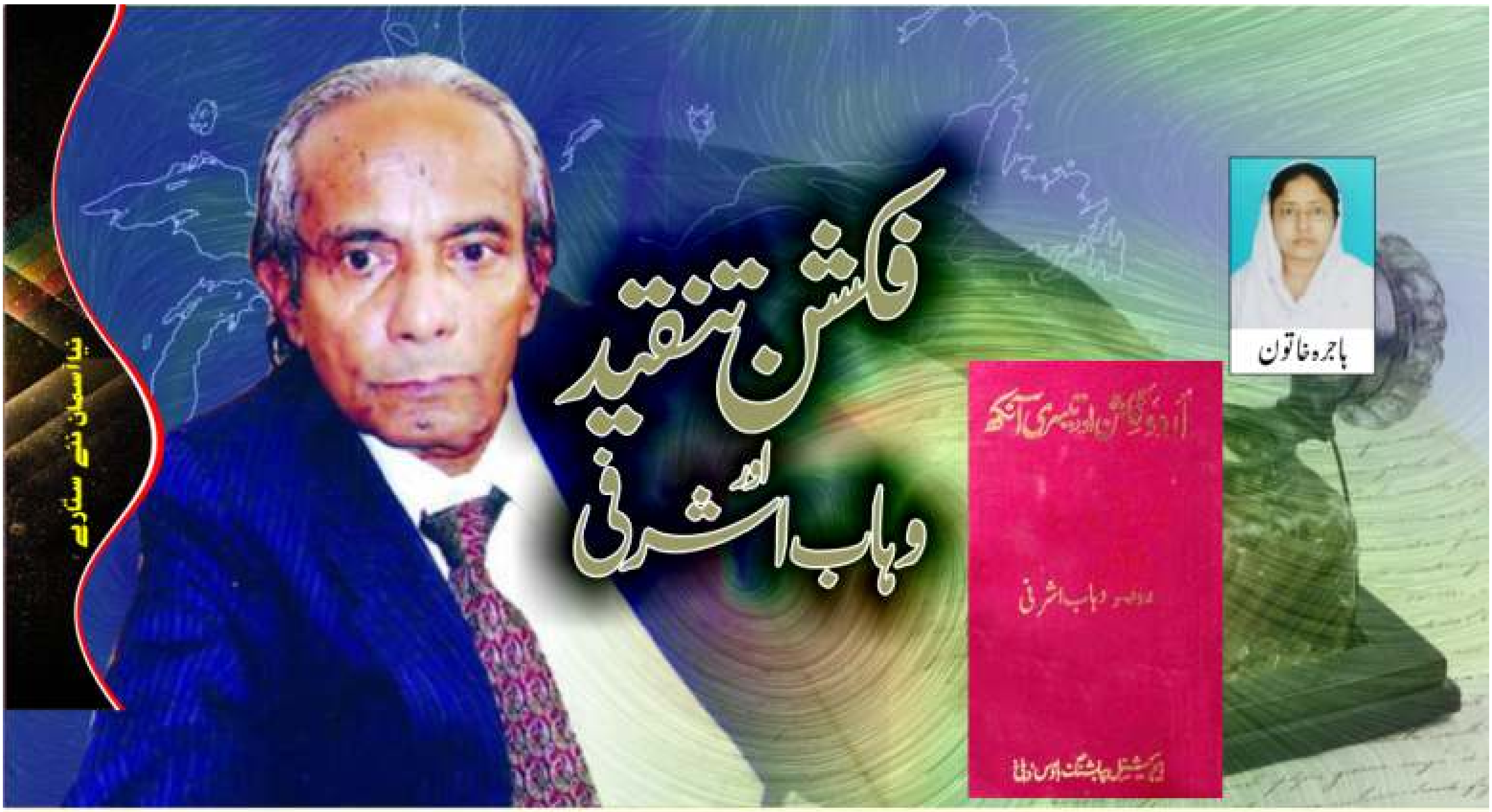

فکشن تنقید اور وہاب اشرفی

ہاجرہ خاتون

فکشن کی تنقید پر نہ صرف اردو میں بلکہ عالمی ادب میں بھی کم ہی توجہ کی گئی ہے اور اُس میں 'ناولوں' کے مطالعے سے ناقدین کی اکثریت دامن بچاتی رہی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید بہ قول عزیز احمد یہ ہے کہ:

''ناول وقت کے پیمانہ سے واقعات کو ناپتا ہے ...ناول زندگی کی طرف ایک سطح خارجی کی نقش بندی کرتا ہے''۔ (عزیز احمد: ترقی پسند ادب، ص 170)

وہاب اشرفی صاحب کا شمار فکشن کے اہم ناقدوں میں ہوتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ 'معنی کی تلاش' 1978 میں شائع ضرور ہوا لیکن 1960 کے بعد شائع ہونے والے مضامین کے اس انتخاب میں ناول پر کوئی مضمون شامل نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہاب اشرفی کا زیادہ زوران بین الاقوامی اور قومی سطح پر استعمال ہونے والے فنی اور ادبی نکات واصطلاحات کی تشریح حقیقی پر صرف ہو رہا تھا یا ان ادبی گمراہیوں کا پردہ فاش کرنے میں جنھیں 'جدیدیت' کے لیے لازمی قرار دیا جارہا تھا۔ ادبی اصناف میں 'ناول' ایک ایسی صنف تھی جس پر اس نام نہاد جدیدیت کے اثرات تقریباً نظر نہیں آتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے اہم ناول نگاروں نے تنقید کو دوسرے درجے کا فن کہا ہے۔ 91-1990 میں 'ذہن جدید' نے اردو فکشن اور تنقید کے عنوان سے ایک مباحثے کا آغاز کیا تھا۔ اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے کہا تھا ''فکشن پر تنقید سوجھ بوجھ کے ساتھ کم ہی کی جاتی ہے''۔

دراصل وہاب اشرفی تنقید کو علمی وقار کے حصول کا وسیلہ نہیں مانتے بلکہ آج کے انسان کی ان ذہنی وفکری کیفیتوں کی معنویت کے متلاشی رہے ہیں جن کے نازک سے نازک لمس کو ہمارا فنکار اپنے فن پاروں میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے مشہور زمانہ ناول 'آگ کا دریا' کے لافانی کردار 'گوتم نیلمبر' کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے وہاب اشرفی کے مضمون کا یہ پہلا جملہ دیکھیے:

'میں ہوں گوتم نیلمبر' تاریخ کے اوراق کا جیتا جاگتا نام، شاہنشاہی میری میراث لیکن منزل میری، نورانی روحانی۔ میں نے زندگی میں تیاگ اور تپسیہ کو راہ دی ہے۔ روحانی سفر میں مادی آسائش کی گرد بھی اپنے دامن پر نہیں پڑنے دی، خوبصورت، دلکش اور بے مثال گوشت پوست دعوت عیش دیتے رہے اور میں دامن کشاں گزر گیا، تاج زریں پکارتا رہا لیکن میں نے مڑ کے بھی دیکھنا مناسب نہ جانا۔ مجھے تو اذیت تھی، بیماریوں کی حالت دیکھ کر اپاہجوں کی بے بسی سے — میرے لیے پریشان کن تھی، بہت، تو میں نے یشودھرا کو بھی چھوڑا اور راہل کو بھی، مجھے تلاش تھی سکون کی، علم کی، اذیت کے اسباب کی، روحانی ترفع کی، میں جنگل اور بیابان میں بھاگتا رہا۔ پنڈتوں کے چرنوں میں وقت گزارے، تیرتھ استھانوں کی زیارت کی۔ لیکن سکوں؟ سکون کہاں، تو میں نے گیا میں ایک پیپل کے نیچے پڑاؤ کیا۔ بھوک اور وقت کے احساس سے پرے ہو گیا، تب مجھے گیان حاصل ہوا، بہت سے روحانی اسرار مجھ پر روشن ہو گئے — تو یہ میری کہانی ہے یا میری کہانی کا پس منظر ہے، اسی لیے سفر تو گیان کے بعد شروع ہوا ہے''۔

(وہاب اشرفی: گوتم نیلمبر، مشمولہ شعور نمبر 1، ص 515)

'آگ کا دریا' کے حوالے سے گوتم نیلمبر کی شخصیت کی شناخت پیش کرتے ہوئے وہ سب سے پہلے 'آواگون' کے فلسفے کی وضاحت کرتے ہوئے گوتم نیلمبر کو اس کا ترجمان تسلیم کرنے سے متفق نہیں ہو پاتے۔ 'آواگون' یا عمل تناسخ کے عقیدے کی تشریح کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ اس کا کلیہ یہ ہے کہ ''ایک جنم کے بعد دوسرے جنم میں آدمی آدمی باقی نہیں رہتا۔ دراصل اس عقیدہ کو ماننے والوں کے نزدیک انسان موجودہ جنم میں جس طرح کے عمل کرتا ہے دوسرے جنم میں اسے اسی کے مطابق 'جون' (جسم) ملتا ہے۔ زیادہ تر برے اعمال کی وجہ سے وہ جانوروں کے جون میں دوسرے جنم میں ان اعمال کو بھگتتا ہے، اس لیے کلیہ یا نظریہ کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ وہاب صاحب بھی اس کلیے کو تسلیم کرتے ہیں۔

دوسرے مرحلے میں وہ وجودیوں کے اس نظریہ سے بحث کرتے ہیں کہ گوتم نیلمبر وجودیت کا علمبردار ہے، کیونکہ اسے سکون نہیں ہے، اس کی زندگی ایک آگ کا دریا ہے، اس کی بے قراری، بے چینی، زندگی کے لامتناہی کرب سے اسے جوڑے ہوئے ہے، اس کا اپنا وجود اسے اس تلاش مسلسل کا اسیر بنائے ہوئے ہے۔ ایلیٹ کی نظم کے مطابق ''دریا کی علامت واضح کر دیتی ہے کہ ایک طاقتور مٹیالا دیوتا ہے، اس کی تند مزاجی، غصہ اور غیظ

وغضب تباہ کن ہیں، اس پس منظر میں اس کی ذات کے حوالے سے انسانی کرب خصوصاً مادی اور روحانی خلیج کے مابین ابھرتا چلا جاتا ہے۔

ایک اور نقاد کے حوالے سے انھوں نے لکھا کہ

''اس کے حوالے سے دنوں اور گھنٹوں کا گھسا ہوا تسلسل پیش کیا گیا ہے جو کرب کے لمحوں سے مرتب ہوتا ہے، دریا وقت کی علامت ہے جو تباہ کن بھی ہے اور خود قائم رہتا ہے، یہ دریا آگ کا دریا ہے اور اس لیے ہے کہ وقت سے مفر نہیں ہے اور وقت کا ہر لمحہ کرب کا لمحہ ہے۔ اس جدید ناقد کے حوالے سے وہ مزید لکھتے ہیں'' یہ کرب عارضی ہو یا ابدی چونکہ مسلسل ہے اور اسی سے انسان ہر لمحہ دوچار ہے اور چونکہ اسی پس منظر میں ناول مرتب کیا گیا ہے اسی لیے گوتم کے ساتھ ناول کی پوری ساخت وجودی بن گئی ہے۔''

وہاب اشرفی نے گوتم کے اس مکالمے سے کہ ''انسان کے افعال، اس کی ضرورتیں یا حادثے اس کی فطرت کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں''۔ وجودی نقاد نے یہ مفہوم نکالا کہ انسان اپنی جبلت کا اسیر ہے۔ اور اس بات سے کہ ''آنند۔ مایہ سب سے بڑی مسرت ہے جو وہ حاصل کرسکتا ہے۔'' یہ مطلب نکالا کہ، اصل چیز شانتی ہے اور جب یہ نہیں ملتی تو پھر کرب ازلی کرب انسان کا مقدر بن جاتا ہے۔ اسی طرح دکھ، پراکرتی، جیون کی حد بندیوں سے اس کے خیالات کو ایسے طور پر توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ وہاب صاحب نے ان افکار وخیالات پر کوئی تفصیلی بحث کرنے سے گریز کیا ہے، لیکن ان کا محض یہ جملہ کہ:

''مجھے ایسے نقادوں سے صرف ایک شکایت ہے کہ جہاں 'گوتم' نے پھول چنے ہیں، انبساط کے لمحوں سے گزرا ہے، سرشاری کی کیفیتوں سے دوچار ہوا ہے انھیں کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔ میرا (ناول) کا موضوع وقت ہے یا وقت کی نفی ہے یا آواگون ہے؟

یہ ضمنی سوالات ہیں وہ لوگ جو میری (گوتم کی) پہچان کے پیچھے ہیں اسے ایک دور کے پس منظر میں دیکھیں، پھر دوسرے دور کے اسے تاریخ کے حوالے سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ گوتم خود آگ بھی ہے اور دریا بھی، اس کے خمیر سے یہ چیزیں الگ نہ کی جائیں۔''

استاذی عبدالقیوم ابدالی نے 'آگ کا دریا' پر گفتگو کرتے ہوئے جو کچھ ہمیں بتایا تھا اسے مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ ابدالی صاحب کے مطابق:

''آگ کا دریا لکھتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے تاریخ کے تبدیلیاتی تصور کا استعمال کیا ہے جسے تاریخ کا مارکسی تصور بھی کہتے ہیں اور پنڈت نہرو نے اپنی کتاب 'تاریخ ہندوستان' میں اسی تصور کا استعمال کیا تھا۔ ناول کا آغاز ابوالمنصور کمال الدین کی آمد کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی مسلمان حکمرانوں کی دہلی آمد کے بعد کے واقعات کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔ تاریخ کا تبدیلیاتی تصور یہ ہے کہ جب دو الگ الگ طبقات کے لوگ ایک ساتھ ملنے جلنے لگتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی گزارنے لگتے ہیں تو دونوں طبقات میں ان کے رہن سہن میں، ان کے کھانے پینے کے طریقوں میں، ان کے لباس اور پہناوے میں، ان کے عقائد اور رسومات میں بھی تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر طبقہ جسے آسانی کے لیے فرقہ بھی کہہ لیں میں دو الگ الگ ذہنیت کارفرما ہوتی ہے۔ ایک طرف مذہبی رسوم ورواج پر سختی سے عمل پیرا لوگ اور دوسری طرف اہل مذہب کے نزدیک راندۂ درگاہ لوگ۔ اس دوسرے گروہ کے لوگ زیادہ روادار ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے زیادہ قریب آتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے اور انھیں کی کوششوں سے ایک مشترکہ تہذیب پنپتی چلی جاتی ہے۔' آگ کا دریا 'دراصل اسی مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی تاریخ ہے جس میں مسلم عہد حکومت سے تقسیم ملک اور آزاد ہند و پاک تک کی زمانی ومکانی تبدیلیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی بقول وہاب اشرفی یہ ہے کہ:

''ہم حقیقتاً جامد وساکت باور کرتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ زمانی تبدیلیاں غور وفکر کی نئی راہیں ہموار کرتی ہیں۔ دراصل کسی ایک اسکول سے نام نہاد طور پر جڑے ہوئے نقادوں کے الگ الگ نظریوں سے ہم آگاہ نہیں ہیں۔ ایک نقاد دوسرے سے کس طرح مختلف ہے اس کی واقفیت ہمیں نہیں ہے۔ ہم نظریات کی باریکیوں میں اترنا نہیں چاہتے اور ایک ہی سانس میں مختلف الخیال نقادوں کے اقوال نقل کر کے علمی وقار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں مختلف نقادوں پر الگ الگ کتابیں یا مضامین لکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم تنقیدی تصورات کا کاک ٹیل تیار کرتے ہیں اور ہمیں اس کی خبر نہیں ہوتی اور یہ منزل یقینی جہل کی ہے۔ ایک اور نقصان بھی ہے اور وہ زیادہ تشویش ناک ہے۔ جب ہم کسی مخصوص تصور کو دوسرے تصور سے الگ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو یک سرے ہوجاتے ہیں۔ ایک ہی راگ الاپتے ہیں۔ لہٰذا تنوع پیدا نہیں کرسکتے۔ نیو کریٹی سزم کے تحت آنے والے مغربی نقادوں کے نت نئے رنگ پر ہماری نظر نہیں ہوتی تو تھوڑے ہی عرصے میں لوگ ہم سے اوب جاتے ہیں۔''

وہاب اشرفی صاحب سے پوری طرح متفق ہونے کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں 'ناول' کے مطالعے سے پہلو تہی کی جاتی رہی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ تو اس کی طوالت رہی ہو، پھر اس کے موضوعات اور تکنیک میں بھی بہت کم فرق آیا۔ یہ واحد صنفِ ادب ہے جس نے معاشرہ اور معاشرت کے ہم عصر انسان کو اپنا موضوع بنائے رکھا۔

شاد عظیم آبادی اور اختر اورینوی کے ناولوں کے علاوہ مابعد جدیدیت کے حوالے سے وہاب صاحب نے جن ناولوں پر گفتگو کی ہے ان کا انداز تفہیمی وتجزیاتی رہا ہے۔ سید محمد اشرف کے ناولٹ 'نمبردار کا نیلا' سے متعلق انھوں نے لکھا:

''مختلف قسم کے استحصال پر مبنی یہ ناول ہماری زندگی کے نشیب وفراز کی کہانی تو سناتا ہی ہے لیکن اس میں شر پسند عناصر کی کارکردگی پر علامتی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔'' (ص 282)

سید محمد اشرف، اتر پردیش کے رہنے والے ہیں، جہاں کے جنگلوں میں نیل گائیں کثرت سے پائی جاتی ہیں اور جاگیرداروں، نمبرداروں اور زمین داروں اور ان کی اولادوں کی حکومت وہاں اب تک قائم ہے۔ اس ناول میں بھی ایک زمین دار ہے ٹھاکر اودل سنگھ جن کی یہ تصویر خود ناول نگار نے پیش کی ہے۔

''ٹھاکر اودل سنگھ اپنے پرجوں سے ان معنوں میں زیادہ با اثر ہیں کہ اب انھوں نے سرمایہ داروں کی صف میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ اچھا خاصا 'کالا دھن' اب ان کے خفیہ تہہ خانوں میں محفوظ رہنے لگا ہے۔ پریم چند کے ٹھاکر کی طرح اپنی عزت اور ساکھ بچانے کے لیے انھیں نہ تو جاگیریں بیچنی پڑتی ہیں، نہ بینکوں سے قرض لینا پڑتا ہے۔ البتہ انکم ٹیکس افسران کبھی کبھی ان کو پریشان ضرور کرتے ہیں لیکن صدیوں کے تجربے اور پرجوں کی روایت کی پاسداری ان کے کام آجاتی ہے۔''

اچانک ایک دن گڑھی میں چوری ہو جاتی ہے اور یہ بھی شاید اتفاق تھا کہ ایک نیل گائے اپنے بچوں کے ساتھ ان کے احاطے میں آگئی۔ گائے اور اس کا ایک بچہ مارا جاتا ہے۔ بس یہ بچہ بچ جاتا ہے جو کسی طرح ان کے لوگوں کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ وہ اتنا جری اور قوی تھا کہ ٹھاکر نے اسے پالنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے پالنے سے پہلے ٹھاکر صاحب نے اس کے ہر پہلو پر غور کیا تھا۔ اس کا مذہبی پہلو یہ ہے کہ ''گئو ماتا ہوتی ہے'' اور پشو سیوا دھرم اور دین کا کام ہوتا ہے اور وہ چاہے کچھ بھی کرلے اس کا

بدھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا دفاعی پہلو یہ ہے کہ وہ بڑا ہو کر اجنبیوں کو اپنے سنگوں سے لہو لہان کر کے انھیں اپنے کھروں سے کچل سکتا ہے اور پھر اسے کھلانے پلانے کا کوئی خاص خرچ نہیں ہوگا۔ البتہ شروع میں ذرا دقتیں پیش آئیں کیونکہ اس وقت تک اس کا وحشی بن باقی تھا۔ وہ بندھنے پر راضی نہ تھا۔ پہلے تو بھوکا رکھا گیا پھر اسے پیٹ بھر کر ضرورت سے زیادہ غذا دے کر خوش خور بنا دیا گیا، اس طرح اس کی وحشت کم ہوئی۔

ناول نگار نے اس جانور کے حوالے سے موجودہ سماج کے کئی ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جس سے اس کا قاری واقف تو ہے لیکن ناول نگار سے اس کی شہادت پا کر اسے ان حقیقتوں پر یقینی پختہ ہو جاتا ہے۔ سرپنچ ادھیکاری لال کو اودل سنگھ نے سرپنچ بنوایا تھا۔ گویا کہ عوامی نمائندوں کا انتخاب چاہے بیلٹ سے ہو یا بولٹ سے انتخاب کرنے کا اختیار زمین داروں اور سرمایہ داروں کے ہی لیے محفوظ رہتا ہے، مذہب کے ٹھیکیدار بھی اس کے اشاروں پر ہی فیصلے کرتے ہیں۔

گویا اودل سنگھ نیلا سے وہی خدمات انجام دلوا رہا تھا جو وہ جھمن سے نہیں لے رہا تھا۔ ان معنوں میں اس ناول کے مطالعہ سے اس نتیجہ تک پہنچنے میں وہاب اشرفی تو حق بجانب ہیں کہ:

"اس اقتباس میں سرپنچ، پنچ، نمبردار، اگہن کا آسمان، پنچایت، اپشو کی سیوا، دھرم، گئو بدھ اور شراب وغیرہ الفاظ ... ایک ثقافت کی دین ہیں، جس سے ایک مخصوص سوسائٹی کے مزاج، میلان، طریقہ کار اور تنظیم پر بھی نگاہ ڈالی جاسکتی ہے۔ مختصر یہ کہ نمبردار نے جو نیلا پال رکھا تھا اس نے پورے گاؤں کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ جو مالک کے سہارے استحصال کا ذریعہ ہے چونکہ گائے ہے اس لیے سرپنچ ادھیکاری لال بلکہ پوری پنچایت کشمکش و پنچ میں ہے کہ اسے گولی مارنے کا فیصلہ کیسے سنائے؟ وہ اسے 'گئو بدھ' سے تعبیر کرتی ہے۔ یہ تصور مخصوص سماج کا آئینہ دار ہے۔"

لیکن ناول نگار نے ناول کو اس منزل پر 'انجام' تک پہنچایا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"آہستہ آہستہ جو بولتے بھی ہوتے وہ بھی کھلم کھلا اس بات کا اعتراف نہیں کرتے، مبادا انھیں کی کوئی غلطی سامنے آجائے... صورت حال کو اس حد تک پہنچانے کے لیے کئی واقعات عالم ظہور میں پیش آئے... ان میں کچھ دیہات میں وقوع پذیر ہوئے اور کچھ واقعات کے لیے قدرت نے قصے کا انتخاب کیا۔"

ایک واقعہ انھیں واقعات میں نتھو کمہار کی بیٹی کا ہے۔ ٹھاکر کے بیٹے 'اونکار' نے نہ صرف اُس کا اغوا کر اس کی آبرو ریزی کی بلکہ اُس کے ہونے والے شوہر کو اس جرم کی پاداش میں پہلے جیل کروائی پھر اس کی چھوٹی بہن سے اُس کو بیاہ دیا۔ لیکن یہ حالات کا ایک رخ تھا۔ اس کا دوسرا رخ یہ تھا کہ اب اس گاؤں میں ایسے نوجوانوں کی پوری نسل جوان ہو چکی تھی جو ٹھاکر کے تمام تر حربوں کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ 'بزکی' نے ٹھاکر کی سب سے طاقتور ڈھال کو ہی نشانہ بنایا۔ اس نے نیلا کو کھوئے کے پیڑے اور خالص سرسوں کے تیل کے ساتھ چھپکلی کے مہینے کے کپڑوں کی بو کے نشہ کی ایسی لت لگائی کہ شکاریوں کے نرغے سے نکل کر نیلا سیدھے گڑھی میں آگیا اور بڑی بہو کے کمرے پر ٹکریں مارنے لگا۔ بڑے بھیا اور بچے بھی کمرے میں تھے۔ اس سے پہلے اس نے چھپکلی کے مہینے کے کپڑوں کی بو سونگھی تھی اور دو پیروں پر کھڑے ہو کر دیوانوں کی طرح زمین پر لوٹیں لگانے لگا تھا جیسے کسی انجان دشمن سے لڑنے لگا ہو۔ پھر اس نے چھپکلی کے جھونپڑے کے ساتھ اس کے جسم کو بے دردی سے کھوند کر رکھ دیا تھا۔ بڑی بہو اپنے بچوں کو لے کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکلی، پرتاپ اور بابو جی کی لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر بچوں کو مضبوطی سے پکڑا اور آسمان کی طرف دیکھا۔

مصنف نے اپنی کہانی ختم کرتے ہوئے لکھا ہے؟

"لیکن کسی کو بھی سوچنے کی سکت نہ تھی کی نیلا گاؤں میں ہے یا گاؤں کے پاس کسی کھیت میں چھپا ہوا ہے یا گاؤں کی سرحد سے دور قصبے تک پہنچ گیا ہے یا قصبے سے بھی آگے خون کے چھینٹے اڑاتا شہر کی طرف بھاگ رہا ہے۔ یا اس سے بھی آگے....؟"

وہاب اشرفی کے بیان کردہ الفاظ یقیناً ہماری ثقافت کا ایک رخ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں لیکن ناول کا یہ انجام بھی تو ہماری ثقافت کا حصہ ہیں! ممکن ہے کہ یہ سب کچھ ایک خواب ہو۔ ایک ایسے رومان پرور صبح کی بشارت ہو، ممکن ہے یہ ہماری ثقافت کی ایسی تصویر ہوا جس میں نمبرداروں اور سرمایہ داروں نے اتنا زہر بھر دیا کہ اب اس کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ اسے ہم سماجی حقیقت نگاری کی عصری تصویر کشی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں زندگی اور اس کے مختلف گروہوں کے درمیان کی کشاکش اور حکمران اور محکوم طبقے کی جدوجہد کے ہزار اندر ہزار ابعاد منہ کھولے کھڑے ہیں۔ وہاب اشرفی صاحب کو اس بات کا احساس ہے کہ پوری دنیا میں خصوصاً فکشن میں ایک احتجاجی لے بہت ہی شدت سے محسوس کی جانے لگی ہے۔ تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں حالات ہی نہیں بدلے ہیں سوچنے سمجھنے کے زاویے، اخلاقیات کے پیمانے رشتوں کی تہہ داریاں سب بدل کر رہ گئی ہیں۔ قاضی عبدالستار کا تعلق بھی اس جاگیردارانہ تہذیب سے ہے۔ قاضی صاحب کی ناول نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اشرفی صاحب نے لکھا ہے۔

قاضی عبدالستار ایک ایسے ناول نگار ہیں جن کے یہاں زمین دارانہ اور جاگیردارانہ نظام اور اس سے متعلق کتنی ہی صورتیں ابھرتی ہیں۔ یہ تمام تر کیفیتیں سوسائٹی کی دین ہیں۔ قاضی اپنے متعلقہ عہد کے تمام تیور کو سمیٹنے میں ایسے قادر ہیں کہ احساس ہوتا ہے کہ ایک خاص زمانہ ان کے ناولوں میں سانس لے رہا ہے۔ ثقافتی کیف کے متعدد پہلو ان کے ناول کے خد و خال ہیں۔ اُن کے ناولوں کے کسی حصے پر نگاہ جائے اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے سماج کے رگ و پے میں سمائے ہوئے ہیں اور ایسی تصویریں پیش کر رہے ہیں جیسے تمام حالات ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔

مجھے ان ناولوں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ اشرفی صاحب کے اس جملہ کو کہ "وہ اپنے سماج کے رگ و پے میں سمائے ہوئے ہیں" کو اس طرح پڑھا جائے تو شاید بات زیادہ صحیح ہوتی کہ ان کا سماج ان کے حواس پر سوار ہے۔" وہ اب تک ان پرانی یادوں کے حصار سے باہر نہیں نکل پائے ہیں۔ یقیناً قاضی صاحب نے عصمت اور قرۃ العین حیدر کے بعد اس سوسائٹی پر سب سے زیادہ لکھا ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے اس سماج کے کھنڈروں میں چلتے پھرتے سایوں کو چلتے پھرتے سانسیں لیتے ہوئے مصور کیا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ 'معصومہ' اور 'میرے بھی صنم خانے' میں اس طبقے کی جتنی جاندار اور دلکش تصویریں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں وہ قاضی صاحب کے یہاں نہیں مل پاتیں۔ عصمت کی کہانی زوال حیدرآباد کے بعد اُس کے باپ کے دو بڑے بھائیوں کے ساتھ پاکستان چلے جانے سے شروع ہوتی ہے۔ اب بیگم صاحب، دو بیٹیاں اور چھوٹے بیٹے جو یہاں رہ گئے وہ کچھ عرصے تک پرانا، خاندانی سامان بیچ بیچ کر گزارا کرتے ہیں اور پھر بمبئی منتقل ہو جاتی ہیں۔ بچا کھچا سامان بیچنے بیگم حیدرآباد آگئیں تو واپسی پر معصومہ کے رنگ ڈھنگ ہی بدلے ہوئے دیکھے۔ آخر کار بیگم کی رضامندی سے معصومہ سیٹھ احمد بھائی کے ساتھ رہنے لگتی ہے اور پھر معصومہ، نیلوفر، بن جاتی ہے۔ سیٹھ سے نیلوفر کا سلوک اور اس کی اداؤں اور مکالموں کی ادائیگی 'عصمت' کا خصوصی میدان ہے۔

مجنوں جیسے سنجیدہ ناقد نے یوں ہی نہیں کہا تھا کہ ''ایک خاص جوار اور ایک خاص طبقہ کی روز مرہ زبان پر الہامی قدرت انھیں حاصل ہے۔ ایسی بے تکان زبان مشکل ہی سے کسی کو نصیب ہو سکتی ہے۔ وہ الفاظ اور فقروں کے گویا طرارے بھرتی ہیں''۔

(بہ حوالہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری: اردو نثر کا فنی ارتقا، ص 117)

قرۃ العین کا میرے بھی صنم خانے میں اودھ کے تعلقہ داروں کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اہل لکھنؤ بلا لحاظ مذہب اپنے کو دوسرے لوگوں سے زیادہ مہذب سمجھتے تھے۔ وہاں کے شرفا انتہائی تعلیم یافتہ، ذہین اور مہذب سمجھے جاتے تھے۔ 'فسانۂ عجائب' کے بارے میں کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ رجب علی بیگ کی آنکھیں ہی اس کارنامے کو انجام دے سکتی تھیں۔ اسی طرح لکھنؤ کے اس تعلقہ دارانہ افراد و خاندان کی زندگی کے تمام نشیب فراز کو قرۃ العین ہی پیش کر سکتی تھیں جن کا ذہن تو مغربی لیکن دل مشرقی تھا۔ 'آگ کا دریا' جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کا ہیرو ابوالمنصور کمال الدین اپنے اندر عرب کے سوز دروں اور عجم کے حسن طبیعت کا امتزاج رکھتا ہے کیونکہ اس کی ماں ایرانی اور باپ عرب تھے۔

اقبال مجید کا ناول 'نمک' بھی اسی معاشرہ کو موضوع بناتا ہے۔ وہاب اشرفی کے مطابق:

''نمک ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جو کبھی ہماری دنیا رہی تھی، اب بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اس کی تصویریں ہمارے سامنے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت نئے کردار جنم لیتے ہیں، لیکن یادیں باقی رہ جاتی ہیں، آثار باقی رہ جاتے ہیں، نشانات باقی رہ جاتے ہیں، نشانات جو ذہن و دماغ پر مرتسم رہتے ہیں اور وہ نسلاً بعد نسل اجتماعی لاشعور کے تحت منتقل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ نمک میں ہر کردار اپنے معاشرے میں جیتا ہے اور اس سے الگ ہونا چاہتا ہے تو اسے حاصل کشمکش سے دو چار ہوتا ہے..... میرا احساس ہے کہ زہرا خانم کی بیس کمروں والی کوٹھی، دارالاستکبار، اپنے Contradictions کے باوجود بہت دنوں تک دل آویز رہی ہے اور اس کے مکیں اپنی اپنی امنگوں کے ساتھ جیتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زہرا خانم آخر تک اپنے ان بہترین کھانوں کو فراموش نہیں کر سکتیں جن سے ان کے کام و دہن لذت آشنا رہے ہیں۔ اس کے یہی معنی ہوئے کہ نئے حالات نے اسے جتنا بھی زبوں بنا رکھا ہے پرانی یادیں اثاثہ بنی رہتی ہیں اور بہت دنوں تک جیتے رہنے کی شاید یہی وجہ ہے۔''

(پروفیسر وہاب اشرفی۔ مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات، ص 290-91)

مزید وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

''کردار اپنے اپنے نمک میں زندہ ہے۔ اگر اس سے نکلنا چاہے تو نکل بھی نہیں سکتا اور اس کی زندگی سے اس کا اپنا نمک نکل جائے تو پھر وہ ایسی سطح پر آ جاتا ہے جو اس کی اپنی سطح نہیں ہوتی۔

لیکن یہ نمک ہے کیا؟ واضح جواب ہے کہ وہ معاشرہ ہے جس سے یہ کردار رشتہ رکھتے ہیں، ایک آدھ اس سے نکلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو نکل نہیں سکتے۔ گویا ایک طرف نمک ثقافت کی تعبیر ہے تو دوسری طرف کردار کے تخلیق کی محرک بھی۔''

جدید معاشرتی صورت حال کو موضوع بنانے والے ناولوں کو وہاب صاحب نے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ ان ناولوں میں الیاس احمد گدی کے 'فائر ایریا'، پیغام آفاقی کے 'مکان'، جیلانی بانو کا 'بارش سنگ' حسین الحق کے 'بولو مت چپ رہو'، شفق کا 'بادل'، اہم ناول ضرور ہیں لیکن ان کی اہمیت کا اندازہ سرسری طور پر لگایا نہیں جا سکتا۔

پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' کا مرکزی کردار 'نیرا' اپنے کرایہ دار سے اپنا مکان خالی کروانا چاہتی ہے۔ کرایہ دار با اثر، بارسوخ آدمی تھا اور نیرا ایک سیدھی سادی جوان لڑکی۔ افسران، بیوروکریسی سب کرایہ دار کی مدد کر رہے تھے لیکن نیرا کو اس کا احساس بھی نہیں دلانا چاہتے تھے۔ پولس افسران 'نیرا' سے متعلق کہتے ہیں۔

''ہر لڑکی اپنے انداز کی الگ ہوتی ہے اور اپنے کو الگ ہی انداز کی سمجھتی ہے، لیکن مجھے بھی اب دلچسپی ہے کہ میں اس لڑکی کو ایک مخصوص خوبصورتی سے ہنڈل کر کے انچارج اور یہاں کے پورے عملے کو دکھاؤں کہ ہمیں انوکھی صورتِ حال میں کیسے کام کرنا چاہیے، آپ دیکھیے تو رفتہ رفتہ تھانے اور کورٹ بھگاتے بھگاتے اور قدم قدم پر اسمارٹ نس کا موقع دیتے ہوئے ساتھ ہی چابک دستی سے اس کے اوپر دباؤ بڑھاتے بڑھاتے، میں اس کے پرس کے پیسے اور آنکھوں کی جھجک سب چھین لوں گا۔ وہ اس خوش گمانی میں رہے گی کہ وہ بہادری سے ہمارا مقابلہ کر رہی ہے اور اسے پتہ بھی نہ چلے گا کہ وہ وہاں جا رہی ہے اور ان لوگوں سے مدد لے رہی ہے جہاں ہم چاہتے ہیں۔ ہم ایک طرف سے اسے دبائیں گے اور دوسری طرف اسے پیار سے پچکاریں گے اور سہارا دیں گے۔''

اس اقتباس سے ہمیں دو الگ الگ کرداروں سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے۔ پہلا کردار اس پولس افسر کا ہے جو اس موجودہ سسٹم کا ایک عام پرزہ ہے۔ ہماری کرپٹ پولس شاہی کا پروردہ ایک ایسا افسر جس کو اپنے پیش رووں سے یہ مہارت حاصل ہوئی ہے کہ کس مخصوص صورتِ حال میں کسی شکایت کرنے والے کو اس کی شخصیت کی روشنی میں کس چابک دستی سے ہینڈل کیا جا سکے کہ اس کو یہ احساس بھی نہ ہو کہ اسے بے وقوف بنا کر لوٹا جا رہا ہے اور اپنے اس کارنامے سے انچارج اور دیگر افسران پر ان ہی کارکردگی کا رعب بھی ڈالا جا سکے، گویا کہ نہ صرف یہ افسر بلکہ پورا تھانہ اس Game Plan میں 'نیرا' کے خلاف ہے۔

دوسرا کردار 'نیرا' میڈیکل سائنس کی طالبہ ہے۔ اس کا کرایہ دار 'کمار' ایک زمانہ شناس عیار شخص ہے۔ وہ 'نیرا' کو توڑنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کے خلاف افواہیں پھیلاتا ہے۔ محلے والوں کو ورغلا کر اسے بدچلن آوارہ کہہ کر ذلیل کرواتا ہے۔ اسسٹنٹ پولس کمشنر 'نیرا' کی مدد کرنا چاہتا ہے تو دوسرے پولس افسران اور کچھ دوسری لڑکیوں کی مدد سے اس کے خلاف بلیو فلم بنوا کر اسے بلیک میل کروایا جاتا ہے۔ سچ کہا جائے تو یہ پورا نظام بری طرح سڑ گل گیا ہے۔ پولس افسران اور عملے کی اکثریت رشوت کے بل پر زندہ ہے۔ جس نے رشوت دی یا خوش کرنے کے دوسرے راستے اپنائے اس کا کام چٹکیوں میں ہو جاتا ہے، غریب، سیدھے سادے لوگوں کو طرح طرح سے ذلیل کیا جاتا ہے۔ کچھ افسران جو خود کو صاف ستھرا رکھنا چاہتے ہیں انھیں ان کی پسند کی جگہوں پر پوسٹنگ، پروموشن اور قیمتی تحفوں سے نواز کر خاموش کر دیا جاتا اور پھر آہستہ آہستہ وہ بھی اس مکڑ جال میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ 'نیرا' بار بار زک اٹھاتی ہے لیکن ہمت نہیں ہارتی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا ہے اسے تھکا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ تھک ہار کر وہ بیٹھ جائے، اس کا حوصلہ پست ہو جائے، اس لیے وہ بھاگتی رہنا چاہتی ہے۔

'بھاگ نیرا بھاگ' تو اپنی جگہ بدل، چیزیں اپنا رویہ بدل لیں گی، چل یہ ایک سائنسی تجربہ ہے تو اس کا استعمال کر۔ اب کمار کی طرف سے ناکامیوں کی بوچھار مجھے مضبوط سے مضبوط کرتی جائے گی حتیٰ کہ اس کی تباہ کن کوشش میری طرف آ کے توانائی میں تبدیل ہو جائے گی۔''

اس لڑکی نے اس کے اندر سے ہر خوف کو نکال پھینکا ہے، اس لیے اس کی پیہم کوششوں کے سامنے نہ صرف کمار اور کرپٹ افسر شاہی بے کار، بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں بلکہ اس بے حس معاشرے کو شرمندہ کر کے اپنا مکان بھی واپس لے لیا ہے اور یہ پیغام دیا ہے کہ حالات جیسے بھی ناسازگار ہوں، اگر آپ نے ان سے لوہا

لینے کی ٹھان لی تو آپ کو کامیابی ضرور ملے گی۔

وہاب اشرفی صاحب نے عبدالصمد کے ناولوں کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں 'مہاتما' ایک اہم ناول ہے۔ جس معاشرتی صورتِ حال کو مابعد جدیدیت کی شناخت قرار دیا جاتا ہے،اس میں Corruption سب سے اہم کہا جاسکتا ہے۔ اس دور کی نوجوان نسل کبھی مجبوری میں اور کبھی جبر کا شکار ہو کر اس کا شکار بنتی چلی جاتی ہیں اور کوئی راہ فرار انھیں دور دور تک نظر نہیں آتی۔ 'مہاتما' کے فلیپ پر ہی لکھا ہوا ہے:

''یہ ناول موجودہ تعلیمی نظام کی گرتی ہوئی صورتِ حال کا احاطہ کرتا ہے''۔

ہمارے ملک میں ان دنوں تعلیم، سیاست دانوں، اقتدار پرستوں اور تجارتی ذہن رکھنے والوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئی ہے۔ یہ ناول اس دردناک صورت حال کا کوئی حل پیش نہیں کرتا بلکہ اس کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے اور مسئلے کی شدت کا احساس دلا کر ذہنوں میں ایک بڑا سوالیہ نشان پیدا کرتا ہے''۔

اس موجودہ صورتِ حال کا حل ہے کس کے پاس؟ کہ وہ اسے پیش کرے۔ سیاست داں، صاحبانِ اقتدار اور تاجر پیشہ لوگ، اگر یہ سب کے سب ہی تعلیم کو اپنے مفادات کے لیے پیش کرنے پر تلے ہوں تو تعلیم تجارت کا سامان بن جاتی ہے اور تعلیم گاہیں تجارتی منڈیاں۔ اس ناول کا مرکزی کردار راجیش یوں تو 'سیاسیات' میں ایم۔ اے ٹاپر تھا اور سول سروسز کی تیاریوں میں مصروف تھا لیکن پروفیسر پرشاد کے سمجھانے پر ٹیچنگ کے پیشے سے وابستہ ہونے پر راضی ہوگیا۔ یو جی سی فیلوشپ بھی مل گئی۔ بدقسمتی سے پروفیسر پرشاد انتقال کر گئے اور ان کے بعد جنھیں ہنڈشپ ملی وہ پروفیسر پرشاد کے مخالف تھے لہٰذا پروفیسر پرشاد جنھیں عزیز رکھتے تھے انھیں ان کی مخالفت کا نشانہ بننا پڑا۔ لکچرر بننا اس کا ممکن نہ تھا، چنانچہ ایک کوچنگ سے وابستہ ہو جاتا ہے۔

اگر مندرجہ بالا ناولوں کے مطالعے اور ناول کی تکنیک کے متعلق ان کی آرا سے اردو ناولوں کے مختلف نظریات کا احاطہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ناول گوئی میں قصہ گوئی کو وہ بنیادی وصف مانتے ہیں جس سے کوئی ماجرا بیان کیا جاتا ہے۔ زندگی میں مختلف ایسے واقعات ہوتے ہیں جو زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں۔ ناول نگار ان ضمنی واقعات کو ہم آہنگ کر تسلسل سے پیش کرتا ہے چنانچہ قصہ گوئی کی پرکھ واقعات کے حسن تنظیم پر منحصر ہے۔

(بحوالہ قطب مشتری: ایک تنقیدی جائزہ)

بڑے ناول نگار کی فنی روش خارجی و داخلی احوال کے ادغام سے تشکیل پاتی ہے۔ اس لیے داخلیت کے ساتھ، خارجیت اتنی ہی اہم بن جاتی ہے (وہاب اشرفی: معنی کی تلاش، ص 83)۔ ناول نگاری کا ایک اہم ترین پہلو اس کی ٹوپوگرافی بھی ہوتی ہے جو ماجرا نگاری کو پلاٹ، کردار اور اسلوب نگارش کے حوالے سے انفرادیت عطا کرتی ہے۔

(وہاب اشرفی۔ معنی کی تلاش)

ناول ادب کی ایک صنف ہے اور ادب کا بنیادی کام کیا ہے؟ سچائی کی تلاش۔ یہاں سچائی کا مفہوم خاصا وسیع ہے۔ تخلیق ادب خالق کے دل کے نہاں خانے اور دماغ کی ترتیب اور تزئین کی ایک دلکش صورت ہے۔ اس کے سانچے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ادب کسی حال میں بھی سچائی سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتا۔ چاہے خیالات عرش سے پرے خالص رومانی کیف سے عبارت ہوں، اس لیے کہ ایسا کیف بھی اس کے ذہن و دماغ کی گونج ہوگا جس کا علاقہ بہتر طور سچائی پر محیط ہوگا، گویا ادیب اپنی تخلیقی سرشت میں جو رائے حق ہے، نقاد اسی حق وسچائی کی تشریح و توضیح نیز محاکمے میں اس کے اصول مختلف النوع ہوتے ہیں۔ ادب پارہ سرسری طور پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر اپنے تنقیدی شعور کا مذاق اڑا کر سطحیت کا شکار ہوتا ہے اور کبھی وہ تشریح اور وضاحت کے لیے ہم رشتہ ادب پاروں سے کسی مخصوص فن پارے کا موازنہ و مقابلہ کرتا ہے، تجزیے اور تحلیل کے جان لیوا مرحلے سے گزرتا ہے۔ اس کے سامنے روایت اور جدت کی کارکردگی آئینہ ہوتی ہے۔ ادب کا ارتقائی اور تاریخی شعور روایت کے مستحسن پہلوؤں سے اسے آشنا رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جدت طرازی کے محرکات وعوامل کی تفہیم کی سعی پیہم میں مصروف ہوتا ہے۔ اس طرح نقاد جو واقعتاً نقاد کہے جانے کا مستحق ہے، ہر حال میں سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے، اس حد تک کہ وہ کسی فن پارہ کے سلسلۂ تحلیل سے فن کار کے ذہن و دماغ میں اتر جاتا ہے تب ہی وہ متعلقہ تخلیقی کاوش کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرتا ہے۔''

(وہاب اشرفی۔ تحقیق وتنقید کا باہمی رشتہ۔ آگہی کا منظر نامہ۔ ص 12-11)

یہ طویل اقتباس براہ راست ناول سے تو متعلق نہیں ہے لیکن اس میں تخلیق وتنقید کے حوالے سے بعض ایسے بنیادی نکتوں کو موضوع بنایا گیا ہے کہ ان سے سرسری نہیں گزرا جاسکتا۔ مابعد جدید ڈسکورس پر گفتگو سے بہت پہلے وہاب صاحب کا ذہن پوری طرح صاف تھا کہ ادب کا بنیادی کام سچائی کی تلاش ہے سچائی تک رسائی کے لیے تخلیق کار کو دل اور دماغ میں یکسوئی پیدا کرنی پڑتی ہے۔

وہ کسی واقعہ کو نہ اخبار کے رپورٹر کی طرح نوٹ کرسکتا ہے اور نہ ہی کسی کیمرے کی طرح۔ کیونکہ تخلیق کا عمل محسوسات کا عمل ہے اور پھر ادیب ہو یا شاعر اس کا دل ودماغ ہر وقت متحرک رہتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ واقعہ ایک ہی ہوتا ہے لیکن دیکھنے والے کی نظر اسے الگ الگ تناظر عطا کردیتی ہے۔ شاید وہاب اشرفی نے اپنے تنقیدی مضامین کے اس مجموعے کا نام 'آگہی کا منظر نامہ' اسی لیے رکھا ہوگا کہ ناقد کے طور پر کسی تخلیق کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کو خود آگہی ہوتی ہے، ناقد کے اندر قاری اس کے لیے جواز کا مطالبہ کرتا ہے یعنی محسوسات کو مرئی شکل میں پیش کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ گویا کہ تخلیق کار اپنے آس پاس کی دنیا سے حاصل تجربات و مشاہدات کو تاریخ سے حاصل تجربات ومشاہدات کے نتائج سے اخذ کردہ آگہی کے تناظر میں ماجرا سازی کرتا ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ 'ناول' صنعتی دور کی صنف ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ ناول کا تعلق کہانی کہنے کی پرانی روایت سے وابستہ ہے۔ لہٰذا کتھا اور کہانی گوئی تمام لازمی شرطیں ناول کے فن کے لیے بھی ضروری سمجھی جانی چاہیے۔ چنانچہ ماجرا جسے کہانی پن بھی کہہ سکتے ہیں، کردار اور احساسات وجذبات کی ترجمانی اور کہانی کا فطری ارتقا ہے۔ ان کے نزدیک کہانی محض تخیل کی کارفرمائی نہیں ہے۔ اسے زندگی سے جڑا ہوا ہونا چاہیے۔ زماں ومکاں میں تبدیلی کہانی کا منظر نامہ بدلتی رہتی ہے اور کردار بھی وقت اور حالات کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اور ان کے اعمال اور ردعمل بھی وقت کے پابند ہوتے ہیں۔ اردو کے ایسے ناول نگاروں کا بھی مطالعہ کرتے ہوئے جن کا تعلق طبقہ اشرافیہ سے رہا ہے انھیں یہ محسوس ہوتا رہا ہے کہ اردو کے ناول نگار دکھی اور مظلوم انسانوں کی کہانیاں ہی لکھتے رہے۔ ظلم وستم کی دنیا، کمزوروں، مظلوموں، غریبوں، مسکینوں یہاں تک کہ طوائفوں اور بھک منگوں کا درد ان کا موضوع بنتا رہا ہے۔ انھیں ایک ایسی دنیا کی تلاش رہتی ہے جہاں ان دکھی روحوں کو ذلیل نہ ہونا پڑے وہ برداشت کرنے والوں میں شامل نہ رہیں بلکہ ظلم کا جواب دے سکیں۔ وہاب صاحب کے نزدیک یہی گیان ہے یہی آگہی ہے جو اردو ناول نگاروں کی بنیادی شناخت ہے۔

■

Hajra Khatoon
Research Scholar, Dept of Urdu
Ranchi University
Near Devi Mandir, Bariatu Road, Bariatu
Ranchi - 834002 (Jharkhand)

ایم اے کنول جعفری

اردو زبان اور ہماری ذمہ داریاں

کسی بھی زبان کی ترویج، ارتقا اور بقا کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اُس زبان کی تعلیم کے لیے بنیادی سطح پر معقول انتظام کیا جائے۔ زبان کی بتدریج نشو ونما کے لیے جہاں تعلیمی نظام کا بہتر ہونا انتہائی لازمی ہے، وہیں زبان کو زبانِ عام بنانے والے آسان اور خوش گوار ماحول کے قیام کی بھی ضرورت ہے۔ عوامی سطح پر مکمل طور پر سازگار ماحول، زبان کے فروغ میں ہمیشہ سے معین و مددگار ثابت ہوا ہے، لیکن زبان کو روزگار رخی بنانے کی کوشش بھی کی جانی چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان کوئی سی بھی ہو، وہ اسی صورت میں ترقی کی منازل طے کرسکتی ہے، جب اس کا استعمال اظہار کے وسیلے کے طور پر کیا جائے اور اس کے ذریعہ روزگار کے مواقع حاصل کیے جاسکیں۔

ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے۔ یہاں قریب 1650 زبانیں رائج ہیں، ان میں 150 کے بولنے والے قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک اردو اور اس کے ارتقا کی بات ہے، اگر ہندوستان میں لشکری افراد نے اس زبان کا استعمال وسیلے کے طور پر نہ کیا ہوتا، تو شاید آج اردو کا وجود ہی نہ ہوتا یا پھر اردو کی موجودہ شکل ہم تک نہ پہنچ پاتی اور اگر پہنچتی بھی تو شاید کچھ اور تاخیر سے پہنچتی۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ افواج میں شامل الگ الگ مذاہب، فرقوں، قوموں اور خطوں کے افراد کسی خاص مذہب، علاقے یا ملک کی زبان کا استعمال کرتے ہوئے اپنی بات کو دوسرے لوگوں تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔ ان کا آپس میں بات چیت کرنا لازمی تھا۔ اس سے گریز ممکن نہیں تھا۔ شروع میں بات سمجھانے کے لیے اشاروں کنایوں سے بھی مدد لی گئی۔

پھر رفتہ رفتہ الگ الگ زبانوں سے ادا کیے جانے والے الگ الگ لسانیات کے الفاظ کسی شخص کے ذریعے اپنی بات کہنے اور جواب میں دوسرے شخص کی بات سمجھنے کے ذریعہ کے طور پر ادا کیے جانے والے مکالمات میں معاون و مددگار ثابت ہوتے گئے۔ معاشرت و معاملت، تہذیب و ثقافت اور دیگر عوامل و عناصر نے اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح ذریعۂ ترسیل کے لیے جو زبان وجود میں آئی، وہ کوئی اور زبان نہیں، درحقیقت اردو ہی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی نشو ونما ہوتی گئی اور اس نے اپنی قوت و صلاحیت، کیفیت و احساسات، افکار و خیالات اور رنگ و جذبات کی بنا پر سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

حالانکہ مسلمانوں کی دلی آمد سے قریب دو سو برس قبل 1000 میں اردو کا استعمال بول چال کی زبان میں کیا جانے لگا تھا، لیکن اس کا باقاعدہ طور پر ارتقا 1193 کے بعد سے شروع ہوا تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے، جس میں مسلمانوں کے ذریعے دلی کو فتح کر لیا گیا تھا۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے تدریسی مجلہ سہ ماہی ادیب جنوری۔ مارچ 1982 میں مرزا خلیل بیگ کا ایک مضمون بعنوان، 'اردو کا آغاز و ارتقا' شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی چند اہم نکات کی نشان دہی کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

''یہ خیال درست نہیں ہے کہ اردو شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد کے باعث یا ان کی آمد کے بعد پیدا ہوئی۔ اردو کی ابتدا یا اس کے آغاز کو جو ایک لسانی مظہر ہے، کو مسلمانوں کی آمد سے منسوب کرنا گمراہ کن نظریہ ہے۔ اردو کا ابھار مسلمانوں کی دلی میں آمد سے تقریباً دو سو سال قبل 1000 عیسوی کے لگ بھگ شروع ہو چکا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ 1193 کے بعد سے اس کی ترقی کی رفتار تیز ہو گئی اور آہستہ آہستہ اس پر نکھار آنے لگا۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد ایک تاریخ ساز واقعہ ہے، جس کے دوررس نتائج سے تقریباً سب ہی زبانیں متاثر ہوئیں۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ اگر مسلمان شمالی ہند میں داخل نہ ہوئے ہوتے، تو جدید ہند آریائی زبانوں کے آغاز میں کافی تاخیر ہو جاتی۔''[1]

اردو زبان کی ایک طویل تاریخی حیثیت ہے۔ شمالی ہند میں قریب دو سو برس تک ارتقا کی منزل طے کرنے والی زبان اپنے نکھار اور ابھار کے ساتھ سترہویں صدی کے آخر تک لسانی ارتقا کا ایک دور مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مسلمانوں کی دہلی آمد کے بعد اسے اپنا مسکن بنانے والے نو وارد افراد میں جہاں عربی زبان میں بات کرنے والے شامل تھے، وہیں فارسی اور ترکی زبان میں کلام کرنے والے بھی موجود تھے۔ بڑی تعداد میں پنجاب چھوڑ کر دلی آجانے والے لوگ اپنی مادری زبان پنجابی میں گفتگو کرنے کو ہی زیادہ پسند کرتے تھے۔ دلی اور اس کے قرب و جوار کے علاقے میں پہلے ہی سے ہریانوی، کھڑی بولی، برج بھاشا اور میواتی زبان کا بول بالا تھا۔ ان حالات میں پراکرتوں سمیت مختلف مقامی اور غیر مقامی زبانوں کے گھال میل سے بول چال والی زبان کی جو نئی شکل وجود میں آئی، اسے کئی ناموں سے جانا گیا۔ ابتدا میں اسے کھڑی بولی، گجری، بھوج پوری، دکنی، ہندوستانی، ہندوی، ہندی، ریختہ اور بعد میں اردو کہا گیا۔ رفتہ رفتہ شمالی ہند اور دکن میں اردو مقبول ہو کر عام بول چال کی زبان اور ہندوستانیوں کی نورِ نظر بن گئی۔

حالانکہ ادبی، تہذیبی اور سرکاری حیثیت سے فارسی زبان دوسری زبانوں پر ہمیشہ غالب رہی، لیکن سترہویں صدی میں اس کے تحریر کا وسیلہ بننے کے ساتھ ہی اردو کو ترجیح دی جانے لگی۔ مغلیہ اقتدار کے زوال کے ساتھ فارسی کا زوال شروع ہو گیا۔ اس سے بھی اردو کو خاطر خواہ مستفیض ہونے کا موقع مل گیا۔ اس بابت مرزا خلیل بیگ کا قول ہے۔

''اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے سلطنت مغلیہ کے زوال کی ایک طویل داستان شروع ہوتی ہے۔ یہی زمانہ اردو کے مکمل ارتقا، بھر پور شباب اور پورے عروج کا زمانہ ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں فارسی کا زوال بھی شروع ہوا۔ جب فارسی روبہ زوال ہوتی نظر آئی، تو شمالی ہند کے فارسی شعرا اردو میں شعر کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح بول چال کی زبان کے علاوہ اردو، اب شعری وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے بھی پہچانی جانے لگی۔ تاہم اس کی ترقی کی رفتار بہت مدھم رہی اور ادبی زبان کی حیثیت سے یہ کوئی قابل قدر کارنامہ انجام نہ دے سکی۔ عین اسی موقع پر ولی دکنی کی دلّی میں آمد کا اعلان ہوا۔ ولی کے اردو کلام کو دیکھ کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کے دیوان کی دلی کے ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور ان کے اشعار گلی کوچوں میں گنگنائے جانے لگے۔ اس ادبی جوش و خروش سے شمالی ہند میں ایک نئے ادبی انقلاب کا آغاز ہوا۔''[2]

جہاں تک اردو کی مقبولیت کا سوال ہے تو اس کی اہمیت و وقعت سے کسی ہندوستانی کو انکار نہیں ہے۔ اردو ہماری زبان ہے اور اس کے جمہوری ہونے پر کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ انگریزی غلامی کی بیڑیاں کاٹ کر آزادی دلانے میں اہم کردار نبھانے والی اردو زبان کے ہر دل عزیز ہونے میں فطری حالات اور قدرتی عوامل کا بھی دخل رہا ہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام 1996 میں شائع ہونے والی پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی کی کتاب 'ہماری زبان، مباحث و مسائل' میں بھی اردو کے ہر دل عزیز ہونے کا کچھ اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

''..... اردو کی یہ ہر دل عزیزی اور مقبولیت اس حقیقت کی غماز ہے کہ اردو جن فطری حالات اور قدرتی عوامل کے زیر اثر وجود میں آئی تھی، وہ اسی کے متقاضی تھے کہ اس برِعظیم کا ہر علاقہ اسے اپنا بتائے اور ہر خطہ اسے اپنی طرف منسوب کرے۔ یاد رکھیے کہ زبان فطری طور پر پیدا ہوتی ہے۔ بنائی نہیں جاتی۔ اور اس حقیقت کا ایک بڑا روشن اور مضبوط ثبوت ہماری اردو زبان ہے۔''[3]

اردو میں کم و بیش چالیس فیصدی فارسی الفاظ کے علاوہ پنجابی، عربی، برج بھاشا، ہندی، بنگالی، کھڑی بولی، پراکرت اور انگریزی کی شمولیت سے اردو زبان نہ صرف آسان و عام فہم ہو گئی ہے، بلکہ اس کی چاشنی، شیرینی، رنگینی، جاذبیت اور لطافت نے اسے بغیر امتیاز مذہب و ملت ہر شخص کو اپنی جانب راغب کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے متعدد خطوں میں رابطہ اور یکجہتی کا بہترین وسیلہ اردو زبان ہی رہتی آئی ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ خلیجی اور مغربی ممالک میں بھی اردو بولنے، سننے، لکھنے، پڑھنے اور ادبی خدمات انجام دینے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج بھی مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائیوں کا ایک بڑا طبقہ اردو میں گفتگو کرنے کو پسند کرتا ہے جو اردو کے تئیں ان کی رغبت وخدمت اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کا ثبوت ہے۔

''اردو کے ارتقا پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ پشتو ہو یا ہندکو، سندھی ہو یا ملتانی، پوٹھوہاری ہو یا پنجابی، گجراتی ہو یا مراٹھی، برج بھاشا ہو یا کھڑی بولی جس زبان اور جس بولی کے علاقے میں بھی اس کی رسائی ہوئی، یہ سب سے یکساں محبت سے ملتی رہی۔ ایک طرف تو اپنی خوبیوں کے باعث ہر ایک کے منھ لگتی اور سر چڑھتی رہی اور دوسری طرف خود بھی سب کو دل میں بٹھاتی اور سینے سے لگاتی رہی۔ آخر وہ دن آیا کہ اس برِعظیم میں عوام و خواص سب نے اسے اپنا مان لیا۔ اور اسے قبول عام کا تاج پہنا دیا۔''[4]

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں اور واضح ہے کہ کوئی بھی زبان کسی خاص مذہب یا ملک کی ملکیت نہیں ہوا کرتی ہے۔ اردو بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ یہ نہ صرف برِعظیم کی مخلوط تہذیب کی عکاس ہے۔ مسلم و غیر مسلموں کی مشترکہ تہذیب کی علامت و امانت قرار دی جانے والی اردو زبان کی نشو و نما میں عربی، ایرانی اور ترکی تمدن نے بھی اپنا ہر ممکن تعاون دیا ہے۔ اردو زبان میں جہاں بہت سی زبانوں کے الفاظ براہِ راست شامل ہیں، وہیں کئی دیگر زبانوں کے الفاظ دوسری زبان یا تہذیب کی معرفت اردو میں داخل ہوئے ہیں، لیکن جہاں تک سنسکرت، یونانی اور پالی وغیرہ کا تعلق ہے، ان کے الفاظ مقامی بولی کے وسیلے سے اردو میں جگہ پانے میں کامیاب ہو گئے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فرماتے ہیں۔

''ہر زبان کسی تمدن اور معاشرت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ہماری اردو زبان برِعظیم پاک و ہند کی اس مخلوط تہذیب کی عکاس ہے، جو عربوں، ایرانیوں، ترکوں اور مقامی باشندوں کے مدت دراز کے میل جول اور خلط ملط سے وجود میں آئی تھی۔ اس لیے اس میں مقامی اور بیرونی کئی زبانوں کے الفاظ اس طرح رل مل گئے ہیں کہ لسانیات کے اصول کے مطابق اب وہ اردو کے ہی کہے جائیں گے۔ اب تک کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ جہاں تک اردو زبان کی ساخت کا تعلق ہے، وہ پنجابی، برج بھاشا اور کھڑی بولی تینوں سے یا ان میں سے چند کی ترکیب سے وجود میں آئی ہے۔ البتہ اس کے قواعد میں فارسی کو بہت دخل ہے۔ رہا ذخیرۂ الفاظ تو وہ اس نے بہت سی زبانوں سے اخذ کیا ہے۔ سنسکرت، یونانی، پہلوی اور پالی سے اس نے براہِ راست کچھ نہیں لیا۔ ان زبانوں کے الفاظ جو اردو میں آئے وہ کسی نہ کسی مقامی بولی کے توسط سے داخل ہوئے ہیں۔ البتہ فارسی، عربی، ترکی، پشتو، گجراتی اور پنجابی وغیرہ سے اس نے جو کچھ لیا وہ براہِ راست ہے اور اُن میں زیادہ سے زیادہ ذخیرہ فارسی کے راستے اردو تک پہنچا ہے۔ مغربی زبانوں میں سے سب سے زیادہ الفاظ ہم نے انگریزی سے حاصل کیے ہیں اور تھوڑے بہت پرتگالی اور فرانسیسی وغیرہ سے۔''[5]

اردو ایک عوامی زبان ہے۔ ہندوستان سمیت بیرون ممالک میں رہنے والے اشخاص کا ایک بڑا طبقہ نہ صرف اردو زبان کی شیرینی اور کشش کو تسلیم کرتا ہے، بلکہ اُس کے الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ بولنے اور سمجھنے میں کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ انکار اس حقیقت سے بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کی تعلیم سے ناآشنا رہنے والے کتنے ہی افراد اردو کو لکھ نہیں پاتے، لیکن اردو الفاظ کو بڑے سلیقے سے بول لینے کا ہنر سیکھ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اردو کا فخریہ استعمال کرنے والے اس طرح کے لوگوں کے سامنے رسم الخط ایک بڑا مسئلہ ہے۔ کتنے ہی ادیب و مشاہیر ادبی محفلوں میں لطیف مقالات پیش کر سرخروئی حاصل کرتے ہیں، تو ترنم کے منارے پر کھڑے کتنے ہی شعراء قومی و بین الاقوامی سطح کے مشاعروں میں دھوم مچاتے نظر آتے ہیں، لیکن اپنے مضامین اور شاعری کو قرطاس ابیض پر اتارنے کے لیے وہ جس رسم الخط کا استعمال کرتے ہیں، وہ فارسی (اردو) نہ ہو کر دیوناگری (ہندی) ہوتا ہے۔ اردو کو اپنی زبان مان لینا بھی کافی نہیں ہے۔ اسے اور اس کے رسم الخط کی حفاظت کرنا بھی ہماری ذمے داری ہے۔ برق رفتار ترقی کے دور میں کافی پیچھے نظر آنے والی اردو کو اُس کا واجب مقام نہیں دیے جانے کے لیے ہم مرکزی اور صوبائی سرکاروں کو ذمہ دار ٹھہراتے رہتے ہیں، لیکن کیا یہی حقیقت ہے؟ اردو کو حاشیہ پر کھسکانے کے لیے بڑی حد تک اردو داں ہی

قصوروار ہیں۔کل تک اردو کا پرچم بلند رکھنے والے گھروں کے بچے آج اردو کو پس پشت ڈال کر انگلش میڈیم اسکولوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ان بچوں کو شروع سے ہی انگریزی میں بات کرنا سکھایا جاتا ہے۔سی بی ایس ای یا سی ایس ایس ای سے منسلک اسکولوں کے طلبا وطالبات کو کلاس میں انگریزی زبان میں گفتگو نہیں کر نے کی پاداش میں جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ ماں باپ بچوں کے فرنگی زبان بولنے پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ انگریزی یا دوسری زبانیں سیکھنے میں کوئی بُرائی نہیں ہے،لیکن تکلیف دہ عمل یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے بچوں کی تعلیمی کمزوری دُور کرنے کے لیے انگلش، سائنس اور حساب وغیرہ مضامین کا ٹیوشن تو لگا دیتے ہیں،لیکن اہل و عیال کے لیے ان اسکولوں سے ندارد اردو کی تعلیم گھر پر دلانے کا کوئی بندوبست نہیں کرتے۔

اس میں دو رائے نہیں ہے کہ اردو ایک عوامی زبان ہے۔ یہ کبھی مذہبی پابندیوں میں قید نہیں رہی۔ اسے فروغ دینے کے لیے ہر مذہب وقوم کے لوگوں نے ہرممکن قربانی دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائیوں تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ جنونیت کی انتہا کو پہنچ کر ہر کسی کی منظورِ نظر بن گئی۔اردو صرف امیر خسرو کی زبان نہیں ہے،جنھیں مسلمان اپنا شاعر اور ہندو اپنا کوی مانتے تھے۔اردو قلی قطب شاہ، ولی دکنی، میر امن، رجب علی بیگ، ابراہیم ذوق، مرزا ہادی رسوا، بہادر شاہ ظفر، داغ دہلوی، مولوی محمد باقر، مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، میر تقی میر، ڈاکٹر نذیر احمد، حیدر علی آتش، مرزا اسد اللہ خان غالب، محمد علی جوہر، ڈاکٹر محمد اقبال، فیض احمد فیض، شبیر حسن جوش ملیح آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، علی سکندر جگر مرادآبادی، شکیل بدایونی اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کی ہی زبان نہیں ہے، یہ دلچسپ وخوبصورت زبان رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، برج نارائن چکبست، درگا سہائے سرور، ہرگوپال تفتہ، تلوک چند محروم، منشی نول کشور، بھولن سنگھ، ہری دت، سدا سکھ لعل، ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، راجیندر سنگھ بیدی، مہیندر سنگھ بیدی سحر، کرشن چندر، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، پنڈت بالمکند عرش ملسیانی، پنڈت برج موہن دتاتریہ، فراق گورکھپوری، کرشن چندر، موہن لال گپتا، خوشتر گرامی، منشی پریم چند، رام پرساد بسمل، بلونت سنگھ اور نریش کمار شاد جیسے لاتعداد ادیب وشعرا کی زبان بھی ہے۔اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا ماننے والے ہندو، مسلم اور سکھ وغیرہ پر مشتمل انگنت ناموں کی ایک لمبی فہرست بہ آوازِ بلند یہ جتانے کے لیے کافی ہے کہ اردو زبان کسی خاص مذہب،فرقہ اور علاقہ کی زبان نہیں ہے۔ اس کی آبیاری ونشونما کے لیے ہر مذہب وملت اور خطے کے افراد نے اپنی مقدور بھر قربانیاں دی ہیں۔

مرزا خلیل بیگ کے الفاظ میں:"اردو کی ساخت یہ بتاتی ہے کہ اس کا پورا قواعدی ڈھانچہ مقامی بولیوں کا ہے۔صرف ذخیرۂ الفاظ کا کچھ حصہ فارسی اور عربی الفاظ پر مشتمل ہے۔ اگر اردو صرف مسلمانوں کی ساخته ہوتی ،تو اس کا بنیادی ڈھانچہ فارسی، عربی یا ترکی زبان کا ہوتا اور باہمی میل جول کی وجہ سے اس میں صرف تھوڑے سے الفاظ دیسی بولیوں کے شامل ہو گئے ہوتے۔لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کے آغاز و ارتقا اور اس کے فروغ میں مقامی باشندوں نے زیادہ حصہ لیا۔"[6]

سیکولر شبیہ اور وسیع القلب کی مالک یہ ہندوستانی زبان آزادی سے قبل اسکولوں، پاٹھشالاؤں اور مدارس میں تعلیم کا واحد ذریعہ تھی۔اَدب اور تہذیب کی زبان اردو، نہ صرف شہری اور دیہاتیوں کی زبان تھی، بلکہ اسے ہندو، سکھ اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان کے طور بھی جانا جاتا تھا۔ اردو کاروباری، صحافتی، عدالتی، دفاتر و انتظامی امور اور سرکاری کام کاج کی زبان تو تھی ہی، تمام طرح کے دستاویز بھی اردو میں ہی تحریر و تیار کیے جاتے تھے۔ جہدِ آزادی کے لیے 'انقلاب زندہ باد' کا پُرجوش نعرہ عنایت کرنے اور غلامی کی زنجیروں کو کاٹ پھینکنے میں معین و مددگار اردو زبان کے ترانے آزادی کے بعد بھی عام آدمی کی زبان کی زینت بنے ہیں۔

ہندوستان کا آئین ملک کی ریاستوں کو مقامی زبانوں میں سے کسی ایک یا زائد کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کا اختیار دیتا ہے۔ اسی حق کے استعمال کی بدولت اردو جموں وکشمیر میں پہلی زبان کے طور پر تسلیم کی گئی ہے، جبکہ کئی دیگر ریاستوں میں اسے دوسری سرکاری زبان ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ اردو کے تئیں ہم حکومت کی تنگ نظری اور منفی رویے کو تو ذمے دار ٹھہراتے ہیں،لیکن اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے ہم نے دل وجان سے کوشش نہیں کی۔سدا التجا پر ہی قناعت کی اور کبھی بھی بڑے پیمانے پر احتجاجی قدم اُٹھانے کی جسارت نہیں کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ ہماری مجلسیں اردو زبان کی شیرینی سے خالی ہوتی جا رہی ہیں۔ اردو میں گفتگو کرنا کسرِ شان سمجھا جانے لگا ہے۔الٹی سیدھی اور بے ربط انگریزی بول لینے کو دانشمندی اور ترقی کی علامت خیال کیا جا رہا ہے۔ شہرو دیہات، گلی محلوں، شاہراہوں، روڈویز اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں وغیرہ کے نام اردو میں لکھے نہیں ہونے پر حکومت کی جم کر نکتہ چینی کی جاتی ہے،لیکن ہمارے اپنے مکانات کے دروازوں پر لگی نام کی تختی انگریزی یا پھر ہندی زبان میں کندہ کرائی جاتی ہیں۔ اسے ہماری کم فہمی اور کم نصیبی نہیں تو اور کیا کہا جائے گا کہ شادی،عقیقہ یا دیگر تقاریب کے دعوت ناموں سے بھی اردو سرے سے غائب پائی جا رہی ہے۔کم تکلیف دہ یہ بھی نہیں کہ اردو کی فلاح و بہبود کے نام پر منعقد کیے جانے والے کئی مشاعروں کے دعوت نامے تک فرنگی زبان میں شائع کیے گئے ہیں۔ اچھی آواز اور ترنم کا فائدہ اُٹھانے والے نوجوان شاعروں کا ایک بڑا طبقہ اردو لکھنے و پڑھنے سے معذور ہے،لیکن وہ اردو زبان کی آڑ لے کر دیوناگری رسم الخط میں تحریر کردہ نگارشات کو مشاعروں کے اسٹیج پر فخریہ انداز میں پیش کروا واہی لوٹنے میں لگا ہے۔

اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اسے مذہب،فرقہ اور خطے کی گرفت سے مستثنٰی رکھا جائے۔اس کے فروغ کے لیے اسے روزگار سے جوڑا جائے۔ درس گاہ و اسکولوں میں اردو کی تعلیم کو یقینی بنانے کے ساتھ سرکاری و نیم سرکاری دفاتر میں اردو داں حضرات کی تقرری کو لازمی بنایا جائے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اردو کی ترقی اور بقا کے لیے ایماندارانہ کوششیں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہیں، لیکن یہ تب ہی ممکن ہے، جب منصفانہ کاوشیں کی جائیں۔ایماندارانہ اور مخلصانہ جدوجہد کے بغیر اردو کی ترقی کا خواب دیکھنا ہوائی قلعہ بنانے جیسا ہی ہے۔

حواشی

1- سہ ماہی ادیب، جامعہ اردو علی گڑھ شمارہ جنوری-مارچ 1982، ص نمبر 43

2- سہ ماہی ادیب، جامعہ اردو علی گڑھ شمارہ جنوری-مارچ 1982، ص نمبر 49

3- 'ہماری زبان، مباحث و مسائل' صفحہ نمبر 09۔از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، انجمن ترقی اردو پاکستان

4- 'ہماری زبان، مباحث و مسائل' صفحہ نمبر 09از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، انجمن ترقی اردو پاکستان

5- 'ہماری زبان، مباحث و مسائل' صفحہ نمبر 09 اور 10۔از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، انجمن ترقی اردو پاکستان

6- سہ ماہی ادیب، جامعہ اردو علی گڑھ شمارہ جنوری-مارچ 1982، ص نمبر 51

■

M.A. Kanwal Jafri
127/2, Jama Masjid, NEENDRU,
Tehsil Dhampur, Distt.: Bijnor - 246761
Mob.:09917767622
Email.: jafrikanwal785@gmail.com

پنجاب کا ایک گمنام شاعر
رام رتن مضطر

رحمان اختر

اردو زبان کی ابتدائی کڑیاں کسی نہ کسی طرح پنجاب سے جڑی ہوئی ہیں یا یوں کہیے کہ اردو زبان و ادب سے پنجاب کا شروع سے مربوط و مضبوط رشتہ رہا ہے۔ بلا شک اردو زبان کی تاریخ صدیوں میں پھیلی ہوئی ہے جو ہندوستانی عوام کو ایک لڑی میں پروتی رہی ہے۔ نتیجتاً اردو زبان نے فاصلوں کو مٹایا ہے اور ہندوستان میں قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ پنجاب کی دھرتی پر ایسے بے شمار لعل و گوہر پیدا ہوئے جنھوں نے اردو، فارسی زبانوں کی آبیاری ہر دور میں کی ہے۔ اردو زبان و ادب کے لیے پنجابیوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان سے انحراف کی گنجائش نہیں ہے۔ پنجاب اور اردو کے حوالے سے بہت کچھ تحریر کیا جا چکا ہے اور تحریر کیا جا رہا ہے۔ اس سے آگے کی بات کریں تو پنجاب کے حوالے سے اردو کے معتبر شاعروں اور ادیبوں پر تنقیدی و تحقیقی کام ہو رہے ہیں اور ان کی ادبی خدمات کو منظرِ عام پر لانے کی بھرپور کوششیں ہو رہی ہیں لیکن چند ادیب و شاعر ایسے ہیں جو نظر انداز تو نہیں ہوئے لیکن کسی وجہ سے ان کے ذکر کی کمی کھٹک رہی ہے۔ ایسے ہی گمنام تخلیق کاروں کی اردو شعر و ادب کے تئیں محبت اور ادبی خدمات کا احساس کرانا ہم سب کا فریضۂ اول ہے۔ اس ضمن میں یہ محسوس کیا گیا کہ حسرت موہانی، میلہ رام وفا اور تلوک چند محروم وغیرہ عظیم اردو شاعروں کی رہنمائی حاصل کرنے والے شاعر رام رتن مضطر کی ادبی خدمات کا فکر و فن کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تا کہ ان کی شاعری، تنقید اور صحافت کا ادبی منظر نامہ پیش کیا جا سکے۔

ترے افکارِ تاباں پر سخنور رشک کرتے ہیں
زمینِ شعر کو مضطر بنایا آسماں تو نے

اس شعر کا خالق کون ہے اور وہ کس بلند پایہ کے شاعر ہیں اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ دراصل یہ مضطر صاحب پنڈت رام رتن ہیں جن کو عوام ایک ہیڈ ماسٹر اور سماجی کارکن کے طور پر جانتے تھے۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ وہ اردو زبان میں بلند پایہ کے شعر بھی کہتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جہاں عام طور پر تخلیق کار اپنی تخلیقات کو شائع کروا کر واہ واہ پسند کرتے ہیں یہ بات ان کی فطرت میں شامل نہیں تھی۔ بچپن ہی سے آپ شعر کہنے لگے تھے، ساتویں آٹھویں جماعت میں اردو میں شاعری کرنے لگے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کا ذوق بڑھتا گیا اور کلام میں پختگی آتی رہی۔

رام رتن مضطر کی پیدائش یکم ستمبر 1906 کو امرتسر کے ایک گاؤں تھریئے وال کے برہمن خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد کاشتکار تھے۔ وہ ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے بیٹے کو تعلیم دلانے کے خواہاں تھے۔ لیکن 15-14 سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ایسے حالات میں گھر کی مکمل ذمے داری رام رتن کے سر آ گئی۔ 1923 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ذمے داری کا احساس لے کر تلاشِ معاش میں گھر سے نکل پڑے اور مجیٹھ میں پھر بھنگالی میں بطور معلم ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے دوران بھی رام رتن پرائیویٹ طور پر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بی اے اور بی ٹی کے امتحان بھی پاس کیے۔ اسی اسکول میں 1936 میں بطور ہیڈ ماسٹر تقرری ہوئی اور 33 سال ملازمت کر کے 1969 کو یہیں سے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے دوران وہ شعری شغف بھی رکھتے تھے اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ ان کے ادبی دوستوں سے مذاکرے ہوتے رہتے تھے۔

35-36 سال کی عمر تک انھوں نے خوب شعر کہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ اگلے پچیس سال تک آپ کی شاعری معطل رہی۔ شاعری پر طاری جمود سے متعلق وہ خود فرماتے ہیں۔

ہم نشیں کیا چھیڑنا ہے داستانِ شاعری
اب نہ وہ ہم ہیں، نہ وہ دورِ زمانِ شاعری
مدتیں گزریں کہ اب کچھ دل میں آتا ہی نہیں
مدتیں گزریں کہ ساکت ہے زبانِ شاعری

مضطر کو انگریزی شاعر ملٹن کی طرح افسوس ہے کہ وہ زندگی کے چکروں میں الجھ کر شاعری کی خداداد صلاحیت سے محروم ہو رہے جس کا احساس ان کو یوں ہوتا ہے۔

فکرِ دنیا کی کشاکش میں کہاں ذوقِ سخن
جا رہی ہے رائیگاں جنسِ گرانِ شاعری
کیا ہو گئے وہ عشق و محبت کے فسانے
مضطر تجھے برسوں سے غزل خواں نہیں دیکھا

ادبی ذوق کے سبب شعر کہنے کی صلاحیت رام رتن میں بچپن سے ہی پیدا ہو گئی تھی۔ پہلی بار 8ویں کلاس میں دفعتاً دو شعر انھوں نے کہے اور بیحد دلی مسرت محسوس کرتے ہوئے اپنے دوستوں کو سنائے وہ متعجب بھی ہوئے اور مسرور بھی۔ آہستہ آہستہ ان کی شہرت اسکول کے معلمین تک جا پہنچی۔ طالب علمی کے زمانے میں مہاتما گاندھی

جی کی عدم تعاون کی تحریک سے متاثر ہو کر نظم کہی جس کا ایک شعر ملاحظہ ہو

لگے گی کس طرح اپنی نہ اب کشتی کنارے پر
کہ خوش بختی سے ہم کو مل گیا ہے ناخدا گاندھی

اسی دور میں 'بھارت ماتا کی فریاد' کے عنوان سے چند شعر کہے۔

جس کی دانائی کا تھا ایک زمانہ قائل
ہائے کس منہ سے کہوں اب وہی ناداں ہوں میں

طالب علمی کے اس زمانے میں شعر گوئی کی ترغیب ان کو اپنے دوستوں کی تحسین و آفریں اور طبیعت کی موزونی سے ملتی رہی۔

1928 میں رام رتن مضطر نے علمی و ادبی ماہنامہ 'طور' نکالا جو دو اڑھائی سال تک جاری رہا لیکن پھر بند ہو گیا۔ اس ماہنامے کے ذریعے ان کی ملاقات اور تعارف اردو کے نامور اور معتبر ادیبوں شاعروں سے ہوا۔ ان کا کلام ملک کے مختلف رسائل 'ہمایوں' چندن، ادبی دنیا وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔ مضطر حسرت موہانی کے رنگِ غزل سے بے حد متاثر تھے۔

رام رتن کی حیات کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ 1940 کے بعد 1966 تک یعنی 26 سال کے طویل عرصے میں انھوں نے اپنی شعری سوتیں بند رکھیں۔ جس کا اعتراف ایک جگہ وہ خود کرتے ہیں:

''اور لگ بھگ 1940 کے بعد میں نے قریباً 25-26 سال کے طویل عرصے میں ایک شعر بھی نہ کہا اور مجھے شاعری سے دلی لگاؤ نہ رہا..... مگر تعجب کی بات ہے کہ جو چوتھائی صدی کی طویل خاموشی کے بعد میری شاعرانہ قوتیں نومبر 1966 میں پھر سے بیدار ہو گئیں اور دبی ہوئی چنگاریاں شعلے بن کر بھڑک اٹھیں اور میں اس تین سال کے قلیل عرصے میں اتنا کچھ کہہ گیا کہ پہلے تیس برس میں بھی نہ کہا ہوگا۔'' (نوائے مضطر مجموعہ، پیش لفظ)

اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ رام رتن مضطر کی بیشتر شاعری ان کی عمر کے آخری دور میں تخلیق ہوئی۔ اسی دور میں ان کی رہنمائی شاعر حریت میلہ رام وفا نے فرمائی۔ میلہ رام وفا سے شاعری میں مدد بھی حاصل کرتے رہے۔ وفا کی شاعری اور فکر سے متاثر بھی ہوئے۔ بقول مضطر:

''خوش قسمتی سے مجھے جناب میلہ رام وفا جیسے مرشدِ کامل کی رہنمائی بھی حاصل ہو گئی۔ جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، طبیعت میں نکھار آیا، کئی ایک فنی نکتے جن سے آج تک لاعلمی تھی، ان کی نظرِ التفات سے معلوم ہوئے اور ان کا مخصوص رنگ مجھ پر چڑھنا شروع ہو گیا۔''

رموزِ شعر اے مضطر نہ ہوں کیونکر عیاں ہم پر
کہ برسوں ہم نے خدمت کی ہے اک استادِ کامل کی

متذکرہ بالا اقتباس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ رام رتن مضطر کی شاعری دو دور پر محیط ہے۔ اپنی شاعری سے متعلق مضطر لکھتے ہیں:

''ویسے میری شاعری کے دو دور صاف اور غیر مبہم ہیں۔ اول زمانہ طالب علمی سے لے کر 1940 تک اور دوم زمانہ 1966 سے 1969 تک۔ میری محبوب صنفِ سخن غزل میں ہر قسم کے خیالات کے اظہار کی صلاحیت پاتا ہوں۔'' (نوائے سروش، پیش لفظ)

عرصۂ دراز کے بعد مضطر صاحب کا رجحان پھر شاعری کی طرف مائل ہوا اب شاعری سے جدا ہونا ان کے لیے محال تھا۔

اب تو ناممکن ہے مضطر چھوڑنا
شاعری جذبِ طبیعت ہو گئی
شعر گوئی کی جو رفتار یہی ہے مضطر
ایک ہی سال میں دیوان مرتب ہوگا

مضطر صاحب کے شعری مجموعوں کے منظر عام پر آنے سے پہلے ان کا کلام ہندوستان اور پاکستان کے معیاری ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ شاعری کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ شاعر کے دل کی آواز قاری کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

جو شعر میں بیاں نہ کرے وارداتِ قلب
مضطر مذاق کرتے ہیں وہ شاعری کے ساتھ

رام رتن مضطر کے پانچ شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 1970 میں 'نوائے مضطر' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد چار مجموعے شائع ہوئے۔ پہلے شعری مجموعے کی اشاعت سے متعلق رام رتن مضطر خود لکھتے ہیں:

''اس کی اشاعت کے جواز میں صرف ایک دلیل ہے اور وہ یہ کہ میں نے آج تک جو کچھ کہا اپنے دل کی آواز پر کہا یا کبھی کسی موقعہ پر دوستوں کی خوشنودی خاطر کے لیے۔'' (نوائے سروش، پیش لفظ)

رام رتن مضطر کی شخصیت شرافت، اخلاص، ایثار اور کارِ خیر کی پیکر ہے۔ فطری طور پر کم گو، خوددار اور قانع انسان تھے ظاہری نمائش اور نام و نمود سے کتراتے تھے۔ دوستوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ مضطر کے پہلے دور کے کلام میں حسرت موہانی کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ دوسرے عہد کے کلام میں میلہ رام وفا کا رنگ نمایاں طور سے جھلکتا ہے۔ ہر دیکھنے والی نگاہ اس فرق کو بخوبی پہچان سکتی ہے۔ غزل کے رشتے میں انھوں نے اخلاقی قدروں کے آبدار موتی بڑے حسن اور سلیقے سے پروئے ہیں۔ جذبے کی صداقت اور ادائے بیان کی سادگی نے ان کے تغزل کو خوب نکھارا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کا تقریباً ہر شاعر اپنی شاعری کی ابتدا غزل لکھ کر کرتا ہے اور صنفِ غزل اردو شاعری کی ہمہ گیر مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ رام رتن مضطر کی شاعری کا آغاز بھی غزل گوئی سے ہوتا ہے۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ نوائے سروش 1974 میں انجمن ترقی اردو ہند کی امرتسر برانچ نے شائع کیے۔

جمالِ یار کے جلوے کی تاب لا نہ سکے
ہزاروں شوق پہ بھی ہم نظر اٹھا نہ سکے
ملتے ہیں گاہ گاہ بھی وہ بے رخی کے ساتھ
اتنا کرم بھی کرتے ہیں کتنی کمی کے ساتھ

مضطر کے شعری محاسن میں فصاحت، بلاغت، خیال کی پاکیزگی اور بیان میں صفائی اور سادگی ملتی ہے۔ کلام مرصع ہے۔

ناچار میں بھی قائلِ تقدیر ہو گیا
تدبیر جب نہ میری کارگر ہوئی

مضطر کی شاعری میں حسن و عشق اور ہجر و وصال کے مضامین کے علاوہ سماجی، اخلاقی اور تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ زر پرستوں اور سیاست بازوں پر طنز کے ساتھ خدمتِ خلق، امن و امان کا مسلک اپنانے پر اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔

بھرم عزیزوں کی الفت کا رہ گیا مضطر
ہزار شکر کہ ہم ان کو آزما نہ سکے

سرزمین وطن مضطر کو کتنی عزیز ہے، حبِ وطن کا اظہار اس شعر میں ملاحظہ ہو

میں اس فخرِ جہاں ہندوستاں کا رہنے والا ہوں
کہ جس کی سرزمین خلدِ بریں معلوم ہوتی ہے

صوفیانہ خیالات، معرفت، روحانیت، حب الوطنی اور سیاست کے نمونے بھی ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

یہ ماجرا بظاہر و باطن عجیب ہے
جتنا وہ ہم سے دور ہے اتنا قریب ہے

شاعری کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جو محبت کی زبان کو سمجھتا ہے۔ جو اس سے بے بہرہ ہے وہ شاعری کا قدرداں نہیں ہو سکتا۔

تیرے دل میں دردِ الفت کی نہیں بے تابیاں
تو اگر سمجھے تو کیا سمجھے زبانِ شاعری
میں کسی کے عشق میں کرتا ہوں آہ و زاریاں
میرے نالوں پر جہاں کو ہے گمانِ شاعری

یہ بات تسلیم شدہ رہی ہے کہ شاعری، خاص طور پر اردو غزل، عشق و محبت کے گرد گھومتی ہے۔ اردو غزل میں محبوب کے حسن و جمال کی خوب تعریف کی جاتی ہے۔ زندگی میں محبوب کے وجود کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ ان جذبات و کیفیات کی عکاسی مضطر کے متعدد اشعار میں ملتی ہے۔

مے میں ہے وہ سرور نہ مستی شراب میں
جو کیفیت کا رنگ ہے تیرے شباب میں
جمالِ یار کے جلوے کی تاب لا نہ سکے
ہزاروں شوق پہ بھی ہم نظر اٹھا نہ سکے
فلک پر چاند اور تاروں میں تجھ کو بارہا ڈھونڈا
سنا تھا رہ گزر تیری رہی ہے کہکشاں برسوں

دوستوں سے جدائی کا غم عجیب ہوتا ہے، احباب کے بغیر زندگی بے مزہ رہ جاتی ہے، تنہائی کا احساس ستاتا ہے۔ جس کو مضطر کے کلام میں بہ کثرت پایا جاتا ہے۔

کس دیس میں جاکر وہ آباد ہو گئے ہیں
یارانِ رفتگاں کا کوئی پتہ بتائے
ترے بغیر گلوں پر کوئی نکھار نہیں
جو تو نہیں تو گلستاں میں بھی بہار نہیں

ہر شخص کی برائیوں کو نظر انداز کر کے اس کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں، ان کے نزدیک دنیا محبت کے سہارے قائم ہے۔ محبت کا جذبہ نہ ہو تو انسان آپسی جھگڑوں سے تباہ ہو جائیں۔ مضطر کے اشعار اس حقیقت کا آئینہ ہیں کہ خدا کی رحمت کے حقدار وہی انسان ہیں جو دوسرے انسانوں سے حسنِ سلوک کرتے ہیں۔

تاثیرِ ضبطِ شوق برنگِ دگر ہوئی
دنیا مرے سکون کی زیر و زبر ہوئی

امن پسندی اور صلحِ کل کا پیغام مضطر کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ ہم وجودیت کا خیال مختصر اور دلکش انداز میں کس قدر موثر پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔

غیر کا بھی چمن رہے آباد
مرے گلشن میں بھی بہار آئے

ان کے کلام میں صنعتِ تضاد، تلمیحات، رعایتِ لفظی کے بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ سہلِ ممتنع اور رنگِ تغزل مضطر کی شاعری کا خاصہ ہیں۔

پانا ترا حصولِ سعادت سے کم نہیں
کھونا ترا نزولِ قیامت سے کم نہیں
زاہد خیالِ وعدۂ حور و قصور چھوڑ
دنیا بغور دیکھ کہ جنت سے کم نہیں
ہمیں مار ہی ڈالا اس بے وفا نے
کبھی اس بہانے کبھی اس بہانے

مضطر کا مسلکِ حیات محبت ہے۔ ان کی طریقت، خلقِ خدا کی خدمت، ان کی زندگی شرافت کے کردار اور فضائل اخلاق کی راہوں سے ہو کر گزری ہے۔ ان کے متعدد اشعار معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی اقدار کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے کلام میں احساسِ حسن کی اس قدر فراوانی ہے کہ وہ حسن کی ضیا باریوں سے فیضیاب ہونے کے لیے ایک، دو تین نہیں بے شمار دل خدا سے مانگتے ہیں۔

مجھ سے نظر ملی تو حیا اور بڑھ گئی
سمٹے وہ اس طرح کہ ادا اور بڑھ گئی

مضطر کی شاعری سے گزرنے پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ صلحِ کل کے آدمی ہیں۔ ان کے مطابق انسانیت سے حقیقی محبت ہی بندگی ہے۔

خدمتِ خلق سے ملے گا خدا
بندگی سے خدا نہیں ملتا

مذہب کے نام پر لڑائی جھگڑا کرنے والوں پر گہری چوٹ کرتے ہیں۔ ایسے اشعار ان کی شاعری میں کثرت سے ملتے ہیں جن سے انسان کو اخلاقی اقدار اپنانے اور زندگی میں درپیش مصائب و حوادث سے نبرد آزما ہونے کا درس ملتا ہے۔ وہ اپنے کلام کو ابتذال اور بازاری پن سے پاک رکھنے کی کوشش میں نظر آتے ہیں قاری کے دل میں مشکلات کے باوجود ہنستے ہنستے جینے کی امنگ پیدا ہو جاتی ہے۔

شب کی تاریکیوں سے مت گھبرا
ظلمتوں میں بھی نور ہوتا ہے

متذکرہ حقائق کے باوجود حیرانی کی بات ہے کہ مضطر جیسا پختہ گو دلپذیر اور استادانہ خوبیوں کا حامل شاعر ادبی تاریخ سے کس طرح اوجھل رہا۔ ان کی شاعری پر بہت کم ناقدانِ سخن نے توجہ مبذول فرمائی۔ ان کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے صدر انجمن ترقی اردو (امرتسر) جناب پریتم سنگھ نصرت نے کہا تھا:

"مضطر صاحب ایک کہنہ مشق اور پختہ کلام غزل گو شاعر ہیں ان کے کلام میں خیال کی پاکیزگی اور بیان کی صفائی پائی جاتی ہے... ان کے شعر میں خیال کی برجستگی، بندش کی چستی اور خیالات کی پاکیزگی ملتی ہے اور اس میں حد سے بڑھا ہوا چنچل پن اور شوخی کہیں نظر نہیں آتی بلکہ ایک سبک خرام متانت، ایک خوش گوار تامل اور ایک دل آویز اخلاقی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔"

(مضطر مشاہیر کی نظر میں)

مضطر کا مسلکِ حیات محبت ہے۔ ان کی طریقت، خلقِ خدا کی خدمت، ان کی زندگی شرافت کے کردار اور فضائلِ اخلاق کی راہوں سے ہو کر گزری ہے۔ ان کے متعدد اشعار معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی اقدار کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے کلام میں احساسِ حسن کی اس قدر فراوانی ہے کہ وہ حسن کی ضیا باریوں سے فیضیاب ہونے کے لیے ایک، دو تین نہیں بے شمار دل خدا سے مانگتے ہیں۔ کتنا انوکھا خیال ہے۔

دے ایک دو نہ تین مگر بے شمار دل
اک اک حسیں پہ اے خدا مر مر کے دیکھ لوں

عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی کا ایک زینہ خیال کیا جاتا ہے، صوفیائے کرام نے عشقِ حقیقی کو طالب و مطلوب، عابد و معبود کے تعلقات کا اظہار جنسی محبت کے رنگ میں کیا ہے۔ مضطر بھی عشقِ مجازی کے ذریعے عشقِ حقیقی کی طرف پرواز کرنا چاہتے ہیں۔

دلوں کو دردِ محبت سے آشنا کر کے
مسرتوں کے خزانے لٹا دیے تو نے
سرِ نیاز کو سجدے کی اک تڑپ دے کر
عقیدتوں کے تقاضے بڑھا دیے تو نے
تلاشِ حق میں بشر کی سہولتوں کے لیے
مشاہدات کے پردے اٹھا دیے تو نے

متذکرہ بالا کی روشنی میں ضرورت اس بات کی ہے کہ پختہ مشق شاعر رام رتن مضطر کی حیات و خدمات کو پیش کرتے ہوئے ان کے فکر و فن کا اور گہرائی و گیرائی سے تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے۔ تاکہ اردو شاعری کے ذریعے روایت کی حفاظت کرنے والے اس شاعر کے شعری سرمایے کو محفوظ کر کے ادبی دنیا کے سامنے رکھا جا سکے اور مضطر کے کلام کی مختلف جہات کو تلاش کیا جا سکے اور تحقیق و تنقید کے ذریعے نئے گوشے سامنے لا کر ان کی مجموعی شاعری سے متعلق رائے کا اظہار اور نظریات کا تعین صحیح اور واضح طور پر ہو سکے۔ بلاشک مضطر نے اپنے دور میں بڑی محنت اور جانفشانی سے غزل کے گیسو کو سنوار کر اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی۔

ہر چند زندگی میں نشیب و فراز تھے
عزم و عمل سے راستہ ہموار ہو گیا

■

Dr. Rahman Akhtar
Assistant Prof. Dept of Farsi, Urdu & Arabi
Punjabi University
Patiala - 147002 (Punjab)

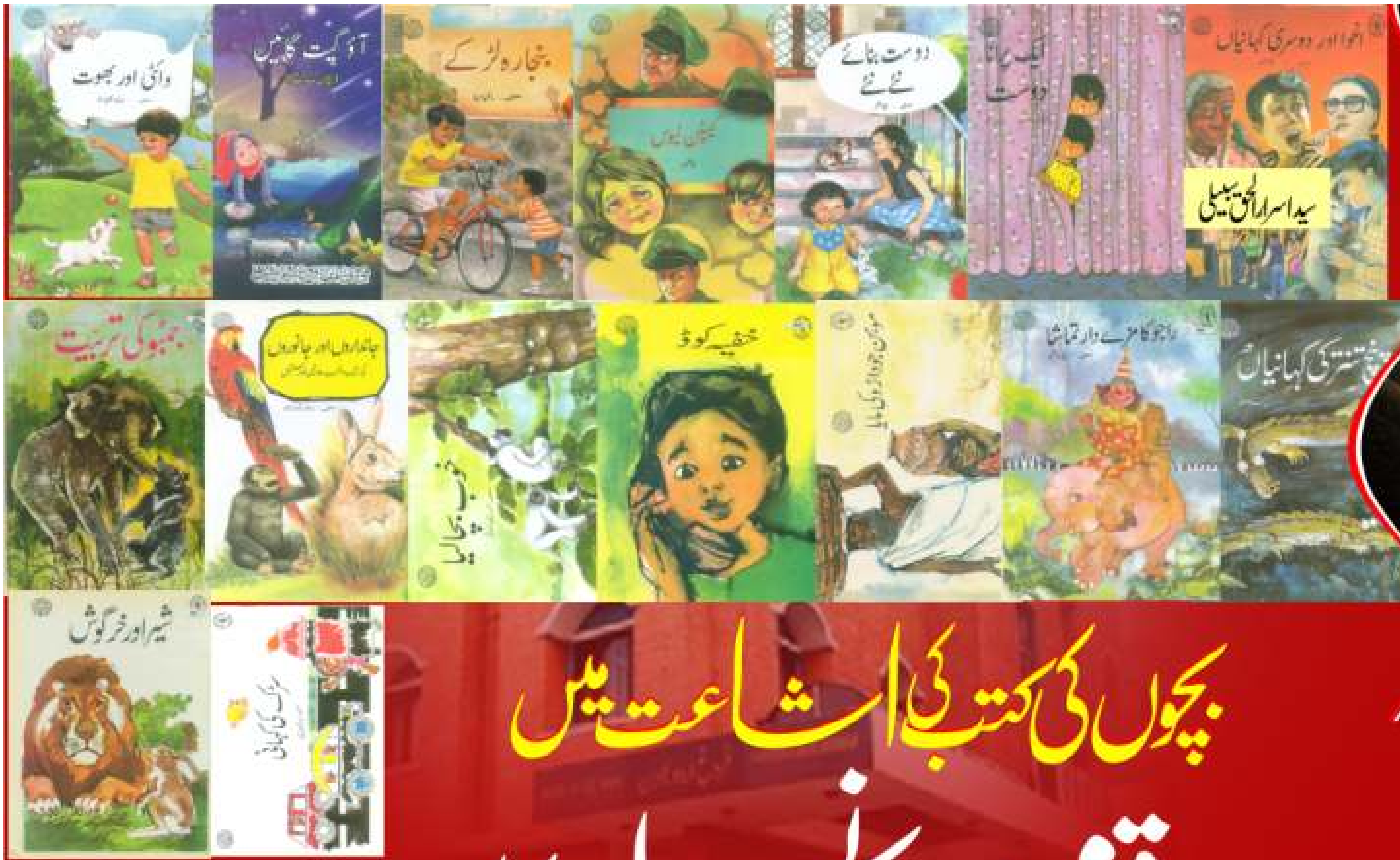

سید اسرار الحق سبیلی

بچوں کی کتب کی اشاعت میں قومی اردو کونسل کا حصہ

تعلیم و تربیت اور شوق مطالعہ کو فروغ دینے کا بہترین زمانہ بچپن کا ہے، اگر بچوں کو بچپن میں ان کے شوق اور پسند کے مطابق کتب دستیاب ہو جائیں تو بچے خود بخود کتابوں کی طرف لپکیں گے، اور انھیں کتب بینی اور کتابوں سے مراجعت کی ترغیب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جو بچے اپنی مادری زبان کے ادب سے دل چسپی لیتے ہیں، اور کتب و رسائل کا پابندی سے مطالعہ کرتے ہیں، ان کے لیے دیگر علوم وفنون کی تعلیم آسان ہو جاتی ہے، اور ایسے بچے آگے چل کر بہت ترقی کرتے ہیں، وہ اچھے شاعر، ادیب مصنف، مورخ، فلسفی، ماہر معاشیات، سائنس داں، سماجی خدمت گار، ڈاکٹر، انجینئر، مقرر، صحافی اور قائد وغیرہ بنتے ہیں۔

بچوں کا ادب شائع کرنے کی ذمے داری اس زبان کو فروغ دینے والے اداروں اور انجمنوں پر عائد ہوتی ہے، ان اداروں کو چاہیے کہ وہ ادیبوں اور شاعروں کو ادب تخلیق کرنے کے لیے فارغ کر دیں، ان کو کتابت، طباعت اور تجارت کی فکر سے آزاد رکھیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ملک میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کئی اہم ادارے قائم ہوئے جنھوں نے بچوں کی ادبی کتب کی اشاعت کا مقدس فریضہ انجام دیا ہے، آزادی سے پہلے دارالاشاعت پنجاب، پنجاب بک ڈپو، فیروز سنز لاہور، شیخ غلام بک ڈپو لاہور، ماہ نامہ پھول لاہور، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، انڈین پریس الہ آباد، عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن، اشاعت اردو حیدرآباد دکن، نئی کتاب گھر نئی دہلی، خواجہ حسن نظامی اشاعتی ادارہ نئی دہلی، سنگم کتاب گھر دہلی اور کتابی دنیا نئی دہلی وغیرہ نے بچوں کی کتب کی نشر و اشاعت میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

آزادی کے بعد کھلونا بک ڈپو نئی دہلی، ماہنامہ کلیاں لکھنؤ، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، نرالی دنیا پبلی کیشنز، دہلی اور نہرو بال پستکالیہ نئی دہلی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

دور حاضر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، بچوں کا ادبی ٹرسٹ دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی، رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں، مکتبہ جامعہ و پیام تعلیم نئی دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی اور ادارہ الحسنات رام پور وغیرہ بچوں کی کتب کی اشاعت میں امتیازی مقام کے حامل ہیں۔ آج ہم قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی بچوں کے ادب سے متعلق مطبوعات کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی گزشتہ تقریباً چار دہائیوں سے دیگر علوم وفنون کے ساتھ بچوں کے ادب کی نشر و اشاعت میں سرگرم ہے۔ کونسل نے بچوں کی ادبی کتب کی اشاعت منصوبہ بند طریقے پر کی ہے، قومی کونسل نے بچوں کے ادب کی تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے لیے پورے ملک کے ممتاز اور پختہ کار اہل قلم، اسکالر اور محققین کا تعاون حاصل کیا ہے اور ان کے ذوق کے مطابق ان سے متعلقہ موضوعات پر پروجیکٹ تیار کرائے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کونسل کی مطبوعات میں بچوں کے ادب پر مشتمل ہمہ جہت موضوعات شامل ہیں، جیسے کہانیاں، ناول، ڈرامے، شاعری، سوانحی ادب، معلوماتی ادب، سائنسی ادب، سماجی ادب اور ریڈرس وغیرہ۔

بچوں کے ادب میں کہانیوں کا سب سے زیادہ ذخیرہ ہے، کونسل کی مطبوعات میں بھی یہ ذخیرہ کافی مقدار میں موجود ہے، بچوں کی کہانیوں کی بھی کئی قسمیں کی گئی ہیں جیسے: طبع زاد کہانیاں، مترجم کہانیاں، ماخوذ کہانیاں، لوک کہانیاں، اساطیری کہانیاں، مرتب کہانیاں اور تصویری کہانیاں وغیرہ۔

بچوں کو کتابوں اور علم و ادب سے دل چسپی پیدا کرنے کے لیے تصویری کہانیاں بہت مفید ہوتی ہیں، خصوصاً شیر خوارگی کے دور (پیدائش کا ڈھائی سال) اور ماقبل مدرسہ کا دور (ڈھائی یا پانچ سال) میں تصاویر کے ذریعے بچوں میں کتابوں سے دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے کیونکہ اس عمر میں بچے تحریر سمجھنے کے لائق نہیں ہوتے ہیں، تصویری کہانیوں کے ذریعے وہ حروف کی شناخت کرتے ہیں، اور دوسروں سے کہانی سن کر خود سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح بچپن سے انھیں عبارت فہمی کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ بیرونی ممالک میں شیر خوار بچوں کے لیے تصویری کتب تیار کی جاتی ہیں، ہمارے ملک میں پری پرائمری کے بچوں کے لیے تصویری کتب موجود ہیں۔

کونسل نے ترجمے کی وساطت سے بچوں کی تصویری کتب شائع کی ہیں جیسے: سونامی کا دوست، اشوک کی چتن، چڑیا اور راجا، پسند، ہاتھی اور پانی کی ٹنکیاں، بگلا اور کیکر، بوڑھا اور کوا، چنگو اور وائی اور بھوت وغیرہ۔

ان کہانیوں میں تصاویر کا حصہ غالب ہے، خوب صورت اور واضح تصاویر کی مدد سے بچوں کو کہانیوں کی تفہیم کرائی گئی ہے، تصاویر اتنی پرکشش ہیں کہ بچے ان کی طرف مائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، تصویری کہانیوں کے ترجمہ میں بلجیت سنگھ مطیر، عائشہ خاتون اور صدف زیدی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

قومی کونسل نے زیادہ تر مترجم کہانیاں شائع کی ہیں، طبع زاد کہانیوں کی تعداد کم ہے، طبع زاد کہانیاں لکھنے والوں میں مندرجہ ذیل کہانی نویس نمایاں ہیں:

صالحہ عابد حسین (انوبا اور کالا کنواں) اطہر پرویز (ایک دن کا بادشاہ)، نورالحسنین (گڈو میاں)، قاضی مشتاق احمد (بچی کہانیاں، نیا کلینڈر اور دوسری کہانیاں)، رام آسرا راز (دل چسپ کہانیاں)، ضمیر درویش (آدم زاد پری لوک میں)، اور منور بعفا (اڑنے والا گیدڑ، لمبو اور موٹو) وغیرہ۔ جب کہ گلزار نے سلسلہ وار انداز میں بچوں کی کہانیاں لکھی ہیں، جیسے: بوسکی کا پنچ تنتر حصہ اول تا پنجم، بوسکی کی گنتی، بوسکی کا کوا نامہ، بوسکی کے گپیں، بوسکی کے کپتان چاچا، اور کڑوی کہانیاں۔

قومی کونسل نے انگریزی اور ہندی زبانوں سے کہانیوں کے تراجم کرا کے بچوں کے ادب کو مالا مال اور وسیع کیا ہے۔ اقوام کے درمیان سماجی، سیاسی، معاشی، علمی، فکری، ادبی اور تہذیبی رابطے میں ترجمہ کا بڑا دخل ہے، ترجمہ ہی کے وسیلے سے ایک قوم دوسری قوموں کی علمی، سماجی اور تہذیبی خصوصیات سے واقف ہوتی ہے، اور علمی و فکری ارتقا کا سفر طے کرتی ہے، بچوں کے مترجم کہانی نویس میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام نمایاں ہیں: ڈاکٹر اطہر پرویز، پروفیسر ظفر احمد نظامی، صفدر حسین، عتیق مظفر پوری، کلیم اللہ، انیس اعظمی، نجمہ نقوی، صفدر نقوی، خسرو متین، اقبال مہدی، سید پرویز، زاہدہ خاتون، شمیمہ بیگم، تسنیمہ زیدی، سید منصور آغا، سید شاہ ناز عباس، محمد علیم، پریم نارائن، کے پی رائے زادہ، ابن مجمدار اور مدونندن وغیرہ۔

ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کو ترجمہ معلوم نہ ہو، بلکہ طبع زاد معلوم ہو، کونسل کی تمام مترجم کہانیوں میں یہ خوبی موجود ہے 'بچوں کی کہانیاں' کے نام سے تسنیمہ زیدی نے سترہ مختلف مصنفین کی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ پہلی کہانی 'جہاز سے گر گیا' دسنتا مورتی کی ہے، کہانی کا ہیرو بھی بارہ تیرہ سال کا بچہ دسنتا ہے جو اپنے والدین سے ملنے پہلی مرتبہ سمندری جہاز سے تنہا سنگاپور جا رہا ہے۔ اکیلے پن میں بچہ جہاز کا کونہ کونہ چھان مارتا ہے، سمندری طوفان کا اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا، وہ جہاز کے عرشہ پر پانی کی موجوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، اسی دوران طوفانی ہچکولے کی وجہ سے ایک بیمار شخص جہاز سے سمندر میں گر جاتا ہے، دسنتا کپتان کو فوراً خبر کرتا ہے کپتان اپنے عملہ کے ذریعے اس آدمی کو زندہ حالت میں سمندر سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، کپتان بچے کو انعام میں ایک کھلونا جہاز دیتا ہے، کہانی کا اختتام ملاحظہ ہو:

''... میں جہاز اٹھا کر واپس جانے کے لیے مڑا تو کپتان نے پیار سے میرے گال تھپتھپائے۔''

وہ جہاز میں نے بڑے فخر سے سب کو دکھایا۔

دیکھیے کپتان صاحب نے مجھے کتنا خوب صورت تحفہ دیا ہے، میں نے خوش ہو کر کہا 'ہاں' سچ مچ بہت خوب صورت ہے، سب کا ایک ہی جواب تھا۔

جہاز پر اس دن یقیناً میں ہی سب سے زیادہ خوش انسان تھا۔'' (بچوں کی کہانیاں، 11)

ان مترجم کہانیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں لافانی سنسکرت شاہکار 'پنچ تنتر' اور پرانوں کی کہانیوں کے ترجمے بھی شامل ہیں، قابل مصوروں کی دیدہ زیب تصاویر سے مزین کہانیوں کو پڑھ کر بچے ماضی کی حسین دنیا میں کھو جاتے ہیں۔

عالمی ادب میں کچھ کتابیں ایسی لافانی اور شاہکار ہوتی ہیں، جن کا کوئی بدل نہیں ہوتا، ایسی کتابیں اخذ و ترجمے کے توسط سے پوری دنیا میں پڑھی جاتی ہیں، کونسل کی مطبوعات میں بچوں کے ادب سے متعلق ایسی کتابیں بھی ہیں، جو دوسری زبان سے اخذ و ترجمے کے واسطے سے شامل کی گئی ہیں، اور بچوں کے لیے حددرجہ مفید اور لائق مطالعہ ہیں، ان میں سعدی کی گلستاں و بوستاں، فردوسی کی شاہ نامہ، مولانا روم اور انوار سہیلی کی کہانیاں وغیرہ شامل ہیں۔

شیخ سعدی شیرازی کی منظوم کتاب 'بوستان' فارسی ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے، ان کا دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، علامہ شبلی نے بوستاں سے ماخوذ کہانیاں (بوستاں کی کہانیاں)، دل چسپ، آسان

عالمی ادب میں کچھ کتابیں ایسی لافانی اور شاہکار ھوتی ھیں، جن کا کوئی بدل نھیں ھوتا، ایسی کتابیں اخذ و ترجمے کے توسط سے پوری دنیا میں پڑھی جاتی ھیں، کونسل کی مطبوعات میں بچوں کے ادب سے متعلق ایسی کتابیں بھی ھیں، جو دوسری زبان سے اخذ و ترجمے کے واسطے سے شامل کی گئی ھیں، اور بچو ں کے لیے حددرجہ مفید اور لائق مطالعہ ھیں، ان میں سعدی کی گلستاں و بوستاں، فردوسی کی شاہ نامہ، مولانا روم اور انوار سھیلی کی کھانیاں وغیرہ شامل ھیں۔

اور وضاحت کے ساتھ لکھی ہیں، شیخ سعدی نے بوستاں میں محض واقعات بیان کرنے کے بجائے اس سے حاصل ہونے والے سبق اور عبرت و موعظت پر زیادہ زور دیا ہے، لیکن علامہ شبلی نے وضاحت کے ساتھ ان واقعات کو کہانیوں کے انداز میں کامیابی کے ساتھ پیش کیے ہیں، بوستاں کی کہانیاں اخلاقی بلندی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی ہیں۔

شیخ سعدی کی 'گلستاں' نظم و نثر کا حسین گلدستہ ہے، اس میں دنیا جہاں کی حکمت اور تجربے کی باتیں ہیں، افادیت کے اعتبار سے یہ بوستاں سے برتر ہے، امیر حسن نورانی نے 'گلستاں کی کہانیاں' کے نام سے گلستاں سے ماخوذ کہانیاں سلیس اردو میں پیش کی ہیں، انھوں نے گلستاں کے آٹھویں باب، جس میں زیادہ تر پند و نصیحت پر مشتمل کہانیاں ہیں، کا ترجمہ کیا ہے، اور آخر میں متفرق 'اچھی اچھی نصیحتیں' شامل کی ہیں، اس کتاب کے پڑھنے

سے بچوں کی سوجھ بوجھ اور تجربے میں اضافہ ہوگا، جو ان کی آئندہ زندگی میں مشعل نور ثابت ہوگا۔

بچوں کی کہانیوں میں لوک کہانیوں کو بہت اہمیت حاصل ہے، ان کے مطالعے سے پوری دنیا کے تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے، اور پوری دنیا ایک کنبے کی طرح نظر آتی ہے، 'ہماری لوک کہانیاں' کے مصنف پریم پال اشک کے مطابق ''اس وسیع وعریض، عظیم ملک کے لاتعداد عوام کو موتیوں کی ایک مالا کی طرح ایک لڑی میں پرونے کا سہرا ہماری لوک کہانیوں کے سر ہی بندھتا ہے۔ (مقدمہ ہماری لوک کہانیاں، 12)

لوک کہانیوں سے ہم دنیا کے قدیم، ہمہ رنگ تہذیب وتمدن، اخلاقی حالت، نفسیات، غور وفکر کا انداز اور ثقافتی تاریخ سے واقف ہوتے ہیں، لوک کہانیاں قدیم ہونے کے باجود اتنی دل چسپ اور رنگارنگ ہوتی ہیں کہ بچے ان میں کھوکر ماضی کی حسین وادیوں میں پہنچ کر خوشی و مسرت محسوس کرتے ہیں، اور ان کہانیوں سے محظوظ ہونے کے ساتھ ان میں چھپی ہوئی حکمت و مصلحت کی باتیں اور تجربات کو اپنے لیے مشعل راہ بناتے ہیں۔

قومی کونسل نے قابل مصنفین کے ذریعے نہ صرف ہندوستان اور ہندوستان کے جدید و قدیم جغرافیائی، سیاسی اور لسانی خطے، بلکہ تمام براعظموں بشمول یورپ، افریقہ نیز مصر اور عرب دیسوں کی لوک کہانیوں کو جمع کردیا ہے جن میں مندرجہ ذیل کہانیاں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے:

بھارت کی لوک کتھائیں: تین حصے (محمد قاسم صدیقی)

ایشیا اور یورپ کی کہانیاں (محمد قاسم صدیقی)

ہماری لوک کہانیاں (پریم پال اشک)

ہندوستان کی لوک کہانیوں کا خزانہ: دو حصے (مترجم خسرو متین)

عرب کی لوک کہانیاں (حسن عسکری کاظمی)

مصر اور شمالی افریقہ کی کہانیاں (محمد امین)

وسطی جنوبی افریقہ اور ملاگاسی کی مزیدار کہانیاں (محمد امین)

محمد قاسم صدیقی نے 'بھارت کی لوک کتھاؤں کو ستر تا اسی صفحات کے تین حصوں میں ازسر نو تحریر کیا ہے، پہلے حصے میں مختلف ریاستی زبانوں کی لوک کتھائیں ہیں، دوسرے حصے میں مختلف خطوں کی لوک کتھائیں ہیں، جبکہ تیسرے حصے میں مختلف قبائل میں رائج لوک کتھاؤں کو مرتب کیا گیا ہے، جیسے: گارو، ناگاؤں، کچھاری، سنتھال، میتھلی، کونگ، گڑھوالی، چنڈال، بھیل، گوڑ، کھاس اور

> ''
> **بچوں کی کہانیوں میں لوک کہانیوں کو بہت اہمیت حاصل ہے، ان کے مطالعے سے پوری دنیا کے تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے، اور پوری دنیا ایک کنبے کی طرح نظر آتی ہے، 'ہماری لوک کہانیاں' کے مصنف پریم پال اشک کے مطابق ''اس وسیع و عریض، عظیم ملک کے لاتعداد عوام کو موتیوں کی ایک مالا کی طرح ایک لڑی میں پرونے کا سہرا ہماری لوک کہانیوں کے سر ہی بندھتا ہے۔**
> ''

اودھ وغیرہ۔ کتھاؤں کی زبان آسان اور واضح ہے، جس کہانی سے جو سبق آموز نصیحت حاصل ہوتی ہے، وہ نہایت اختصار سے ایک دو جملوں میں بیان کردی گئی ہے۔

پریم پال اشک نے ہندوستان کی (26) ریاستوں کی لوک کہانیاں تقریباً پونے تین سو صفحات میں لکھی ہیں، ان کہانیوں میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ مہم جوئی، استاد کی فرماں برداری، والدین کی اطاعت، باہمی محبت، اتحاد، یگانگت، بھائی چارے، لالچ، ہوس اور بغض وعناد کے انجام پر روشنی پڑتی ہے۔

آندھرا پردیش کی کہانی 'راجہ کا سردرد' اجین کے راجہ وکرماجیت عرف راجہ بھوج کی کہانی ہے، ایک سفر کے دوران راجہ بکرماجیت نے ایک رشی کو دیکھا کہ وہ صبح سویرے ڈھیر سارا پانی پی رہا ہے، پوچھنے پر رشی نے بتایا کہ اس کی وجہ سے تن اور من دھل جاتے ہیں، اس کے بعد سے روزانہ راجہ کے کمرے میں ایک بھری صراحی رکھ دی جاتی ہے اور راجہ سویرے پورا پانی پی جاتا، جس سے اس کی طبیعت ہشاس بشاش رہتی، ایک دن صراحی میں مینڈک کا ایک بچہ چلا گیا، جو راجہ کے پیٹ میں پہنچنے کے بعد کلبلانے لگا، اور رینگتے رینگتے راجہ کے دماغ تک پہنچ کر پھنس گیا، جب کسی وید سے راجہ اچھا نہیں ہوا تو کیرل کے نامور وید دھنوتری کو خبر دی گئی، انھوں نے سب کو ہٹا کر راجہ کی کھوپڑی کا اوپری حصہ علاحدہ کردیا، وہاں مینڈک بے ہوش پڑا تھا، دھنوتری بڑی الجھن میں تھے کہ کسی نے پردہ کے پیچھے سے پھسپھایا، راجہ کے سر کے پاس پانی کی چلمچی رکھ دو، وید نے یہ اچھی تدبیر اپنائی اور ہاتھ سے پانی میں چھپ چھپ کرنے لگے، مینڈک فوراً ہوش میں آکر چلمچی میں کود گیا، وید نے راجہ کی کھوپڑی جوڑ کر مرہم کا لیپ اس طرح لگادیا کہ جراحی کے تمام نشانات مٹ گئے، اور بادشاہ بالکل صحت مند ہوگیا، پردے کے پیچھے پھسپھسانے والے شاعر اعظم کالی داس تھے، اس کہانی سے راجہ بکرماجیت کی علم وداب نوازی کے علاوہ اس دور کے علم طب وجراحت کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔

لوک کہانیوں کی طرح اساطیری اور روایتی قصے کہانیاں ہمارے معاشرے میں سنی سنائی جاتی ہیں، یہ بھی پریوں کی داستانوں پر مشتمل ہوتی ہیں، کبھی بہادر شہزادہ اور شہزادی کے حیرت انگیز کارنامے اور مہم سر کرنے کے واقعات شامل ہوتے ہیں۔ ایسی کہانیوں میں حقیقت اور تخیل کی آمیزش ہوتی ہے، ان کہانیوں سے بچوں کی تخیل آفرینی کی تربیت ہوتی ہے، ان میں ایمان داری، بہادری، صبر وتحمل، مسائل سے نبرد آزما ہونے، سخت محنت اور جدوجہد کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، اور باطل، جھوٹ اور ظلم سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز نے 'الف لیلہ' کے کئی قصوں کو ازسر نو تحریر کیا ہے، اس سلسلے میں ان کی کتاب 'مشینی گھوڑا' اور 'ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ' قومی کونسل نے شائع کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسکندریہ میں ایک نائی اور ایک رنگساز تھا، دونوں گہرے دوست تھے، دونوں کی دکان آس پاس تھی، لیکن رنگساز بڑا دھوکے باز اور کام چور تھا، رفتہ رفتہ رنگساز کا کاروبار چوپٹ ہوگیا، نائی نے رنگساز کی مدد کی، اور اس کو اپنے ساتھ رکھنے لگا، لیکن جب نائی کا کاروبار بھی خراب ہونے لگا، تو دونوں دوستوں نے دوسرے شہر جانے کا فیصلہ کیا، دوسرے شہر میں دونوں کا کاروبار خوب چکا، لیکن رنگساز نے اپنی غداری کی عادت نہیں چھوڑی، دوست سے غداری کے جرم میں رنگ ساز کو قتل کردیا گیا، جس وقت نائی مال و دولت کے ساتھ اسکندریہ کی بندرگاہ پر پہنچا، اسی وقت رنگساز کی لاش بورے میں بندھی ہوئی وہاں پہنچی، نائی نے رنگساز کو اپنے ہاتھ سے دفن کیا، اس کے بعد ایک زمانے تک رنگساز صاف ستھری اور خوشحال زندگی گزارتا رہا، جب وہ مرگیا تو اس کو بھی لوگوں نے ابوفیر کے بازو میں دفن کردیا، یہ اور دیگر تمام قصے تفریحی اور اخلاقی اعتبار سے بچوں کے ادب کا قیمتی اور لافانی سرمایہ ہیں۔

قومی کونسل نے بچوں کے لیے ناول بھی شائع کیے ہیں، قدیم ناولوں میں نصوح کا خواب (ڈپٹی نذیر احمد) اور شریف زادہ (مرزا ہادی رسوا) جن کے مرتب حفیظ عباسی ہیں، اور فسانۂ عجائب (رجب علی بیگ) شامل ہیں، جن میں آخرالذکر کو عشقیہ داستان کی بنا پر بچوں کے ناول میں شمار نہیں کیا جاسکتا، حیرت ہے کہ کس کے حسن انتخاب کی بنا پر اسے بچوں کے ناول میں شمار کیا گیا؟ اور ماہ

نامہ 'بچوں کی دنیا' میں سلسلہ وار مع تصاویر شائع کیا گیا؟

انگریزی سے ترجمہ شدہ دو ناول بھی شائع کیے گئے ہیں: گُلسم (مترجم ظفر احمد نظامی)، (2) ادتیہ، سمندری لڑکا (مترجم نامی انصاری) دونوں ناول بچوں سے متعلق ہونے کے باوجود نامانوس فضا اور اسلوب کی بنا پر بچوں میں قبولیت حاصل کرنے سے محروم رہے ہیں، البتہ دورِ حاضر میں بچوں کے معروف ناول نگار وکیل نجیب کے تین ناول بھی کونسل نے شائع کیے ہیں: (1) بے زبان ساتھی (2) جانباز ساتھی (3) خطرناک راستے۔ واضح ہو کہ وکیل نجیب (پ: 1946) اب تک اٹھارہ سے زائد ناول لکھ چکے ہیں، جو کئی اداروں سے شائع ہوئے ہیں۔

'جانباز ساتھی' وکیل نجیب کا ایک اہم مہماتی ناول ہے۔ پوری کہانی مہماتی کارناموں، خطرناک مقابلوں اور جاں بازی کے کاموں سے پر ہے، مہماتی اعتبار سے وکیل نجیب کا یہ سب سے اچھا ناول ہے، زبان و بیان اور فنی خوبیوں سے مالا مال ہے، جنگل، بیان اور دیہاتوں کی دل فریب منظر کشی کی گئی ہے اور مہماتی سرگرمیوں کو بڑی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔

کونسل نے بچوں کے لیے کئی ڈرامے بھی شائع کیے ہیں، جن میں مندرجہ ذیل ڈرامے اہمیت کے حامل ہیں: (1) بکری دو گاؤں کھا گئی (2) عقل مند مچھیرا اور دوسرے ڈرامے (3) بچوں کے ڈرامے۔ پہلے اور دوسرے ڈرامے م۔ ندیم کے ہیں، جبکہ تیسرے کے ڈرامہ نگار اظہر افسر ہیں، اظہر افسر ایک عرصے تک آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے وابستہ رہے ہیں، انھوں نے اپنے ڈراموں کے مجموعے 'بچوں کے ڈرامے' کے کئی ڈراموں میں بچوں کو سماجی اور اخلاقی قدروں کا نمونہ پیش کیا ہے، جیسے: چنانچہ، ننھی سی لڑکی، شکریہ، مچھلی کا شکار اور محنت کا پھل وغیرہ۔

ڈرامہ 'چنانچہ' مزاح کے ساتھ اخلاقی اعتبار سے اہم ڈرامہ ہے، ایک بھائی اور بہن جن کی عمریں بارہ اور دس سال ہیں، عمدہ لباس زیب تن کر کے دعوت میں جا رہے تھے، راستے میں ایک بچہ ندی میں گر گیا، لڑکے نے پانی میں جا کر بچے کو نکال لیا، لیکن اس کے کپڑے اور شیروانی بھیگ گئی، اس کی گھڑی بھی خراب ہو گئی، آیا آ کر اس بچے کو لے گئی۔ اس نے شکریہ کا ایک لفظ بھی نہیں کہا، بچے نے اپنے والدین سے سارا واقعہ بیان کیا، بچے کے والد لڑکے کا شکریہ ادا کرنے آئے، لڑکے نے کہا: اس میں شکریہ کی کیا بات ہے، میں نے اپنا فرض ادا کیا، اظہر افسر کے ڈرامے بچوں کے لیے غیر معمولی کشش رکھتے ہیں۔

م۔ ندیم کو مزاح سے دل چسپی ہے، وہ اپنی کہانی اور ڈرامے میں مزاح کو بڑے سلیقے سے شامل کرتے ہیں، ان کے ڈرامے: چوہے مارو، کھوئی ہوئی غزل اور بکری دو گاؤں کھا گئی، طنز و مزاح سے بھرپور ہیں، بہت سے ڈرامے سبق آموز بھی ہیں، جیسے: مہمان اور ڈاکو وغیرہ۔

ڈرامہ 'کھوئی ہوئی غزل' میں شاعر بے بدل صاحب نے رات بھر جاگ کر ایک غزل کاغذ پر لکھ کر تکیے کے نیچے رکھ لی، صبح میں وہ کاغذ نہیں ملتا ہے۔ بے بدل صاحب بہت پریشان ہو جاتے ہیں، دھم سے چارپائی پر بیٹھ کر سر پکڑ لیتے ہیں، ہائے میری غزل، اگر غزل نہ ملی تو میرا دم نکل جائے گا، وہ اپنے بچوں سے پوچھتے ہیں، بچے بکری کے منھ سے کاغذ چھین کر والد کو دکھاتے ہیں، جب تک بکری آدھی غزل صاف کر چکی ہوتی ہے۔ اسی طرح ڈرامہ 'بکری دو گاؤں کھا گئی' میں بکری کی وجہ سے کریم کسان نیم پاگل ہو جاتا ہے، ہائے بکری وجہ سے کھا گئی، بادشاہ سلامت نے دو گاؤں دینے کا وعدہ کیا تھا، وہ ایک بار جنگل میں پیاسے راستہ بھٹک گئے تھے، میں نے ان کو بکری کا دودھ پیش کیا تھا، جنگل میں قلم دوات کہاں، انھوں نے ایک پتے پر تنکے سے اپنا نام لکھ کر دیا تھا، وہ پتا بکری کھا گئی، کریم رامو کی مدد سے شہر جاتا ہے، ایک پڑھے لکھے شخص سے عرضی لکھوا کر بادشاہ کے دربار میں بھیجتا ہے، بادشاہ کو اپنا وعدہ یاد آ جاتا ہے، بادشاہ کا سپاہی بادشاہ کا خط لے کر کریم کے گھر جاتا ہے، دو گاؤں مل جانے پر بے چارے کریم کی بے تابی ختم ہو جاتی ہے۔

> ”ادب کا مقصد دل چسپ و دل نشین اندازمیں بچوں کے ذوق مطالعہ کی تسکین اور ان کی شخصیت کی ہمہ جہت تعمیر و ترقی اور تہذیب ہے یہ مقصد محض شعری و افسانوی ادب سے پورا نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس میں معلوماتی ادب کو شامل نہ کیا جائے ، کونسل نے معلوماتی ادب پر تقریباً سو کتابیں شائع کی ہیں، جنھیں سائنسی، سماجی اور عام معلوماتی ادب کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔“

قومی کونسل نے بچوں کے سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، ملک کے تقریباً (35) سماجی بزرگ، سیاسی رہ نما، نامور حکمراں، شاعر، ادیب، مصلح اور فلسفی کی زندگی کے اہم گوشوں اور خاکوں سے بچوں کو متعارف کرایا ہے، جیسے: گاندھی جی، نہرو، راجہ رام موہن رائے، سرسید، سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر راجندر پرشاد، نور جہاں، میر عثمان علی خاں، اقبال، اکبر الہ آبادی، پریم چند، محمد حسین آزاد، حالی، رتن ناتھ سرشار اور خواجہ میر درد وغیرہ۔ ان کتابوں کے مطالعے سے بچوں کو اپنے بزرگوں اور اسلاف سے عقیدت و محبت پیدا ہوگی۔ اور ان کے روشن کارناموں کو بچے اپنی آئندہ زندگی میں مشعلِ راہ بنائیں گے، چناں چہ محمد حسین آزاد کے بارے میں نند کشور وکرم نے لکھا ہے:

”ان کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے وسیع القلب واقع ہوئے تھے، ان کے دل میں ہندو مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی، اور وہ ہر ایک سے مساوی سلوک کرتے تھے۔“ (نند کشور وکرم: محمد حسین آزاد، 26)

ادب کا مقصد دل چسپ و دل نشیں انداز میں بچوں کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین اور ان کی شخصیت کی ہمہ جہت تعمیر و ترقی اور تہذیب ہے یہ مقصد محض شعری و افسانوی ادب سے پورا نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس میں معلوماتی ادب کو شامل نہ کیا جائے، کونسل نے معلوماتی ادب پر تقریباً سو کتابیں شائع کی ہیں، جنھیں سائنسی، سماجی اور عام معلوماتی ادب کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

سائنسی ادب کے مصنفین میں ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، محمد خلیل، قیصر سرمست اور انیس اعظمی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں، جبکہ سماجی ادب میں غلام حیدر، اطہر پرویز، محمد شمس الحق، صفدر حسین، یوسف کمال، نجمہ نقوی اور رام پرکاش راہی وغیرہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

سیما پرویز نے 'آرٹ کی کہانی' میں بچوں کو آرٹ اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں بنیادی معلومات دل نشیں انداز میں فراہم کی ہیں، آرٹ کے موضوع پر یوں بھی بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں، اور اردو زبان اور بچوں کے لیے تو نہ کے برابر ہیں، اس کتاب میں آرٹ کی ابتدا سے لے کر نشاۃ ثانیہ اور دورِ جدید تک آرٹ کے سفر کی کہانی، پینٹنگ کے مختلف اسکول، دنیا کے بڑے فن کار اور آرٹ کے تکنیکی عمل کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے، نیز علامتی تصاویر، مصوری میں قدرتی مناظر اور جمالیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

سید شہاب الدین دسنوی کی کتاب 'کیمیا کی کہانی' قومی کونسل سے پہلی مرتبہ 1998 میں شائع ہوئی، 2009 تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس کتاب کا انتساب سکندر علی وجد کے نام اس شعر کے ساتھ کیا گیا ہے:

علم نے یوں تو بہت عقدۂ مشکل کھولے
راز گنجینۂ فطرت کے نہاں اور بھی ہیں

اس کتاب میں بعض عناصر کی دریافت کی دل چسپ داستان بیان کی گئی ہے، اس کا مواد روسی مصنف Nechay کی کتاب سے لیا گیا ہے، مصنف بچوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو دل چسپی سے پڑھیں گے، اور ان میں سائنس دانوں کا سا شوق پیدا ہوگا، اور ہوسکتا ہے کہ ایک دن وہ بھی کوئی نیا عنصر دریافت کرلیں، مصنف نے سویڈن کے رہنے والے کارل ولہیم شیل کی زندگی کے واقعات بیان کیے ہیں کہ نوجوانی میں وہ ایک دواساز کے یہاں ملازم تھا، دواؤں کو دیکھ دیکھ کر دواؤں کے بارے میں اسے جاننے کا شوق پیدا ہوا، وہ فرصت کے اوقات میں علم کیمیا کی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا، اور مطالعے میں اس قدر غرق ہوجاتا کہ کھانے پینے تک کی سدھ نہ رہتی، رفتہ رفتہ اس کی معلومات اتنی بڑھ گئی کہ اس وقت کے اچھے اچھے دواساز اور کیمیا داں بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے، مصنف نے مختلف کیمیادانوں کی محنت اور سچی لگن کے واقعہ بیان کرکے بچوں کے شوق مطالعہ کو ابھارنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔

شمس الاسلام فاروقی نے 'انوکھی پہیلی' کے نام سے اس کتاب میں ٹڈی سے متعلق معلومات کہانیوں اور پہیلیوں کے انداز میں بیان کی ہیں، انوکھی پہیلی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ سرما کی چھٹیوں میں بچوں کے پھوپھی زاد بھائی اور بہنیں بھی آگئیں، جیسے بچوں کی عید ہوگئی، قصے، کہانیاں اور لطیفوں کے ساتھ پہیلیوں کی بھی محفلیں جمنے لگیں، تو بچوں کے والد کو بھی ایک پہیلی سنانے کا شوق ہوا:

گھوڑے جیسا منہ ہے اس کا، مونچھیں جیسے ہرن کے سینگ، آنکھیں ہیں ہیرے کی کنیاں، پنکھ ہیں اس کے چیل سمان، ٹانگیں، اونٹ سے ملتی جلتی، گردن بیل کے جیسی ہے، سینہ بالکل بچھو جیسا، دم ہے اس کی سانپ سمان۔"

بچے اس پہیلی کو سن کر پانی پانی ہوگئے کیونکہ ان کے ابو کیڑوں کے ماہر تھے، کچھ قرینہ بتانے پر مشکل سے ٹڈا کہا، ابو نے کہا 'ٹڈا نہیں ٹڈی' امی نے اعتراض کرتے ہوئے کہا: "رہنے بھی دیجیے، ٹڈا اور ٹڈی سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ابو نے ٹڈا اور ٹڈی کا فرق بتایا، دہلی میں ٹڈی دل کا آخری حملہ 1962 میں دیکھا گیا اور ان کے انڈے ختم کرنے کی باقاعدہ تدابیر کرنے پر اب ٹڈی دل کے حملے اور قحط کے وبال سے دنیا محفوظ ہے، غرض ٹڈیوں سے متعلق یہ ایک دل چسپ اور لاجواب کتاب ہے۔

بچوں کے ادیب غلام حیدر نے 'خط کی کہانی'، 'اخبار کی کہانی' اور 'بینک کی کہانی' وغیرہ لکھ کر سماجی اور معاشی ترقیوں کی کہانیوں کے انداز میں بیان کرکے بچوں کو دل چسپ معلومات فراہم کی ہیں، ان کا خیال ہے کہ سائنسی ترقیوں کی گرما گرم خبریں تو اخبار کی زینت بنتی ہیں، بچوں کی سماجی اور معاشی ترقیوں کی کہانیاں بھی سنائی جائیں، جن کی وجہ سے آج ہم ترقی یافتہ انسان کہلاتے ہیں۔

> **غرض اس طرح کے رنگارنگ موضوعات و عنوانات پر قومی کونسل نے ساڑھے تین سو سے زائد کتابیں شائع کرکے بچوں کے ادب کی عظیم خدمت انجام دی ہیں. کونسل ماہ نامہ 'بچوں کی دنیا' اور سالانہ قومی اردو میلہ کا انعقاد عمل میں لاکر زبان اردو کو عام کرنے کی مخلصانہ کوشش جاری رکھے ہوئے ہے. ملک و بیرون ملک اردو داں طبقے کی ذمہ داری ہے کہ وہ نوخیز نسل کو ان کتابوں سے استفادہ کا موقع فراہم کریں.**

'بینک کی کہانی' میں انھوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری روزمرہ زندگی میں بینکوں کا کتنا بڑا حصہ ہے، ہم نے کب اور کیسے یہ اعتبار کرنا شروع کردیا کہ ہم اپنی دولت کو دوسروں کے پاس جمع کرادیں اور ان کے دیے ہوئے کاغذی وعدوں کو اپنی دولت سمجھتے رہیں۔ یہ ایک دل چسپ کہانی ہے اور انسانی ذہن کی ترقی کی ایک تصویر بھی ہے۔

ان کے علاوہ کونسل نے ریڈرس اور نصابی علوم کی (28) معاون درسی کتب شائع کی ہیں، اور این سی ای آر ٹی کی سات کتابوں کے ترجمے بھی کرائے ہیں، کونسل نے ادبی تنقید پر اطہر پرویز کی کتاب 'ادب کسے کہتے ہیں؟' اور زیب النساء بیگم کی اقبال اور بچوں کا ادب' بھی شائع کی ہیں۔

نثر کے علاوہ نظم میں کونسل نے مندرجہ ذیل کتب شائع کی ہیں۔ اچھی چڑیا (شفیع الدین نیر)، بچوں کی نظمیں (جگن ناتھ آزاد)، بے زبانوں کی دنیا (حیدر بیابانی)، حرف حرف نظم (وقار خلیل)، کٹھ پتلی ایک تماشہ (سطوت رسول)، ننھے منے گیت (کیدارناتھ)، دلکش نظمیں (ابرار کرت پوری) اور پھول مالا (سعادت نظیر) وغیرہ۔

'بے زبانوں' کی دنیا میں حیدر بیابانی نے جانوروں اور پرندوں کی زندگی، جنگل کے حالات، جانوروں کی خصوصیات، ان کے آپس کے تعلقات، ان کے مسائل وخطرات اور ان کے مزاحیہ کردار پر بڑی دل چسپ نظمیں لکھی ہیں، جیسے جنگل میں مشاعرہ، چوہے میاں کی شادی، گدھے کی نوکری، الیکشن، چالاکی خرگوش کی، چوہوں کی یونین، سیدھا سادہ گدھا، اور تعلیم بڑی نعمت۔

(122) صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ قومی کونسل سے پہلی اور دوسری مرتبہ 1994 اور 2004 میں شائع ہوا ہے، اس میں کئی طویل نظمیں بھی ہیں، لیکن دل چسپ اور مزاح سے بھرپور ہیں کہ اکتاہٹ کا سوال پیدا نہیں ہوتا، میری ناقص تحقیق کے مطابق حیدر بیابانی حالیہ عرصے میں بچوں کے معروف شاعر ہیں۔

سطوت رسول کی 'کٹھ پتلی ایک تماشہ' خالص تفریحی نظمیں ہیں، انھوں نے دیباچے میں لکھا ہے کہ ان کے بچپن میں گاؤں میں بہروپ کٹھ پتلیوں کا تماشہ دکھایا کرتا تھا، اپنی انگلیوں میں دھاگوں سے لپٹی ہوئی چھوٹی چھوٹی گڑیوں کو حرکت دیتا تھا، پردے کے پیچھے کھڑا ہوکر وہ مکالموں سے اس ناٹک کی رونمائی کرتا تھا، سطوت نے اس تماشے کو (21) نظموں میں منظوم کیا ہے، کٹھ پتلی کا تماشہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

ہوا سویرا سورج نکلا — کھیل ہوا اب کٹھ پتلی کا
گھر سے نکلی روپ بھرے — اک نیا بہروپ بھرے
ہونٹوں پر اس کے مسکان — ساتھ ہیں بچوں کے ارمان
بچوں کے سنگ کھیل کرے — پل میں روٹھے میل کرے
پیارے بچو شاد رہو — خوشیوں سے آباد رہو

تمام نظمیں بڑی دل چسپ، چست اور بچوں کی پسند کے مطابق ہیں، اور چھوٹے بچوں کو بہت بھاتی ہیں، آنکھ مچولی، کٹھ پتلی نے ناٹک کیا، کٹھ پتلی نے کرکٹ کھیلا، کٹھ پتلی نے کیا تماشہ، کٹھ پتلی نے تتلی پکڑی، کٹھ پتلی پکنک کو جائے، اور کٹھ پتلی اسکول گئی، کٹھ پتلی کے مختلف روپ ہیں، آخر میں کٹھ پتلی ڈولی میں بیٹھ کر سسرال چلی جاتی ہے۔

غرض اس طرح کے رنگارنگ موضوعات وعنوانات پر قومی کونسل نے ساڑھے تین سو سے زائد کتابیں شائع کرکے بچوں کے ادب کی عظیم خدمت انجام دی ہیں، کونسل ماہ نامہ 'بچوں کی دنیا' اور سالانہ قومی اردو میلہ کا انعقاد عمل میں لاکر زبان اردو کو عام کرنے کی مخلصانہ کوشش جاری رکھے ہوئے ہے، ملک و بیرون ملک اردو داں طبقے کی ذمہ داری ہے کہ وہ نوخیز نسل کو ان کتابوں سے استفادہ کا موقع فراہم کریں، اور مرعوبیت و احساس کمتری کے خول سے باہر نکل کر نئی نسل میں اپنی لسانی، علمی، ادبی اور تہذیبی وراثت منتقل کرنے کی سنجیدہ فکر و کوشش کریں، اور مادر مہربان اردو کو اس کا کھویا ہوا مقام دلائیں۔

■

Dr. Syed Asrarul Haque Sabeeli
Asst. Prof & Head Dept of Urdu
Govt Digree PG College
Siddipet - 502103 (Telangana)
Cell.:9346651710
Email.: syedasrarulhaque@gmail.com

'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ

قسط 3

ارشاد قمر

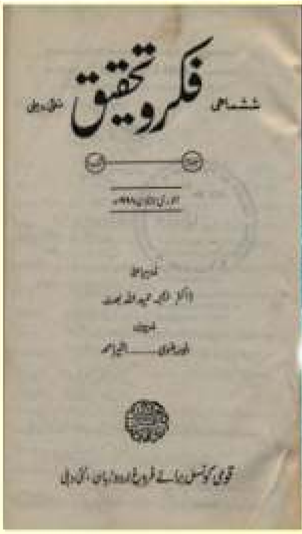

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ششماہی رسالے 'فکر و تحقیق' کا (جنوری تا جون 1998) ایک خصوصی شمارہ ہے۔ اس شمارے میں وہ تمام 31 مقالات شامل ہیں جو قومی اردو کونسل کے سمینار منعقدہ 17 تا 19 نومبر 1997 میں پیش کیے گئے۔ اس سمینار کا موضوع تھا 'نوآبادیاتی فکر کے منفی اثرات- اردو زبان و ادبی نظریات' پر۔ موضوع کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت پانچ اجلاسوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (1) ہندوستان کا متنوع لسانی پس منظر اور اردو زبان (2) اردو ادبیات میں ہندوستانیت کی شناخت (3) ہندوستانی کلاسیکی روایات کی بازیافت (4) مشترکہ تہذیب اور قومی زبان کا مسئلہ اور (5) عہد حاضر میں مشرقی علوم کی معنویت۔ اس شمارے میں شامل ان تمام مضامین کا توضیحی اشاریہ ملاحظہ ہو:

(1) ہندوستان کا متنوع لسانی پس منظر اور اردو زبان: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

ہر زبان کا اپنا ایک نظام ہے اور یہ نظام ہزاروں سال کے ارتقا سے بنا ہے۔ ہندوستان مختلف خاندانوں کی زبانوں کا ایک ایسا نگارخانہ ہے جس میں سارے عہد سمائے ہوئے ہیں چاہے وہ آریہ عہد ہو یا آج کا عہد۔ صدیقی صاحب نے اپنے اس قیمتی مقالے میں ان خفیہ پردوں کو ہٹایا ہے جس سے عام طور سے لوگ پہلوتہی برتتے ہیں۔

(2) اردو حروف تہجی اور دیوناگری رسم الخط (انگریزی): ڈاکٹر این۔ ایس گوریکر

ڈاکٹر این ایس گوریکر نے اپنے اس مقالے میں اردو زبان کی مختصر تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اردو کے حروف تہجی سے بھی بحث کی ہے اور ان نکات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کی طرف ہمارے بڑے بڑے ادبا نے خامہ فرسائی کی ہیں۔ گوریکر نے حروف تہجی کو دیگر زبانوں کے حروف تہجی سے مثالوں کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ایک کامیاب کاوش ہے۔

(3) ہندوستان کا متنوع لسانی پس منظر میں اردو (انگریزی): ڈاکٹر ایس جمال محمد

موصوف نے اپنے مقالے میں اردو کی صورت حال پر ایک تعارفی نوٹ پیش کیا ہے اور اردو کو کیا مسائل در پیش ہیں ان باتوں کی جانب بھی سامعین کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ پورے مقالے کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمال محمد نے مکمل شرح وبسط کے ساتھ ان مسائل کو منظر عام پر لانے کی حتی الامکان سعی کی ہے۔

(4) اردو خواں برادری کا لسانی رجحان (انگریزی): ڈاکٹر اے آر فتیحی

ڈاکٹر اے آر فتیحی نے اپنے اس انگریزی مقالے میں لسانی رویے اور اردو کے باہمی رشتوں پر ایک مفصل روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اس کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا ہے۔

(5) ہندوستان کا متنوع لسانی پس منظر اور اردو زبان: ڈاکٹر انور پاشا

ہندوستان نہ صرف کثیر اللسان ملک ہے بلکہ کثیر المذاہب اور کثیر التہذیب ملک ہونے کا بھی اپنے اندر ایک امتیازی وصف رکھتا ہے اور یہ اوصاف اس طرح ملی ہوتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میں ہندوستان اور ہندوستانیت کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ انھیں رموز و نکات کی جانب انور پاشا نے اشارہ کیا ہے۔

(6) ہندوستان کا متنوع لسانی پس منظر اور اردو زبان: جناب منظور الامین

زبان کے بارے میں ایک بات وثوق کے ساتھ جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ خواہ زبان کسی بھی ملک کی ہو، کسی بھی قوم کی ہو، زباں تو پھولوں کی داستان ہے کہ جن سے گلشن کی آبرو ہے، زبان تو تاروں کی چاندنی میں کھلا ہوا ایک آسمان ہے کہ جن سے راہوں میں روشنی ہے۔ انھیں ضوفشانی کی منظور الامین نے وضاحت کی ہے۔

(7) ہندوستان کا متنوع پس منظر اور اردو زبان: جناب ابوالفیض سحر

ہندوستان، جغرافیائی اور تہذیبی اعتبار سے کبھی بھی ایک لسانی یا ذولسانی وحدت نہیں رہا جیسا کہ دنیا کے بیشتر ممالک رہے ہیں۔ یہ رنگارنگی جہاں اس کی توانائی اور طاقت ہے وہیں کچھ پریشانیوں اور پیچیدگیوں کا باعث بھی ہے انھیں پیچیدگیوں کو موصوف نے اجاگر کرنے کی ایک سعی کی ہے۔

(8) اردو ادبیات میں ہندوستانیت کی شناخت: پروفیسر جگن ناتھ آزاد

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہندوستان کی ثقافت کی بنیاد مذہب اور مذہبی رواداری پر قائم ہے۔ ہندو دھرم اور بدھ دھرم دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آگئے کہ ان کی ہر چیز مشترک اور مساوی معلوم ہونے لگی۔ ان دو ملے جلے دھاروں میں تیسرا عظیم دھارا جو آکے ملا وہ اسلامی تہذیب کا دھارا ہے۔ انھیں شواہد کی جانب پروفیسر جگن ناتھ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔

(9) اردو ادبیات میں ہندوستانیت کی شناخت: جناب جمنا داس اختر

سامراجی طاقتیں جب کسی ملک پر قبضہ کر لیتی ہیں تو اس کی زبان اور کلچر کا صفایا کرنے کے لیے مختلف حربوں اور ہتھکنڈوں کا استعمال کرتی ہیں۔ جب انگریز اس ملک میں آئے تو اس بات کو دیکھ کر ہکابکا رہ گئے کہ یہ ملک نہ صرف دولت سے مالا مال ہے بلکہ اس کی زبانیں یوروپ کی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اس عظیم اثاثے کی طرف جمنا داس نے انگریزوں کی دلچسپیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

(10) اردو اور ہندوستانیت: پروفیسر محمد انصاراللہ

پروفیسر محمد انصاراللہ نے ان دو غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو عرف عام میں مشہور ہے کہ زبان اردو ایک کھچڑی زبان ہے۔ دوسرے یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے یہ زبان وجود میں آئی ہے۔

(11) اردو ادبیات میں ہنوستانیت کی شناخت (دکنی ادب کے حوالے سے): پروفیسر سیدہ جعفر

سیدہ جعفر صاحبہ نے اپنے اس بیش بہا مقالے میں دکنی ادب کے حوالے سے ادب اور زبان کی اہمیت اور ابتدا و ارتقا پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ دکنی ادب نے ہندوستان پر اپنے انمٹ نقوش کس طرح چھوڑے ہیں۔

(12) اردو افسانے اور ناول کا ہنوستانی کردار: محترمہ جیلانی بانو

محترمہ جیلانی بانو نے اردو زبان و ادب کو غیر ہندوستانی اور مخالف ہندوستانی سمجھنے اور سمجھانے کے عمل کو برطانوی نوآبادیاتی سامراج کے مفادات کا ایک حصہ قرار دیا ہے اور یہ آج بھی جاری ہے انھیں معاندانہ رویے کو اس مقالے میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔

(13) اردو ادبیات میں ہندوستانیت کی شناخت:

پروفیسر امیر عارفی

ہندوستانیت کی شناخت میں جہاں شعروادب کا حصہ رہا ہے وہیں اہم صوفیائے کرام کے عظیم کارناموں اوران کی شعری اورنثری خدمات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اس نکتے کی جانب امیر عارفی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

(14) اردو ادبیات میں ہندوستانیت کی شناخت (اردو فکشن کے تناظر میں): ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے اپنے اس مقالے میں ہندوستان کی رنگارنگی اور اس کی مختلف تہذیبوں اور رسم ورواج پر مکمل گفتگو کی ہے اور ہندوستان کی خصوصیات وامتیازات کو بحسن وخوبی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جن میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

(15) اردو ادبیات میں ہندوستانیت کی تلاش: جناب سہیل احمد فاروقی

جب ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہمیں ہندوستان میں عرب، ترک اور افغان نسلوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان نوواردوں اور یہاں پہلے سے آباد غیر مسلموں کے درمیان اختلاط وہم آہنگی کی ایک مشترک تہذیب دکھائی دیتی تھی اور یہ تہذیب تھی ایک آفاقی ضابطہ اخلاق کی۔ اسی آفاقیت سے روبرو کرایا گیا ہے۔

(16) ہندوستانی کلاسیکی روایات کی بازیافت: پروفیسر مغنی تبسم

اردو شعر و ادب میں روایت کی پابندی، روایت سے انحراف اورروایت کی بازیافت کا عمل مستقل جاری رہا ہے۔ ادب کے طالب علم اس کی کھوج میں اپنا سر کھپاتے رہے ہیں انھیں حقائق کی جانب مغنی تبسم نے اشارہ کیا ہے۔

(17) ہندوستانی کلاسیکی روایات: پروفیسر فضیل جعفری

پروفیسر فضیل جعفری نے اپنے مقالے میں ان باتوں کی جانب واضح طور پر اشارہ کیا بلکہ ہمیں اگر ہندوستان نامی جسم و جان کو پوری طرح چاق وچوبند اور وفعال بنانا ہے تو اس عمل میں دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ ساتھ کلاسیکی روایات کی بازیافت اور پھر بڑے پیمانے پر ان کی تشہیر ضروری ہے۔

(18) نوآبادیاتی فکر اور اردو کی ادبی و شعری نظریہ سازی: پروفیسر ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے اس مقالے میں ادبی تنقید اور شعری سرمایے کی تفہیم وادراک کو پرکھنے کی ایک بھرپور کوشش ہے اور جو مسائل تھے ان تمام کو بحسن وخوبی اپنے اس مضمون میں برتا ہے۔

(19) ہندوستان میں کلاسیکی روایات کی بازیافت: پروفیسر جعفر رضا

ہندوستانی کلاسیکی روایات کی بازیافت میں ہندوستانی نوآبادیت کے عوامل کو مدنظر رکھنا ضروری ہے تبھی ہم پورے پس منظر کو سمجھ پائیں گے۔ جعفر رضا نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان باتوں کا ذکر کیا ہے

(20) نوآبادیاتی فکر کے منفی اثرات اردو زبان اور ادبی نظریات پر: جناب سید اعظم حسین

جناب سید اعظم حسین نے اس مقالے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام اور اس کے اغراض ومقاصد پر مفصل بات کی ہے اور ساتھ ہی اس کمپنی نے ہندوستانیوں کا کس طرح استحصال کرکے اپنے مفاد کو برلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(21) مشترکہ تہذیب اورقومی زبان کا مسئلہ: جناب کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر نے اپنے مقالے میں ادیب اور زبان کے آپسی رشتوں سے متعلق جو ہم آہنگی ہوتی ہے اس پر مفصل گفتگو کی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا کہ کوئی بھی لفظ بذات خود اچھا یا کم حیثیت کا متحمل نہیں ہوتا بلکہ اسے ادیب یا شاعر اپنے نثری یا شعری کلام میں ڈھال کر اس کے حسن کو دوبالا کردیتے ہیں۔

(22) اردو مرثیہ میں ہندوستانی مشترکہ تہذیبی عناصر (کلام انیس ودبیر کے خصوصی حوالے سے): پروفیسر محمد زماں آزردہ

پروفیسر زماں آزردہ نے کلام انیس و دبیر کے خصوصی حوالے سے ان رموز اور پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیس ودبیر کے کلام میں صرف نوحہ گری ہی نہیں ہے بلکہ اچھے اخلاق و اطوار کی باتیں بھی ملتی ہیں۔

(23) مشترکہ کلچر اورقومی زبان (انگریزی): جناب نریندر لوتھر

جناب نریندر لوتھر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے اس مقالے میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت اور قومی زبان کے سلسلے میں بڑی اہم باتیں کہی ہیں۔

(24) مشترکہ ثقافت کا فکری پس منظر (ادبی حوالے سے): پروفیسر عبدالحق

عبدالحق نے مشترکہ ثقافت کے فکری پس منظر کو کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے کہ "تہذیب اعلیٰ اقدار کے ارتباط کا مجموعہ ہے، جس میں مذہب، معاشرت، فنون، آب وہوا اور علم وادب" وغیرہ شامل ہیں۔ ان باتوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے اس مقالے میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

(25) ہندوستان کی مشترکہ تہذیب فورٹ ولیم کالج اور اردو: پروفیسر نصیر احمد خان

نصیر احمد خاں نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب فورٹ ولیم کالج اور اردو کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے پورے پس منظر کو اپنے اس مضمون میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

(26) عہد حاضر میں مشرقی علوم کی معنویت: ڈاکٹر تنویر احمد علوی

تنویر احمد علوی نے عہد حاضر میں مشرقی علوم کی معنویت پر کم صفحات پر مشتمل اپنے مضمون میں کافی معلومات افزا اور تحقیقی باتوں کو سامنے لاکر عام اردو داں کو روشناس کرانے میں ایک اہم ذمے داری نبھائی ہے۔

(27) اردو کلاسیکی شعریات کی معنویت: پروفیسر حامدی کاشمیری

حامدی کاشمیری نے شاعری کے اصولوں اور شرطوں پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اردو کی کلاسیکی شعریات کی معنویت پر ایک اہم مضمون لکھا ہے اور ماضی سے آج تک کی روداد بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(28) عہد حاضر میں مشرقی علوم کے مطالعہ کی اہمیت و معنویت: پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی

عبدالودود نے عہد حاضر میں تمام علوم خاص کر مشرقی علوم کے مطالعے پر زور دیا ہے تاکہ اردو داں حلقے کے لیے جو پریشانیاں آتی ہیں اس سے نجات حاصل کرسکے جب تک مشرقی علوم کی واقفیت نہ ہوگی اس وقت تک صحیح اور درست اردو کا تصور محال ہے۔

(29) ہندوستانی فلسفہ وعلوم کی روایت اور اس کی معنویت: پروفیسر عتیق اللہ

پروفیسر عتیق اللہ نے مشرق ومغرب کے علوم وفنون پر ایک سرسری گفتگو کرنے کے بعد سیدھے ہندوستانی فلسفہ وعلوم کی جانب اپنا رخ کرتے ہوئے اوران تمام حقائق وشواہد کی بنیاد پر اس کی اہمیت ومعنویت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

(30) دور جدید میں مشرقی علوم وافکار کی معنویت: پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے اپنے اس مختصر سے مضمون میں مشرقی علوم وافکار کی معنویت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

(31) ہندوستانی کلاسیکی روایات کی بازیافت: ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی

سید مجاور حسین رضوی نے اپنے اس طویل مضمون میں روایت کی اہمیت وافادیت اور موجودہ دور میں اس کی کیا حیثیت ہے اس پر مفصل گفتگو کی ہے اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ روایت سے ہمارے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل حل ہوجاتے ہیں۔

■

Mr. Irshad Qamar
AB 452, First Floor, Amarpuri
Ram Nagar, Nabi Karim, Pahar Ganj
New Delhi - 110055

عثمانیہ یونیورسٹی کے صدور و سربراہان کا
مختصر تعارف

محمد ناظم علی

جامعہ عثمانیہ کو میر عثمان علی خاں آصف سابع نے 1917 میں قائم کیا۔ 1918 میں یونیورسٹی نے حیدرآباد کے مختلف مراکز و علاقوں میں درس و تدریس کا سفر شروع کیا۔ میر عثمان علی خاں نے عوام میں تعلیمی بیداری لانے کے لیے جامعہ عثمانیہ کو قائم کیا تھا۔ یہاں طب، قانون، میڈیسین، انجینئرنگ اور مختلف علوم و فنون کی تعلیم اردو میڈیم سے دی جاتی تھی۔ ایشیاء کی پہلی درسگاہ تھی جس میں دیسی زبان اردو میں تعلیم دینے کا رواج تھا۔ غیر منقسم ہندوستان میں اردو کے پہلے پروفیسر تھے وحیدالدین سلیم جو 1918 سے 1928 تک 11 سال شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو رہے۔ حیدرآباد کی علمی اور ادبی زندگی پر ان کی شخصیت کے نقوش بڑے گہرے ہیں پروفیسر سلیم عربی اور فارسی کے جید عالم اردو کے بلند پایہ صحافی، بہترین انشاپرداز اور بے مثال ماہر وضع اصطلاحات تھے۔ وضع اصطلاحات علمیہ ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ افادات سلیم اور افکار سلیم شعری مجموعے شائع ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ اور دائرۃ الترجمہ کی انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اردو علوم و فنون کی اساسی خدمات کہلانے کی مستحق ہیں۔

ڈاکٹر سید سجاد نے 1928 تا 1929، 1939 تا 1944 اور 1946 تا 1948 صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے خدمت انجام دی ہیں۔ نوطرز مرصع پر تحقیقی کام کر کے جرمن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر سید سجاد نے اردو اور انگریزی میں اپنے علمی کارنامے چھوڑے ہیں۔ انھوں نے انگریزی میں ہندی و آریائی فلسفہ اور تاریخ نثر اردو لکھی۔ علم زبان اور لفظی و معنوی تغیرات اور صوتیات پر مضامین تحریر کیے ڈاکٹر سجاد ماہر زبان، محقق اور اچھے مترجم تھے۔

مولوی عبدالحق کا شمار ان مقتدر شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو کی ترقی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے ان کے کارنامے ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں انھوں نے اردو کی بنیادیں مضبوط و استوار کی ہیں۔ رسالہ اردو کی ادارت انجام دی، لغت اور فرہنگ اصطلاحات کا کام انجام دیا۔ 1929 تا 1939 شعبہ اردو کے صدر رہے۔ انجمن ترقی اردو کے روح رواں بھی تھے۔ آپ نے اردو قواعد، اردو انگریزی لغت، وضع اصطلاحات، تراجم اور تحقیق و تنقید میں اضافہ کیا۔

مولوی عبدالحق کی مستقل کتابوں میں اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ، نصرتی مرحوم دہلی کالج، مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر، سرسید احمد خاں حالات و افکار، چند ہم عصر خطبات عبدالحق، تنقیدات عبدالحق، مقدمات عبدالحق اور اردو کا المیہ قابل ذکر ہیں۔ آپ کے وقیع اور وسیع کارناموں کے عوض آپ کو بابائے اردو کا خطاب دیا گیا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر وحیدالدین سلیم کے شاگردوں میں سے تھے۔ آپ نے 1929 میں لندن یونیورسٹی سے اردو کے آغاز و ارتقا اور ہندوستانی صوتیات پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی پھر

اردو شہ پارے، عہد عثمانی میں اردو کی ترقی، داستان ادب حیدرآباد، دکنی ادب کی تاریخ، ہندوستانی لسانیات، اردو کے اسالیب بیان، روح تنقید، روح غالب، تین شاعر حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، حیات میر محمد مومن، سرگذشت حاتم، سرگذشت غالب، گارساں دتاسی، گولکنڈے کے ہیرے، سیر گولکنڈہ، سیر طلسم تقدیر اور فسانہ تازیانہ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات، مثنوی طالب و موہنی، کلیات محمد قلی قطب شاہ، کیف سخن، بارہ سخن، فیض سخن، متاع سخن، معانی سخن، رمز سخن وغیرہ۔ غرض ڈاکٹر زور دکن کی تہذیب کی زندہ تاریخ تھے۔ دکنی تہذیب کے عاشق تھے۔

ڈی لٹ کے لیے پیرس گئے اور گجراتی فارم آف ہندوستان پر مقالہ لکھنا شروع کیا۔ مکمل نہ کر سکے۔ آپ 1944 تا 1946 صدر شعبہ اردو رہے۔ ڈاکٹر زور کا ایک بڑا کارنامہ ادارہ ادبیات اردو کا قیام ہے جو 1931 میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ انھوں نے قائم کیا۔ ایوان اردو جیسی خوب صورت عمارت تعمیر کروائی جو آج بھی اردو کی ترویج اور نشر و اشاعت کا اہم مرکز ہے۔ ڈاکٹر زور کثیر التصانیف و تالیف شخصیت کے مالک تھے۔ تاریخ، ادب دکنیات اور تنقید ان کا خاص موضوع تھا۔ دکنی ادب کی بازیافت میں ان کا اہم حصہ رہا ہے۔ ان کی تصانیف کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: جیسے تنقید، لسانیات، تاریخ و سوانح، افسانہ اور وضاحتی فہرست ہائے کتب وغیرہ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

اردو شہ پارے، عہد عثمانی میں اردو کی ترقی، داستان ادب حیدرآباد، دکنی ادب کی تاریخ، ہندوستانی لسانیات، اردو کے اسالیب بیان، روح تنقید، روح غالب، تین شاعر حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، حیات میر محمد مومن، سرگذشت حاتم، سرگذشت غالب، گارساں دتاسی، گولکنڈے کے ہیرے، سیر گولکنڈہ، سیر طلسم تقدیر اور فسانہ تازیانہ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات، مثنوی طالب و موہنی، کلیات محمد قلی قطب شاہ، کیف سخن، بارہ سخن، فیض سخن، متاع سخن، معانی سخن، رمز سخن وغیرہ۔ غرض ڈاکٹر زور دکن کی تہذیب کی زندہ تاریخ تھے۔ دکنی تہذیب کے عاشق تھے۔ ان کے دل و دماغ پر دکن کی چھاپ تھی۔ حیدرآباد کی نئی نسل میں تنقید و تحقیق کا ذوق و شوق پیدا کرنے میں ان کا کلیدی حصہ رہا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری عثمانیہ یونیورسٹی کے ان سپوتوں میں سے ہیں جو اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوئے اور محض اپنے ذاتی شوق اور محنت کے سہارے ترقی کرتے گئے۔ 1948 تا 1962 لگ بھگ 15 سال شعبۂ اردو کے صدر رہے۔ پروفیسر سروری نے لگ بھگ 20 کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں قابل ذکر: دنیائے افسانہ، دنیا کے شاہ کار افسانے، کردار اور افسانہ، قدیم افسانے، انگریزی چینی اور جاپانی افسانے، رات کا بھولا اور دیگر افسانے، جدید اردو شاعری، اردو مثنوی کا ارتقا، سراج اور اس کی شاعری، کلیات سراج، سراج سخن، اردو کی ادبی تاریخ، زبان اور علم زبان، مہتاب سخن، مراۃ الاسرار، دو بھائی دو ادیب، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، تاریخ ادبیات کشمیر پھول بن، تدوین، مثنوی قصہ بے نظیر مدون۔

سروری صاحب کو تاریخ ادب، اصناف ادب لسانیات، ادبی تذکرہ اور تنقید سے رغبت تھی۔

پروفیسر مسعود حسین خاں ماہر لسانیات و ماہر دکنیات مانے جاتے ہیں۔ 1945 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا پر پی ایچ ڈی کی اور 1953 میں پیرس سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ جون 1962 تا 1968 تک پروفیسر صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی رہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کے ادبی کارنامے مختلف موضوعات یعنی تحقیق، تنقید، لسانیات، ادب، لغت نویسی اور شاعری پر مشتمل ہیں۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو ان کا پہلا تحقیقی کارنامہ ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ایک اور تحقیقی مقالہ A Phonetic and Phonological study of the word in Urdu شعر و زبان (ادبی مضامین کا مجموعہ) اردو کا المیہ (اداریوں اور انشائیوں کا مجموعہ) اردو لفظ کا صوتیاتی مطالعہ، بکٹ کہانی، پرت نامہ، قصہ مہر افروز و دلبر دکنی اردو لغت ابراہیم نامہ، عاشور نامہ رقعات رشید صدیقی، اردو زبان تاریخ تشکیل تقدیر، ورود مسعود سوانح حیات، انتخاب کلام نظیر اکبرآبادی، مقالات مسعود اقبال کی نظری و عملی شعریات اور انتخاب کلام شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ جدید حیدرآباد کی خواتین میں علمی و ادبی اعتبار سے منفرد و ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ پہلی خاتون ڈین فیکلٹی آف آرٹس جامعہ عثمانیہ رہیں 1968 تا 1979 صدر شعبہ اردو کے عہدے پر فائز رہیں۔ آپ کی ادبی تصانیف میں اردو نثر کا آغاز اور ارتقا، حیدرآباد، کچے دھاگے، فن اور فنکار، اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ۔

پروفیسر غلام عمر خاں اردو زبان و ادب میں ماہر اقبالیات مانے جاتے ہیں۔ آپ 1979 تا 1983 تک صدر شعبہ اردو رہے۔ پروفیسر غلام عمر خاں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں روح اسلام اقبال کی نظر میں، اقبال کا تصور خودی اور اقبال کا تصور عشق۔ انھوں نے اقبال کا منتخب کلام اپنے تعارف اور مقدمہ کے ساتھ تلگو اور ہندی میں شائع کروایا۔ اقبال گیتولو، اقبال گیتولو، مثنوی مینا ستونتی، عاجز کی مثنوی، لیلیٰ مجنوں، دکنی اردو لغت قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ اردو زبان و ادب میں بلند پایہ انشا پرداز، افسانہ نگار، نقاد محقق اور بے مثال خطیب و لکچرار مانی جاتی ہیں۔ 1983 تا 1984 صدر شعبہ اردو رہی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں اردو غزل، نوسرہار، جلترنگ، حیدرآباد کے ادیب، نگر نگر کی بات، محب وطن خواتین، بہادر خواتین، حکمراں خواتین، تلگو ادب کی

پروفیسر غلام عمر خاں اردو زبان و ادب میں ماہر اقبالیات مانے جاتے ہیں۔ آپ 1979 تا 1983 تک صدر شعبہ اردو رہے۔ پروفیسر غلام عمر خاں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں روح اسلام اقبال کی نظر میں، اقبال کا تصور خودی اور اقبال کا تصور عشق۔ انہوں نے اقبال کا منتخب کلام اپنے تعار ف اور مقدمہ کے ساتھ تلگو اور ہندی میں شائع کروایا۔ اقبال گیتولو، اقبال گیتولو، مثنوی مینا ستونتی، عاجز کی مثنوی، لیلیٰ مجنوں، دکنی اردو لغت قابل ذکر ہیں۔

تاریخ، کلیات علی عادل شاہ ثانی، کلیات بحری، ہندی کے نورتن قابل ذکر ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی ایک مثالی استاد کی حیثیت سے وہ بہت مشہور ہوئیں۔

جامعہ عثمانیہ کے جن سپوتوں نے تحقیق و تنقید کے میدان میں وقیع کارنامے انجام دیے اور اپنی تحقیق سے دکنیات کا وقار بلند کیا۔ ان میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کا نام

سرفہرست ہے۔ آپ نے تنقید و تحقیق میں اہم مقام حاصل کیا۔ 1984 تا 1986 صدر شعبہ اردو رہیں اب تک آپ کی 30 کتابیں منظر عام پر آئی ہیں جن میں کچھ نام یہ ہیں:

ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، فن کی جانچ، دکنی رباعیاں، اردو مضمون کا ارتقا، کلیات محمد قلی قطب شاہ، مثنوی یوسف زلیخا، دکنی ادب کا تنقیدی مطالعہ، تاریخ اردو ادب 1700 تک اشتراک، پروفیسر گیان چند جین، دکنی ادب میں قصیدہ کی روایت، مثنوی من سمجھاون، مثنوی سکھ انجمن، دکنی نثر کا انتخاب، مثنوی چندر بدن مہیار، مثنوی ماہ پیکر، تاریخ ادب اردو، عہد میر سے ترقی پسند تحریک، پروفیسر یوسف شریف الدین کا قلمی نام یوسف سرمست ہے۔ وہ صدر شعبۂ اردو رہے۔ 1986 تا 1988 اور 1992 تا 1996۔ آپ کی تصنیف بیسویں صدی میں اردو ناول بہت مشہور ہوئی۔ دیگر اردو تصانیف میں پریم چند کی ناول نگاری ادب کی ماہیت و منصب، عرفان نظر، ادب نقد حیات، تحقیق و تنقید، نظری و عملی تنقید وغیرہ مقبول ہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم نے تحقیق و تخلیق و تنقید میں اپنی شناخت بنائی۔ ان کا مقالہ فانی بدایونی بہت معیاری تصور کیا جاتا ہے۔ آپ 1988 تا 1990 صدر شعبۂ اردو رہے۔ تصانیف میں نوائے تلخ، پہلی کرن کا بوجھ، مٹی مٹی میرا دل، درد کے خیمے کے آس پاس، آواز اور آدمی، لفظوں کے آگے، تحسین شعر۔ آپ نے شعر و حکمت اور سب رس جیسے رسالوں کی ادارت کے فرائض انجام دیے ہیں۔

پروفیسر اشرف رفیع کا شمار اردو کے تخلیق کار، محقق، نقادوں میں ہوتا ہے آپ بہ یک وقت ادیب، شاعر، محقق، نقاد مانی جاتی ہیں۔ جولائی 1990 میں صدر شعبہ اردو بنائی گئی۔ دوبارہ 1996 میں صدر شعبہ اردو مقرر ہوئیں۔

آپ کا مقالہ نظم طباطبائی بہت مقبول ہوا۔ آپ کی تصانیف عود غزل، صوت و آہنگ، تلخیص عروض و قافیہ، دکنی مثنویوں کا انتخاب، تلاش زبان و ادب، اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے جولائی 1994 تا جنوری 1995 چھ ماہ تک صدر شعبہ اردو کی ذمے داری سنبھالی۔ آپ کی ادبی کاوشوں میں عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے، مرزا علی لطف حیات اور کارنامے دیوان لطف، حفیظ کی تدوین، ید بیضا، نظیر شناسی، خوش نفساں ونفوس گرامی قابل ذکر ہیں۔

ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، فن کی جانچ، دکنی رباعیاں، اردو مضمون کا ارتقا، کلیات محمد قلی قطب شاہ، مثنوی یوسف زلیخا، دکنی ادب کا تنقیدی مطالعہ، تاریخ اردو ادب 1700 تک اشتراک، پروفیسر گیان چند جین، دکنی ادب میں قصیدہ کی روایت، مثنوی من سمجھاون، مثنوی سکھ انجمن، دکنی نثر کا انتخاب، مثنوی چندربدن مہیار، مثنوی ماہ پیکر، تاریخ ادب اردو، عہد میر سے ترقی پسند تحریک، پروفیسر یوسف شریف الدین کا قلمی نام یوسف سرمست ہے۔ وہ صدر شعبۂ اردو رہے۔ 1986 تا 1988 اور 1992 تا 1996۔ آپ کی تصنیف بیسویں صدی میں اردو ناول بہت مشہور ہوئی۔ دیگر اردو تصانیف میں پریم چند کی ناول نگاری ادب کی ماہیت و منصب، عرفان نظر، ادب نقد حیات، تحقیق و تنقید، نظری و عملی تنقید وغیرہ مقبول ہیں۔

ڈاکٹر عقیل ہاشمی 1998 تا 2000 تک صدر شعبہ اردو رہے۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی کی حسب ذیل ادبی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ موج نظر، ظہور قدسی، پہلی خطا، حضرت وطن حیات اور کارنامے، فراز نو، آیات پیغمبر نور اللہ، کلیات ایجاد، پیغمبران حق، مصباح تصوف، بیاض نور، حرف و صوت، کلام سعید جلالی، صبح روشن، دکنی مناقب کا انتخاب، کلام جوہر دکنی ادب وغیرہ۔

پروفیسر غیاث متین 1995 تا 1997 اور پھر یکم جنوری 1998 سے اکتوبر 1998 تک صدر شعبۂ اردو رہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دھوپ دیواریں اور سمندر آئینہ وغیرہ ادبی تصانیف شائع ہوئیں۔ زینہ زینہ لاکھ، ڈاکٹر این گوپی سابق وائس چانسلر پروفیسر تلگو عثمانیہ یونیورسٹی کی ایک سو نظموں کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔

پروفیسر بیگ احساس معروف افسانہ نگار، محقق، تنقید نگار صحافی ہیں۔ اکتوبر 2000 تا ستمبر 2002 صدر شعبہ اردو رہے۔ آپ کے پی ایچ ڈی کا مقالہ کرشن چندر شخصیت کرشن شناسی میں اضافہ ہے۔ کئی اخبارات و جرائد کے کالم نگار ہیں۔ 2010 سے مدیر ماہ نامہ سب رس رہے۔ آپ کی تصانیف میں افسانے خوشہ گندم، حنظل، دخمہ، شور جہاں، تعلیم بالغاں، بوجھ کیوں بنو، مرزا غالب، مونوگراف شاذ تمکنت، جاں نثار اختر، دکنی فرہنگ، کینوس اور لکیریں، معنی نما، سب رس، اقبال ریویو کے مدیر و ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر محمد افضل الدین اقبال، دسمبر 2002 تا جنوری 2003 صدر شعبہ اردو رہے۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔ ڈراما علی بابا چالیس چور، نواب اعظم و مثنوی اعظم نامہ، حکایات لطیف، مجمع الامثال، ریاست حیدرآباد میں اردو کا آغاز و ارتقا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے علمی ادارے، فورٹ ولیم کالج اور فورٹ سینٹ جارج کالج تقابلی و تنقیدی جائزہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر میمونہ بیگم 2006 تا 2008 صدر شعبہ اردو رہیں۔ رفیعہ سلطانہ کے 30 سال کے بعد انھیں ڈین بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 6 کتابوں کی مصنف ہیں۔ مکاتیب خواجہ احمد فاروقی، ورود مسعود، نگار شاد وغیرہ۔

پروفیسر فاطمہ بیگم پروین 2008 تا 2010 صدر شعبہ اردو رہیں۔ آپ کی ادبی تصانیف میں انتخابات مشتاق احمد یوسفی، اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، زاویہ نگاہ وغیرہ۔ آپ کو بلبل دکن کا خطاب دیا گیا۔

پروفیسر مجید بیدار 2010 تا 2012 صدر شعبۂ اردو رہے۔ آپ کی ادبی تصانیف میں بچوں کا ادب، خونی جادوگر، دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات، ناول اور متعلقات ناول، دکنی تذکرے، نثری بیانیہ، دکنی نثر پر ایک نظر، ڈوبتے ابھرتے جزیرے، دانش ور ڈاکٹر زور، اردو کی شعری و نثری اصناف، کارآمد ادب، مرتبہ کتاب جمال ابجد جلال ہمالہ کلیات سکندر علی وجد، ڈھولک کے گیت۔

پروفیسر عطیہ سلطانہ 2012 تا 2014 صدر شعبۂ اردو رہیں۔ آپ نے دکنی دیوان غواصی مرتب کیا۔

ڈاکٹر معید جاوید۔ 2014 تا 2016 صدر شعبہ اردو رہے۔ بعد میں دوسری میعاد کے لیے توسیع 2016 سے عمل میں آئی۔ آپ کی ادبی تصانیف میں معائب سخن، دل کہہ رہا ہے قابل ذکر ہیں۔ آپ مشاعرے میں اپنا کلام اس انداز سے سناتے ہیں کہ سامعین پر سحر طاری ہو جاتا ہے۔ ان صدور و سربراہان کے علاوہ شعبہ اردو کے چند نامور اساتذہ میں ڈاکٹر حفیظ قتیل، پروفیسر سید محمد، پروفیسر عبدالقیوم خاں باقی، پروفیسر جہاں بانو نقوی، پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا، پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی قابل ذکر ہیں۔

■

Dr. Mohd Nazim Ali
Ex. Principle Gov Degree College
Mortar, Distt.: Nizamabad - 503224 (Telangana)

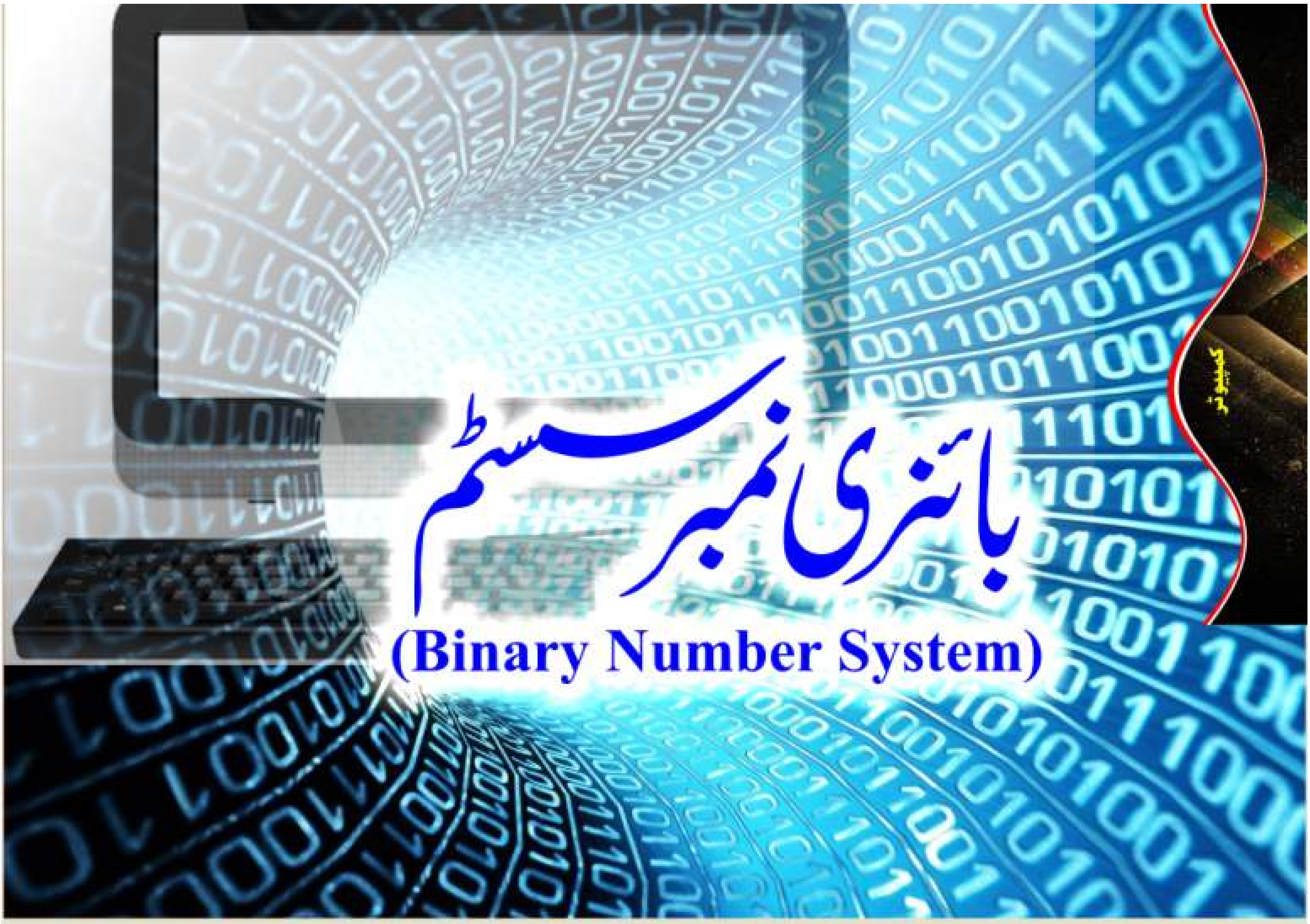

بائنری نمبر سسٹم
(Binary Number System)

پچھلے باب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ کمپیوٹر کا سارا کام 0 اور 1 کے روپ میں ہوتا ہے۔ یہ 0 اور 1 کسی بٹ کے دو پیمانے ہیں۔ جس طرح کسی سوئچ کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ آن (On) اور آف (Off)، اسی طرح کسی بٹ کی بھی دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ آن اور آف۔ سہولت کے لیے ہم آن کو 1 اور آف کو 0 لکھتے اور کہتے ہیں۔ ان کو ہی بٹ کہا جاتا ہے۔ بٹ ڈاٹا یا اطلاع کی سب سے چھوٹی اکائی ہے۔ یہ لفظ بائنری ڈجٹ (Binary Digit) کا چھوٹا روپ ہے۔

ہم جس نمبر سسٹم میں اپنا کام کرتے ہیں، اسے **اعشاری نظام** (Decimal System) کہا جاتا ہے۔ اس میں 0 سے 9 تک کل 10 ہندسوں کے ذریعے سارے عدد لکھے جاتے ہیں اور ان میں جوڑنا، گھٹانا وغیرہ حسابی کام کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کمپیوٹر میں 0 اور 1، ان دونوں ہندسوں کے ذریعے بھی عدد لکھے جاتے ہیں اور ان پر حسابیات سے متعلق کام کیے جاتے ہیں۔ دو عددوں کے اس نظام کو بائنری نمبر سسٹم کہا جاتا ہے۔ 0 اور 1 بائنری سسٹم میں 2 عدد ہیں۔

بائٹ (Byte)

اکیلی بٹ زیادہ اہم نہیں ہوتی، بلکہ دوسری بٹ کے ساتھ مل کر ہی اس کا کوئی مطلب نکلتا ہے۔ ہمارے لیے 8 لگاتار بٹ کی کڑی یا سیریز (Series) زیادہ اہم ہے۔ ایسی سیریز کو بائٹ کہتے ہیں۔ بائٹ معلومات کی اہم ترین اکائی ہے۔ کمپیوٹر کی میموری کے سائز کو بائٹ (یا کلوبائٹ یا میگابائٹ) میں ناپا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کے سارے کام بائٹ کے اوپر ہی کیے جاتے ہیں۔

کمپیوٹر میں اسٹور کی جانے والی ہر بائٹ اس کے لیے خام مال ہے، جسے کسی بھی شکل میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کمپیوٹر میں ڈاٹا کے ساتھ ہم دو کام بنیادی طور پر کرتے ہیں۔ اعداد کے ساتھ حسابیاتی کام اور حروف اور علامتوں کے ساتھ کچھ دوسرے کام۔ کسی بائٹ میں دونوں طرح کے ڈاٹا اسٹور کیے جا سکتے ہیں۔ اعدادی اور علامتی بھی۔ درحقیقت، بائٹ کے لیے دونوں طرح کے ڈاٹا میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ فرق صرف اس کے استعمال کا ہے۔ کسی بائٹ میں عدد ہے یا علامت، یہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اسے استعمال کیسے کر رہے ہیں۔

بائنری نمبرس (Binary Numbers)

آپ جانتے ہیں کہ اعشاری نظام میں کوئی عدد لکھتے وقت دائیں جانب سے بائیں جانب ہندسوں کی مقامی قدر (Place Value) دس گنا زیادہ ہوتی جاتی ہے، جیسے اکائی (1)، دہائی (10)، سیکڑا (100)، ہزار (1000)، دس ہزار (10,000)، لاکھ (1,00,000)، دس لاکھ (10,00,000) وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نمبر سسٹم کی بنیاد دس (10) ہے، کیونکہ اس میں 10 ہندسوں (0، 1، 2، 3، 4، 5، 6، 7، 8 اور 9 کے ذریعے ہی تمام نمبرات لکھے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس بائنری سسٹم کی بنیاد 2 ہے، کیونکہ اس میں سبھی نمبرات صرف 2 ہندسوں (0 اور 1) کے ذریعے لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے بائنری نمبر لکھتے وقت بٹس (Bits) کی مقامی قدر دائیں جانب سے بائیں جانب دوگنی ہوتی جاتی ہے، جیسے 1، 2، 4، 8، 16، 32، 64، 128 وغیرہ۔ جدول 1 میں کسی بائٹ کی مختلف بٹس کی مقامی قدر (یا اعدادی قدر) دی گئی ہے۔

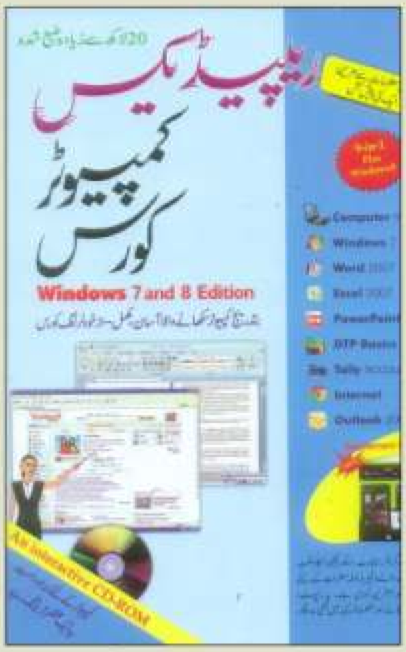

دھیان دیجیے کہ بٹس پر نمبر شمار دائیں جانب سے بائیں جانب ڈالے گئے ہیں اور شروعات 0 سے کی گئی ہے۔ کسی بٹ کے نمبر شمار کا اس کی قدر سے سیدھا رشتہ ہے۔ ہر بٹ کی اعدادی قدر 2 پر اس کے نمبر شمار کے مثاث کے برابر ہے۔ مثال کے طور پر بٹ نمبر 3 کی قدر 2^3، یعنی 8 ہے۔ اسی طرح آپ دوسری بٹ کے بارے میں سمجھ سکتے ہیں۔

جدول C-4.1: مختلف بٹ کی اعدادی قدر

قدر (Value)	0	1	2	3	4	5	6	7
1	1	.	.	.	.	.	.	.
2	.	1	.	.	.	.	.	.
4	.	.	2	.	.	.	.	.
8	.	.	.	1	.	.	.	.
16	.	.	.	.	1	.	.	.
32	.	.	.	.	.	1	.	.
64	.	.	.	.	.	.	1	.
128	.	.	.	.	.	.	.	1

کمپیوٹر میں سبھی نمبرات کو بائنری شکل میں ہی رکھا جاتا ہے اور اسی شکل میں ان میں جوڑنا، گھٹانا وغیرہ حسابیاتی کام کیے جاتے ہیں۔ اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ کسی بھی نمبر کو بائنری میں لکھا جاسکتا ہے۔

کسی بھی اعشاری نمبر کو بائنری نمبر میں بدلا جاسکتا ہے۔ اس کا ایک خاص طریقہ ہے، لیکن یہ اس کتاب کے موضوع سے باہر کی بات ہے۔ اس لیے اسے چھوڑ رہے ہیں۔ یہاں ہم صرف 16 اعشاری نمبرات کے برابر بائنری نمبریں دے رہے ہیں:

اعشاری نمبر	بائنری نمبر	اعشاری نمبر	بائنری نمبر
0	0	8	1000
1	1	9	1001
2	10	10	1010
3	11	11	1011
4	100	12	1100
5	101	13	1101
6	110	14	1110
7	111	15	1111

کسی بائنری نمبر کو اعشاری نمبر میں بدلنے کے لیے اس کی سبھی بٹ کی مقامی قدر جوڑ لی جاتی ہے۔ حقیقت میں صرف '1' بٹ کی مقامی قدریں جوڑی جاتی ہیں، کیونکہ '0' بٹ کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر بائنری نمبر 1101 میں تین '1' بٹ ہے۔ ان میں سے پہلی کی قدر 8، دوسری کی 4 اور تیسری کی قدر 1 ہے۔ انھیں جوڑنے پر 13 آتا ہے۔ اس لیے بائنری نمبر 1101 اعشاری نمبر 13 کے برابر ہے۔

ہم ایک بائٹ میں ایک حرف یا ایک نشان اسٹور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم 'Irfan Ahmad' کو اسٹور کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں 11 بائٹ کی ضرورت ہوگی، کیونکہ اس میں 10 حروف ہیں اور ایک خالی جگہ بھی ہے۔ ہر حرف اور خالی جگہ کو بھی ایک الگ بائٹ میں اسٹور کیا جاتا ہے، جیسا کہ دکھایا گیا ہے:

I R F A N   A H M A D

آپ جانتے ہیں کہ کسی بائٹ میں 8 بٹس ہوتی ہیں اور ہر بٹ کی 2 قدر ہوسکتی ہے۔ 0 یا 1۔ اس لیے حسابیات کے اصولوں کے مطابق، ایک بائٹ میں بٹس کے 2^8، یعنی 256 الگ الگ گروپ بن سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بائٹ میں 0 سے 255 تک کل 256 نمبرات دکھائے جاسکتے ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ ایک بائٹ میں 256 قسم کے نشان یا حرف اسٹور کیے جاسکتے ہیں۔

حروف یا نشانات کو بائٹس میں اسٹور کرنے کا ایک خاص طریقہ طے کرلیا جاتا ہے، جسے کوڈنگ سسٹم (Coding Cystem) کہا جاتا ہے۔ ایسے دو سسٹم آج کل سب سے زیادہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے نام ہیں: آسکی (ASCII) یا 'American Standard Code for Information Interchange' اور ایبس ڈک (EBCDIC) یا 'Extended Binary Coded Decimal Interchange Code'۔ بعض انگریزی حروف کے لیے ان دونوں نظاموں (Systems) کے کوڈ ساتھ میں دیے جاسکتے ہیں:

حرف	آسکی کوڈ	ایبس ڈک کوڈ
A	01000001	11000001
B	01000010	11000010
C	01000011	11000011
D	01000100	11000100
E	01000101	11000101

ان دونوں نظاموں میں سے پرسنل کمپیوٹروں پر آسکی سسٹم ہی سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے قارئین کی آسانی کے لیے سبھی نشانات کے آسکی کوڈ ضمیمہ 'ب' میں دیے گئے ہیں۔

■

بہ شکریہ: ریپیڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

طبِ یونانی

ماضی اور حال کے آئینہ میں!

سید فضل اللہ قادری

علم تاریخ کی اہمیت وضرورت ہر صاحب علم پر روز روشن کی طرح عیاں ہے، تاریخ ہی ایک ایسا علم ہے جس سے ہمارا ماضی کے ساتھ تعلق ورشتہ قائم ہے، مختلف ملکوں، قوموں کی تاریخ ہر ذی علم کے زیر مطالعہ رہتی ہے، جس طرح ملکوں، قوموں اور علوم وفنون کی تاریخ مربوط ہے، اسی طرح طب یونانی کے مختلف ادوار کی تاریخ ہسٹری آف میڈیسین کی کتابوں میں موجود ہے، بابلی طب، مصری طب، یونانی طب، اسلامی طب، ایرانی طب، رومی طب، طب نبوی، طب عربی اور یورپی طب (طب جدید) ان تمام طبی تاریخ کا علم طب کے طالب علم کے لیے ضروری ہے، اس علم سے واقفیت اس کے عروج وزوال کی داستاں، مخالفین طب کی آراء کا جاننا اور یاد رکھنا نہ صرف یہ کہ ضروری ہے، بلکہ اس کے فروغ کی اشد ضرورت ہے،اسی لیے معمار نصاب طب یونانی (BUMS) نے خصوصیت کے ساتھ تاریخ طب کو اس کا اہم جزء بنایا ہے؛ تاکہ اس موضوع کے تمام اسرار ورموز نشیب وفراز سے کماحقہ واقفیت ہوجائے، تاریخ ہی کے ذریعے ماضی کے درپن میں حال کا موازنہ کرنا اور اسی کو زینہ بنا کر مستقبل کی تعمیری جدوجہد کرنا ہے،ایک مؤرخ ایک مخصوص دور وعہد کے حالات تحریر کرنے کے ساتھ، گذشتہ اقوام اور علوم وفنون کے حالات کو بھی قلمبند کرنا ضروری سمجھتا ہے، نہایت گہرائی کے ساتھ اس دور کے حالات وواقعات کا جائزہ وسعت نظری کے ساتھ ہی لینا اپنی ذمے داری سمجھتا ہے اور تصویر کے دونوں رخ (حسن وقبح) کو نہایت انصاف کے ساتھ ضبط تحریر میں لاتا ہے اور اس دور کے ملکی وعوامی حالات کو بیان کرتے ہوئے ان کے اعمال وکردار کا بھرپور جائزہ پیش کردیتا ہے۔

علم تاریخ طب کے جہاں بے انتہا فوائد ہیں، وہیں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ زمانہ ماضی میں اس کے مشاہیر کے علمی، فنی، معالجاتی اور تصانیفی کارناموں کے متعلق معرفت حاصل ہوتی ہے، آنے والی نسلوں میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی ان کی علمی وفنی خصوصیات کو حاصل کریں اور متقدمین کے ناموں اور ان کے کارناموں سے خود روشناس ہوں اور دوسروں کو بھی روشناس کرائیں، اس شناسائی کے عمل میں خود ان کی بھی ایک شناخت ہوجائے گی، مسلمان ہی ہیں جنھوں نے اسماء الرجال کے فن کو وضع کیا، جن کی وجہ سے ہم آج لاکھوں علما وفضلا اور دوسرے مشاہیر فنون سے واقف ہیں، لہٰذا طب یونانی کے مؤسس ومشاہیر کا ذکر بھی کرتے رہنا چاہیے؛ تاکہ نقش طب ذہن ودماغ سے اوجھل نہ ہوجائے، طب یونانی کی تاریخ کی کتابیں اسی نقطۂ نظر کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

طب یونانی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یونان سے چلی اور بغداد پہنچی اور وہاں اسے شایان شان عروج حاصل ہوا؛ لیکن یہ زوال بغداد کے بعد ایران کے راستہ ہندوستان پہنچی، چنانچہ سید علی کوثر چاندپوری کتاب اطبائے عہد مغلیہ میں لکھتے ہیں کہ طب یونانی کا سفر بغداد ہی میں ختم نہیں ہوجاتا ہے؛ بلکہ زوال بغداد کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور ہندوستان پہنچتے پہنچتے اس نے ایک اور منزل پر قیام کیا ہے، اس منزل کا نام ایران ہے، دمشق اور بغداد کی علمی بساط الٹ جانے کے بعد ایران علوم وفنون کے ماہرین کا مرکز بن گیا تھا، چنانچہ دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں ایران ہندوستان کے لیے یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا تھا، ارباب ذوق وہاں کی مختلف تعلیم گاہوں میں علم حاصل کرتے تھے اور ہندوستان آکر اپنی استعداد کے مطابق عہدوں پر فائز ہوجایا کرتے تھے، یہ وہ زمانہ تھا، جب ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا آفتاب جگمگا رہا تھا اور اس خاندان کا سب سے زیادہ بیدار مغز اور جمہوریت پسند بادشاہ جلال الدین محمد اکبر داد فرماں روائی دے رہا تھا، ایران پر جب سلاطین صفویہ کا پرچم لہرا رہا تھا، وہاں طبی تعلیم کے متعدد مراکز تھے، جن میں دار السلطنت کے علاوہ تبریز، مشہد مقدس اور گیلان کو خاص اہمیت حاصل تھی، ان مقامات پر فاضل اطباء طب کا درس دیا کرتے تھے اور چونکہ ایران اور ہندوستان کے باہمی تعلقات نہایت دوستانہ تھے، اس کے علاوہ اکبر کے پنج ہزاری اورہفت ہزاری منصب میں ایسی کشش تھی کہ ایران میں تعلیم پوری کرکے مشہور اطباء اور ممتاز طبیب ہندوستان ہی کا رخ کرتے تھے، اس طرح دمشق، بغداد اور ایران کے بعد فن کا وہ سیلاب جو یونان سے چلا تھا، اب تیزی سے سرزمین ہندوستان کی جانب بہنے لگا تھا، ہندوستان میں طب یونانی

کے ہمہ گیر رواج میں سب سے زیادہ تاریخی حصہ ان اطبا کا ہے، جو ایران کی درسگاہوں میں تحصیل علم کرکے ہندوستان آئے تھے اور یہاں آکر انھوں طبی امداد کے ذرائع اور وسائل کو وسیع کرنے کے علاوہ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا، رفتہ رفتہ درس،تدریس کی ساری مسندیں بھی ایران سے ہندوستان آگئیں؛ بلکہ اس سرزمین کا وقار اتنا بلند ہوگیا کہ طالب علم عرب وغیرہ سے تحصیل علوم کرکے یہاں آتے اور یہاں کے فاضل اطبا سے اس فن کی تعلیم حاصل کرتے۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد اسلامی طب کا زیادہ چرچا ہوا، پھر بھی اس زمانے میں آیورویدک کا رواج تھا، چنانچہ مادھوا چاریہ،شارنگ دھر وغیرہ کی کتابیں مقبول ہوئیں،ابن اصیبعہ نے ہندوستان کے ویدوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان مشہور ومعروف وید کے ناموں کا بہت ہی عزت واحترام کے ساتھ ذکر کیا ہے،ان میں کنکہ، سن جھل، شاناق، جودرم مینکا،مسایہ وغیرہ ہیں، دیسی طریقہ علاج آیورویدک اور یونانی طریقوں کا امتزاج ہے اور دونوں کے اشتراک سے بہتر علاج رائج ہوا، مسلمانوں نے ہندوستانی طبیبوں سے بہت کچھ سیکھا، دوسری جانب حکیم شریف خاں دہلوی نے یونانی اور آیورویدک طریق علاج کو ملا کر اس فن کو بڑی ترقی دی، جب کہ ماقبل دور میں بغداد میں ہندو طبیب جڑی بوٹیوں کے ساتھ کشتوں سے بھی کام لیتے تھے،مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابن مبارک نے اپنی مشہور کتاب "المنتقذ Almuntaquize آیورویدک سے اخذ کی،زکریا رازی اور بوعلی سینا نے بھی اپنی تالیفات میں آیورویدک سے استفادہ کیا، سچی بات تو یہ ہے کہ اس علم کو یونان میں ہی عروج حاصل ہو چکا تھا اور ابوطب بقراط نے اس فن کو منظم کر دیا تھا،بعد کے اطبا میں جالینوس نے علم طب مردہ تھا،زندہ کیا،رازی نے علم طب متفرق تھا جمع کیا، بوعلی سینا نے علم طب ناقص تھا،مکمل کیا۔

یونان میں عروج اس معنی میں حاصل ہوا تھا کہ تعویذ گنڈوں اور مندر کے پجاریوں کے ہاتھوں سے نکل کر تشخیص اور اصول علاج کے دامن میں پناہ گزیں ہوگیا اور سب سے پہلے اسقلی بوس نے باضابطہ علاج شروع کیا اور عوام میں اس کے سحر انگیز معالجات کی بہت زیادہ شہرت ہوگئی اور اہل یونان اس کو موجد طب اور رب الشفا تسلیم کرنے لگے،اسقلی بوس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کا شاگرد تھا، اس کی عظمت کے بہت سے افسانے مشہور ہوگئے،اس دور کے منتخب ومستند شعراء مثلا: ہومر اور دیگر نے اسے شفا کا دیوتا قرار دیا،اس کے نام پر بہت سارے مندر بنا دیے گئے،ان میں شہر قو کی کے مندر کو بہت شہرت حاصل ہوئی،مؤرخین نے لکھا ہے کہ بقراط نے اسی مندر سے سلسلہ علاج شروع کیا اور اس کا نام بیمارستان رکھا،فیثاغورث نے علم طب کو یونان میں رواج دیا؛لیکن اس کی باقاعدہ تدوین بقراط کے زمانے میں ہوئی،طب کو یکجا اور مدون کیا،بقراط نے ہی اس علم کے اصول وقواعد مرتب کیے اور اسے عام کیا، اخلاط اربعہ Humoral Theory کا نظریہ قلم بند کیا، جس پر آب وہوا کا اثر اور تناسب اخلاط کے اثرات کو بھی اس نے تفصیل سے واضح کیا،اعضاء بدن،امراض بدن، جراحیات، معالجات،فصد،حفظ صحت پر اس نے مختلف کتابیں لکھیں اور طب نظری کی بنیاد ڈالی،بقراط کے بعد جالینوس، زکریا رازی،بوعلی سینا، ابن رشد،ابوالقاسم زہراوی جیسے محققین نے تدوین طب کے سفر کو آگے بڑھایا، اگر جالینوس کی بات کی جائے تو اس نے تشریح اعضاء کی طرف خصوصی توجہ دی اور فن جراحی میں بہت کچھ اضافے کیے،علم الادویہ کی تحقیق میں بھی اس نے بہت دلچسپی لی اور مرکبات کو ترتیب دیا،درحقیقت موجودہ طب اسلامی اور طب جدید کی بنیاد جالینوس پر ہی ہے،ان محققین نے اپنی تحقیقات ومشاہدات کی بنا پر اس کی بنیادیں اس قدر مستحکم کردیں کہ اس کو بیخ وبن سے اکھاڑے کی ہر مخالفت اور تمام مخالف تحریکیں دم توڑ گئیں۔

زمانہ قدیم میں ہندوستان کا طریقہ علاج آیوروید تھا؛لیکن جب مسلمانوں نے بھی ہندوستان کو اپنا مسکن بنایا تو پھر دونوں طبیں آپس میں شیر وشکر ہوگئیں، 1601 میں جبکہ انگریز بغرض تجارت ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ طب یورپی کو بھی لائے،مؤرخین نے لکھا ہے کہ انگریزی تجارت کو ہندوستان میں ڈاکٹری کی بدولت بہت زیادہ کامیابی ملی،کیوں کہ 1638 میں شاہجہاں بادشاہ نے اپنی بیٹی کے علاج کے لیے انگریزی ڈاکٹر Baton کو سورت سے دہلی بلایا اور خدا نے اس کے ہاتھوں شہزادی کو شفا بخشی،جس سے خوش ہوکر بادشاہ نے ڈاکٹر Baton کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے بڑے بڑے تجارتی حقوق عطا کیے،اس طرح ان کو استحکام حاصل ہوتا چلا گیا،اب ہندوستان میں تین طبیں مروج ہوگئیں،اس حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے اور ہم اس مقولے پر عمل پیرا ہو سکتے تھے کہ خذ ما صفا و دع ما کدر؛لیکن برطانوی حکومت نے ان دونوں طبوں کو نیست نابود کرنے کی کوشش شروع کردی اور دوسری جانب اطبائے متقدمین کی بیش بہا اور ان کی وقیع تصانیف کا نہایت گیرائی وگہرائی کے ساتھ عالمی سطح پر بشمول ہندوستان مطالعہ شروع کیا اور انھیں کے بتائے ہوئے اصولوں پر جدید طب میڈیکل سائنس کی تشکیل نو کا کام کیا،جدید طب کے مؤسس کے تحقیق وتجربہ کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا اور سابقہ مشاہدات وتحقیقات کو تجربے کے میزان پر پرکھنا شروع کیا اور مستقل اس کو موضوع بنا لیا گیا،اس طرح طب جدید کا تعارف بھی عام ہوتا گیا اور ہم خواب خرگوش میں پڑے رہے ان کی دواؤں کی چمک دمک اور فوری اثر پذیری نے عوام الناس کو بہت زیادہ متاثر کیا جو آج بھی قائم ہے؛لیکن اس چمک دمک کے پس پردہ جانبی اثرات Side Effects تھے، ہیں،اس سے وہ ناواقف رہے، بلکہ ناواقف رکھنے کی بھرپور کوشش بھی کی گئی،لیکن اب جب کہ اس کے نقصانات بہت عام ہو رہے ہیں تو ان کو بھی اس کی فکر ستانے لگی ہے اور ہر دن کسی نہ کسی دوا کے استعمال پر قدغن لگانے کی محدود کوشش کی جارہی ہے؛لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہندوستانی عوام نے ان کی ادویات کو گلے لگایا اور ایک طرح علاج کی حیثیت سے قبول کرلیا،لیکن ستم ظریفی تو یہ ہوئی کہ جب نویں صدی میں ہندوستان کے سفید وسیاہ کے مالک بن بیٹھے تو اپنے محسنین کے طریقہ علاج ہی کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے پر آمادہ ہوگئے اور اس فن کی راہ میں متعدد دشواریاں کھڑی کرنی شروع کردیں اور تعصبات کی چلمن کھینچنی شروع کردیں، اتنے ہی پر تنگ نظری کو سکون حاصل نہ ہوا تو 1908 میں ممبئی کے ڈاکٹروں کے ایک گروہ نے دیسی طبوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور حکومت برطانیہ کے ہندوستانی اہل کاروں کو ہموا بنا کر دیسی طب کو معدوم کرنے کے مختلف طرق اختیار کیے اور یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ طب قدیم کی ہستی متزلزل ہوجائے، اس مخدوش حالت میں ایک مسیحا نفس نے طبیبوں اور ویدوں کو ایک کڑی میں پرونے کی جدوجہد شروع کی اور 1906 میں آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس دہلی کی بنیاد ڈالی اور بتائے گئے رول ایکٹ جس کی رو سے دیسی علاج سے متعلق وید اور اطباء نہ تو علاج کر سکتے تھے اور نہ ہی طبی سرٹیفکٹ جاری کرنے کے مجاز رہ گئے تھے،اسی کانفرنس کے پلیٹ فارم سے مسیح الملک نے اس کی پرزور مخالفت شروع کی،جس میں گاندھی جی،مولانا ابوالکلام آزاد،بال گنگا دھر تلک اور الطاف حسین حالی وغیرہ کا ساتھ اس تحریک کے لیے فال نیک ثابت ہوا اور پھر صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کو طبی کانفرنس کے موقف کی حمایت پر آمادہ کیا گیا،جب اسمبلیوں میں بھی طب یونانی وآیوروید کی حمایت میں آواز بلند ہونے لگی تو حکومت

برطانیہ کو رول ایکٹ واپس لینا پڑا، اس صورت حال کا تذکرہ حکیم محمد اشرف نے اس انداز میں کیا ہے:

اسلامی دنیا پر جب برطانوی سامراج کا غلبہ ہوگیا تو انھوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے علوم وفنون اسلامیہ پر حملہ بولا تو طب بھی اس سے بچ نہ سکی اور اس کو ہر طرح ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ طب اسلامی کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں اور ایسی ہلیں کہ وہ پھر ثمر بار نہ ہوسکی، بلکہ آج تک اس کے اثرات قائم ہیں، عرب حکمرانوں نے اپنے ہی سایہ دار درخت کے استفادہ سے عوام الناس کو روک دیا اور طب اسلامی کو ان ممالک میں ممنوع قرار دے دیا گیا، جس فن کی کبھی ان کے ماہرین نے آبیاری کی تھی، وہی اپنے وطن میں غریب الوطن ہوگئی، ہے نہ ستم ظریفی اور مغرب کی غلامی۔

یہی کچھ حال ہندوستان میں ہونے جا رہا تھا، جس کا تذکرہ سابقہ صفحات میں کیا جاچکا ہے، طوق غلامی ہندوستانیوں کی مجبوری ضرور تھی؛ لیکن انھوں نے اپنی ثقافت، تہذیب اور علوم وفنون کے نام پر کبھی کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کیا، اس فن کی بقا کے لیے اپنا تن من دھن سب قربان کردیا اور اس فن کو محفوظ رکھنے کی سعادت حاصل کی، بلکہ قدیم ذخائر میں بیش بہا اضافے کیے اور عربی طب میں طب ہندی کے مفید معالجات کو بھی شامل کیا اور اسی کے ساتھ ماہیت الامراض سے معالجات تک کے تمام عناصر طب کو اجتہاد واستنباط کے ذریعے سائنسی فن اور لطیف ترین ذریعہ انسداد امراض ثابت کرنے میں امتیازی حیثیت حاصل کی، اس سلسلے میں دہلی، لکھنؤ، پنجاب، عظیم آباد اور بعض دوسرے منطقوں کے فاضل اطبا نے جو علمی ذخائر جمع کیے، ان کی ندرت، افادیت اور علمی اہمیت اس لائق ہے کہ طب ہندی کی نشاۃ جدید کی بنیاد اور اساس قرار دیا جائے اس نشاۃ ثانیہ کا سہرا مسیح الملک کے سر ہی بندھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وراثت کی حفاظت، ترویج اور اسے عہد حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ بنانے میں کارہائے نمایاں زوال بغداد کے بعد اس برصغیر کے مسلم قائد طب نے انجام دیے ہیں، انھیں عہد اسلامی کے عرب فضلا سے طب کی خدمت جلیلہ کے بعد اولین مقام دیا جاتا ہے۔ فرنگیوں کے جابرانہ تسلط سے آزاد کرنے اور فن کی بقا سے دوام کی فضا ہموار کرنے میں مسیح الملک نے اہم کردار ادا کیا اور اس گل ہوتے ہوئے چراغ کی روشنی کو اس قدر استحکام بخشا کہ وہ آج تک زندہ وپائندہ ہے، طب کے افق پر کتنی عظیم شخصیات طلوع ہوئیں جنھوں نے اپنی روشنی سے طبی دنیا کو منور کیا؛ لیکن مسیح الملک جیسی قد آور شخصیت کا پیدا ہونا محال ہی ثابت ہوا، مسیح الملک آج بھی اہل علم ودانش کی نظر میں گوہر نایاب کی شکل میں زندہ ہیں، گوکہ ان کے انتقال پر ہر چہار جانب درد وکرب کا منظر تھا، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ہوگا کہیں فلک پہ وہ خورشید جلوہ گر
سنتے ہیں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں

انگریز حکمراں جو ہندوستان کو ادویہ جدیدہ کا مرکز بنانا چاہتے تھے، اس میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے، سطور اولین جن سیاسی لیڈروں کا ذکر آیا ہے، ان لوگوں نے دونوں طبوں کے لوگوں کو آگاہ کردیا تھا کہ اپنے فن کی حفاظت کرو اور اب بھی نہ جاگو گے تو پھر تمھارا مستقبل، تمھارا فن تمھارے ہاتھوں ہی بربادی کے دہانے پر جا کھڑا ہوگا، ان حضرات کے رخصت ہوجانے کے بعد انگریز اپنے مقصد تجارت میں کامیاب ہوگئے اور اس میں اس دور کے حکما اور وید حضرات کا بھی بھرپور حصہ رہا ہے اور آج تو بہت ہی برا حال ہے، فارغین طبیہ کالجز اور اساتذہ کرام (الا ماشاء اللہ) صرف اور صرف ایلو پیتھک ادویہ کی تجارت کی خدمات انجام دے رہے ہیں تو پھر فن طب کی ترقی وترویج کیوں کر ہوسکتی ہے، جبکہ گذشتہ صدی کی تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو آشکارا کررہی ہے کہ پنجاب، دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور عظیم آباد کے اطباء نے اس کو سنوارنے نکھارنے میں جو اہم رول ادا کیا تھا، یقیناً انھیں کی خدمت کے بدولت طب یونانی ہندوستان گیر پیمانہ پر زندہ ہے۔

اگر صرف دہلی کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو میدان علم وفن کے ہر میدان میں شہسوار یہاں نظر آتے ہیں، صاحب تخت وتاج بساط سیاست کے فنکار، شاعر وادیب، صوفیاء واہل اللہ، سائنسداں اور طبیب کی کمی نظر نہیں آتی، تاریخی سرزمین ہندوستان کا دل دلی نے اتنی بہت ساری شخصیات کو پیدا کیا اور آغوش رحمت میں جگہ دی تو طب یونانی کیوں کر اچھوتی رہتی، بیسویں صدی کے اوائل اور تقسیم ہند کے پہلے خاندان شریفی کے اطباء کرام، مسیح الملک حکیم جمیل خاں، حکیم محمد احمد خاں، ظفر احمد خاں اور حکیم محمد شریف خاں وغیرہم طبی تاریخ کے اہم ستون رہے، اسی خانوادے کے دوسرے ذی علم، مشہور ومعروف غلام کبریا خاں عرف حکیم بھورے میاں نے بھی طب کی ہمہ جہت ترقی میں بھرپور کردار نبھایا، آپ کی سب سے بڑی خدمت دواسازی کو بطور فن ترقی دینے میں نمایاں مقام حاصل کیا، بڑا دواخانہ کے نام سے لال کنواں میں بڑا دواخانہ قائم کیا، جس کی تیار شدہ دوائیں کو شہرت کے ساتھ ساتھ مقبولیت عام بھی حاصل ہوئی، لیکن ان اطبا کے انتقال کے بعد طبی تحریک کسی قدر کمزور ہوگئی اور اس فن کی ترقی وفروغ پر تقریباً قدغن لگ گیا اور اب خود ملک کے اندر ہی سے مسلمانوں اور غیروں کے درمیان سے ہی کچھ شخصیات نے سر ابھارنا شروع کیا اور طب یونانی کی ترقی وترویج کے راستہ میں روڑا بننے لگے، از راہ تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ واقعات کا اعادہ ہوجائے اور ہم اس سے کچھ سبق حاصل کرسکیں، اس تذکرے کے بعد مضمون اپنے موضوع کی طرف لوٹ آئے گا۔

پنجاب، ممبئی اور یوپی کونسل میں بھی طب قدیم کی مخالفت میں آواز بلند کی گئی، اس صدائے مخالفت کے بلند کرنے کا شرف شیخ حبیب اللہ کو حاصل ہوا، شیخ صاحب اس طریق علاج کے اس لیے مخالف تھے کہ وہ طوفان نوح سے بھی پہلے کا ہے، گویا ہر وہ صداقت جو طوفان نوح سے پہلے انسانیت کو دستیاب ہوئی ہے، وہ محض اپنی قدامت کی وجہ سے ناقابل قبول ہے تو پھر ریاضی، فلسفہ، تاریخ ودیگر علوم جو طوفان نوح سے قبل ہی وجود میں آچکے تھے تو ان کے نظریہ کے مطابق انھیں بلا تامل فرسودہ قرار دے کر رد کردینا چاہیے تھا؟

شیخ صاحب کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ طب جدید نے طب قدیم کی تمام خوبیوں کو (تحقیق وتجربہ کے بعد) جذب کرلیا ہے، اس سے شیخ صاحب نے پہلے استدلال کو خود ہی رد کردیا ہے اور تسلیم کرلیا ہے کہ طوفان نوح سے پہلے کے غلام اس قدر وقیع ہیں کہ طوفان نوح سے بہت بعد کی نسلیں ان سے فائدہ اٹھائیں، رہا ان کا اجتہاد کہ طب قدیم کی ساری خوبیاں طب جدید میں جذب ہوچکی ہیں تو ہم اس کے متعلق اس کے سوا کیا عرض کریں، سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است، شیخ صاحب نے صوبہ جات متحدہ کی لجسلیٹو کونسل میں جو تقریر کی اور کونسل ارکان کو متاثر کرنے جو کوشش کی، بدقسمتی سے ان کو ایک بھی رکن تائید کے لیے نہیں ملا، مخالفین میں سے زیادہ تعداد ان حضرات کی تھی جو مشرقی طب کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے، انھیں میں ایک کرنل ملسن بھی تھے۔

ڈاکٹر ملس نے طب قدیم کو ان سائنٹیفک کہہ کر نہ صرف ایک ایسے فن سے متعلق اظہار رائے کی جرأت کی ہے، جس سے وہ قطعاً بے خبر ہیں، بلکہ انھوں نے اس لٹریچر سے بھی افسوسناک عدم واقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا جو مستشرقین نے مشرقی علوم وفنون کے متعلق مرتب کیا ہے، اگر وہ موسیو سدیو، ڈاکٹر لیبان، ڈاکٹر ہورنل، ڈاکٹر نیوبرگ، ڈاکٹر کلارک اور پروفیسر ڈاکٹر براؤن کی آرا

معلوم کر لیتے تو اس قسم کے خلاف حقیقت دعویٰ کی جرأت نہ کرتے، یہ مستشرقین بالاتفاق مشرقی طب کو سائنس کے مطابق اور ترقی یافتہ قرار دیتے ہیں، چنانچہ خلاصہ تاریخ الغرب موسیو سدیو، تاریخ تمدن اسلامی جرجی زیدان تمدن عرب ڈاکٹر لیبان ہندو میڈیسن پروفیسر رائل، قدیم ہندوستان طب پرنسپل میوڈئل طب عربی ڈاکٹر براؤن میں اس قسم کی تصریحات موجود ہیں۔ ان میں سے چند آرا کا ذکر کرنا مناسب ہے۔

ڈاکٹر لیبان تحریر کرتے ہیں کہ عربوں نے فن جراحی، علامات امراض، قرابادین ادویہ میں ترقی کی، انھوں نے علاج کے بہت سے طُرق ایجاد کیے، حفظان صحت سے علاج کے موجودہ طریقے ان کے ہاں موجود ہیں، زمانہ حال تک ان کی تصنیفات پر یورپ کا مدار رہا۔

موسیو سدیو تحریر کرتے ہیں کہ بہت سی ایجادات جو ہم اپنی طرف منسوب کرتے ہیں، ان کی اولیت کا سہرا درحقیقت عربوں کے سر ہے، سر پارڈے لیوکس نے بھی ان کی تائید کی ہے، ڈاکٹر کلارک ایم ڈی تحریر کرتے ہیں، جب میں چرک کے ہر باب کا مطالعہ کرتا ہوں تو اس خاص نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ اگر آج کل ڈاکٹر فارما کوپیا کی جدید دوائیوں اور کیمیاوی مرکبات کو ترک کرکے اپنے مریضوں کا صرف چرک کے طریقے پر علاج کریں تو گورکنوں کے واسطہ بہت تھوڑا کام رہ جائے اور دنیا میں امراض مزمنہ کے چند مریض باقی نظر آئیں گے۔

ان مستشرقین کے علاوہ انڈین میڈیکل سروس کے جن اراکین کو یونانی اور ویدک کے مطالعے کا موقع ملا ہے، انھوں نے کشادہ دلی سے اس کا اعتراف کیا ہے کہ یونانی اور ویدک طریقہ علاج نہایت بیش قیمت، ترقی یافتہ اور معقول ہیں، میں صرف دو مستند شخصیتوں کی آرا نقل کروں گا، کرنل میکیلرن سابق آئی ایم ایس الٰہ آباد کے حکیموں اور ویدوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جب میں پہلے پہل ہندوستان آیا تھا تو مجھے خیال بھی نہ تھا کہ آپ کا نظام طب اس قدر ترقی یافتہ ہے، لیکن اب مجھے علم ہوا ہے اور افسوس کہ ملازمت کی مصروفیت کی وجہ سے میں اس کی طرف اتنی توجہ نہیں کرسکا، جتنی اس کی اہمیت تقاضا کرتی ہے، مجھے معلوم ہے کہ آپ ہر مرض کی تشخیص اور علاج کرسکتے ہیں اور آپ کا امراض مزمنہ کا علاج قابل ستائش ہے، دمہ، استسقا، جنون دماغی اور نخاعی اور تناسلی امراض میں ملکی آب وہوا اور جمہوری عادت کے مطابق آپ کا علاج نہایت کامیاب ہے۔

سر پارڈے لیوکس سابق سرجن جنرل وڈائرکٹر جنرل حکومت ہند پرنسپل میڈیکل کالج کلکتہ ڈاکٹروں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: میں نہایت زور کے ساتھ یہ امر ذہن نشیں کرانا چاہتا ہوں کہ آپ اس خیال کو ترک کردیں کہ طب میں جو عمدہ چیزیں ہیں وہ صرف ایلوپیتھی تک محدود ہیں، جس قدر زیادہ مجھے ہندوستان میں رہنے کا موقع مل رہا ہے اور جس قدر اس ملک اور اس کے باشندوں کے متعلق میری معلومات زیادہ ہو رہی ہیں، اسی قدر مجھے اس امر کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ حکیموں اور ویدوں کے بہت سے طریقہ علاج نہایت بیش قیمت ہیں اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جن باتوں کو آج میڈیکل سائنس جدید انکشافات کے طور پر پیش کر رہی ہے، ان کے آبا و اجداد عرصہ دراز سے جانتے تھے۔

مستشرقین انڈین میڈیکل سروس کے اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی جس کے چیرمین خان بہادر محمد عثمان، اگزکٹیو ممبر مدراس گورنمنٹ اور سکریٹری کیپٹن ڈاکٹر سری نواس مورتی تھے، انھوں نے ڈیڑھ سال تک حکومت کے خرچ پر مشرقی طب کا بامعان نظر مطالعہ کیا اور اپنی تفتیش کے نتائج وافکار کو حکومت کے سامنے رکھ دیا، اس رپورٹ کے مصنفین نے بکثرت دلائل وشواہد بیان کرنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ علمی حیثیت سے دیسی طریقہ علاج نہایت معقول اور مطابق سائنس ہے پر دوسری جگہ تحریر کیا کہ طبی طریق پر دیسی نظام طب کو عام مؤثریت کے متعلق ہم کسی طویل بحث کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اس کی تائید دستیاب ہوئیں ہیں، بعض شفاخانوں کے اعداد وشمار دستیاب ہیں، اس کے علاوہ ہر طبقے کے لوگوں کی بہت سی تصریحات ہمارے پاس پہنچی ہیں جن میں فوائد عظیمہ کا اعتراف کیا ہے، جو انھیں دیسی طریقہ علاج سے حاصل ہوتے ہیں، حالانکہ ان حالات میں مغربی تعلیم یافتہ ڈاکٹروں نے انھیں لاعلاج سمجھ کر جواب دے دیا تھا، اس کے علاوہ جسٹس کوگرن ناتھ کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم ہوئی، کلکتہ یونیورسٹی کے مشہور سیڈلر کمیشن ان دونوں نے بھی اپنی نہایت وقیع رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ طب قدیم آیورویدک کو غیر معقول اور سائنس کے خلاف نہیں سمجھتے اور یہ کہ دیسی طبی علاج انگریزی علاج سے زیادہ ارزاں اور زیادہ مؤثر ومفید ہے اور ہندوستان کا مروجہ نظام طب مطالعہ وتحقیق کے لیے نفع بخش میدان رکھتا ہے، اوائل 19ویں صدی میں طب کے مخالفین اور ان کے جوابات آپ کی نظروں سے گذر چکے، لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ آج بھی اس قسم کے افراد ہمارے معاشرے میں موجود ہیں خواہ اس کا تعلق برصغیر کے کسی بھی حصے سے ہو۔

برکات طب ڈیرہ غازی خاں کے جون 2008 کے شمارے میں نظر سے گذرا، میں اس مضمون کو پڑھ کر دنگ رہ گیا، جس کا عنوان ہے پچھی گزیدگی کے اثرات، روزنامہ نوائے وقت میں کالم نگار نے گوجرانوالہ کے ایک مولوی صاحب کو وجہ تحریر بنایا، جنھوں نے از خود کوئی پچھی بنایا اور اپنی بہن کو کھلایا، خود دار فانی سے کوچ کر گئے، بہن تشویشناک حالت میں داخل اسپتال تھی، لہٰذا کالم نگار نے طب کے خلاف ایک کالم لکھ مارا اور اس قدیم طریقہ علاج کو ختم کرنے کی تجاویزات وجوہ لکھیں جس کا جواب حکیم محمد نعمان انصاری کراچی نے کچھ اس انداز میں دیا ہے، جواب منطقی اعتبار سے بہت موزوں ہے۔

ابتدا ایک واقعہ سے کی ہے، ایک خاتون نے اپنے دو بچوں کے ساتھ ٹرین کے نیچے از خود آکر خودکشی کرلی اور تینوں اس دار فانی سے کوچ کر گئے، ابھی تک کالم نویس نے ٹرین کی مخالفت میں کوئی کالم نہیں لکھا کہ اس فرسودہ نظام کو ختم کرکے صرف جہازوں میں سفر کیا جائے، یا ٹائی ٹینک کے غرق ہونے کے بعد بحری سفر ختم کردیا جائے، کالم نویس کو حقائق کا ادراک، معاملہ فہمی، اپنے محسنین کی پاسداری اور تاریخی حقائق پر پوری گرفت ہونی چاہیے اور ایک غیر طبیب شخص کو یہ حق کیسے حاصل ہوگیا کہ از خود کہیں سے نسخہ حاصل کرکے پچھی بنائے اور کھالے، نتیجۃً اس کی موت واقع ہوجائے کیا معلوم کہ پچھی کس مقصد کے لیے بنائی تھی، ممکن ہے کہ کسی زہریلی دوا کی شمولیت خودکشی کی نیت سے کی گئی ہو، جیسے ایک شخص خواب آور گولیاں کھالے کرم کش دوا پی کر مرجائے اور کوئی کالم نگار اپنے محدود علم کوتاہ بینی اور فہم وفراست سے عاری ہونے کی وجہ سے پوری ایلوپیتھی کو برا بھلا کہہ کر یہ مشورہ دے کہ اب علاج نہ طب یونانی سے کرو اور نہ ایلوپیتھی طریقہ سے کرو، اب صرف جھاڑ پھونک اور چھو منتر کا طریقہ اختیار کرو اور ماضی کے تاریک ترین گھروندوں میں جا بسو!!

کالم نویس کا تعلق اس گروپ سے ہے جو بے جا تعصب اور غلبہ جہالت کے سبب طب یونانی کی ترقیات سے فیض یاب نہ ہونا چاہتا ہے اور نہ دوسروں کو اس کی طرف راغب ہوتا دیکھ سکتا ہے، گویا وہ ذہنی طور پر مفلوج ہے، طب یونانی کو ہر طرح سائنٹفک علاج تسلیم کرلیے جانے کے بعد بھی ہمارے درمیان ایسے افراد موجود ہیں جو ابھی تک کنویں کے مینڈک بنے ہوئے ہیں اور اسی کو ساری کائنات سمجھنے پر خوش ہیں۔

ان مسلمہ شہادتوں کے بعد لفٹنٹ کرنل طلسن شیخ

حبیب اللہ، کالم نویس اور ان کے دیگر حوارین اور موجودہ دور میں طبی علوم کے حاملین جو مغربی طب کے صرف دلدادہ ہی نہیں؛ بلکہ طب یونانی کے طریقہ علاج کے غیر مؤثر ہونے کی احمقانہ گفتگو کیا کرتے ہیں، غالباً اس حقیقت کو تسلیم کریں گے کہ یونانی اور آیورویدک کو بھی زمرہ علوم میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے اور مغرب کی حسین وجمیل طب کے ساتھ مشرق کا یہ سادہ اور بے تکلف علم العلاج بھی مجلس طراز ہوسکتا ہے، ضرورت ہے کہ ہم احساس کمتری اور احساس کم علمی کے حصار سے باہر آئیں اور طب جدید ہماری ضرورت میں شامل ہے، میں صرف طب قدیم کی وکالت کر رہا ہوں کہ اس کی سند حاصل کرنے کے بعد بھی ہم اسے اپنی معالجانہ زندگی میں کوئی مقام دینے کو تیار نہیں۔

طب یونانی کے غیر معروف ہونے کی دوسری وجہ ہندوستان کی تقسیم بھی رہی ہے، 1947 کا انقلاب کئی معنوں میں گزشتہ انقلاب 1857 سے زیادہ دوررس، مہیب اور زیادہ نتیجہ خیز تھا، ملک تقسیم ہو چکا تھا، تقسیم کے نتیجے میں علوم وفنون کو زبردست خسارہ اٹھانا پڑا، جس میں طب یونانی بھی شامل تھی، کیوں کہ طب یونانی کی بے شمار شخصیات کے ترک وطن کرنے سے جہاں وہ بے سہارا نظر آنے لگی تھی، وہیں من جانب اللہ ایک بہتر صورت یہ نکل آئی کہ سرحد پار سے ہجرت کرکے آنے والے بیشتر اطبا نے دہلی کو ہی اپنا مستقر ومسکن بنالیا، اور ناگفتہ بہ حالات میں کسی قدر بہتری پیدا ہونے کی امید جاگ اٹھی؛ کیونکہ انھیں حالات کے درمیان سے ایک عظیم مصلح میدان کارزار میں نمودار ہوا، جس کو لوگ حکیم عبدالحمید کے نام سے جانتے ہیں، موصوف نے سیاسی گلیاروں سے دوری بنائے رکھی اور طب یونانی کی ترقی وترویج میں اپنے آپ کو منہمک رکھا، طب یونانی کا مستقبل سنوارنے میں لگے رہے، تقسیم کے بعد لوگ فرضی جنت ارضی کی جانب بھاگ رہے تھے؛ لیکن حکیم عبدالحمید صاحب نواح دہلی اور دہلی میں زمینیں خرید رہے تھے؛ تاکہ اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر کرسکیں، انھوں نے جو خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر بھی اچھی نکلی، طب یونانی کے اہم اداروں کے قیام میں منصوبہ بند طریقے سے عمل شروع کیا، آج دہلی میں طب کے اہم ادارے موجود ہیں، ان میں دواساز ادارے سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسین (CCRUM) جو کہ مرکزی وزارت صحت کا ایک شعبہ ہے، جامعہ ہمدرد جس کو بعد میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوگیا، جو درس وتدریس، تحقیق وریسرچ کے شعبوں پر مشتمل ایک ہمہ جہت ادارہ ہے، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس میں نئی روح پھونکی اور اپنی زندگی تک اس کو فعال بنا کر رکھا، اس پلیٹ فارم سے طب یونانی کی بقا وترویج اور فروغ طب کے کارہائے نمایاں انجام دیے گئے، ہمدرد کو ایک ایسا دواساز ادارہ بنادیا جس نے ملک کی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ طب یونانی کا تعارف بھی پیش کیا، ہندوستانی عوام آج یونانی دواؤں سے جس قدر واقف ہیں، اس کا کریڈٹ ہمدرد ہی کو حاصل ہے، یہ ایک عالمی پیمانے کا دواساز ادارہ ہے، یہ مقام مسرت ہے کہ حکیم غلام اکبر خاں صاحب نے معیاری دواسازی کی جو راہ دکھائی تھی، پھر ہمدرد نے اسی کو نہایت مضبوط ومستحکم بنیاد فراہم کردی، اسی کو مشعل راہ بنا کر دیگر دواساز ادارے بھی قائم ہونے لگے جو دواسازی کے میدان میں بھرپور خدمت انجام دے رہے ہیں، مثلاً ریکس ریمیڈیز، صدر دواخانہ، نیو شمع یونانی لیبوریٹریز، اسکائی ہربل فارمیسی، احمد ریمیڈیز حیدرآباد دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی، حسنی فارمیسی لکھنؤ، جوہر لیبارٹری علی گڑھ، یونومون کیمیکل ڈرگس الہ آباد، نیو ماڈرن یونانی فارمیسی پرتاب گڑھ، سرزمین بہار بھی اب چند قدم آگے بڑھی ہے اور یہاں بھی چند دواساز ادارے پوری لگن کے ساتھ خدمت انجام دے رہے ہیں، عظیم آباد کا قدیم نورانی دواخانہ پٹنہ، دردمند دواخانہ اوشو مارکیٹنگ بہار، ٹی لیبوٹریز چندواڑہ، مدنی فارماسیٹیکل آرہ، روز ویل فارماسیٹیکل پٹنہ سیٹی، ابن سینا یونانی ہربل کلینک محلہ سیدنہ پھلواری شریف پٹنہ (بذریعہ ڈاکٹر فضل اللہ قادری) سے جزوی دواسازی کے ذریعے مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے، ساتھ ہی عوام الناس کے اندر طبی علاج سے بیداری پیدا کرنے کی کوشش بھی کی جارہی ہے، یہ تمام دواساز ادارے معیاری دواسازی کی خدمت انجام دے رہے ہیں، یونانی معالجین کے بھرپور تعاون کے منتظر ہیں، ان میں چند ادارے تو وہ ہیں جو GMP کوالیٹی کنٹرول کے قانون کے تحت دواسازی کر رہے ہیں، جس کا نفاذ جون 2000 میں ہوا ہے، یونانی دواسازی اداروں کو بھی اس کا پابند بنایا گیا ہے۔

ہمدرد نے اس فن کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور معیاری دواسازی کو اولین شرط بنا کر اپنے آغاز سے ہی ریسرچ کا سہارا لیا، دوسرا ادارہ ریکس دواسازی کے میدان میں آیا اور بہت حوصلہ مندی کے ساتھ دواسازی کے کام کو آگے بڑھایا ہے، اسکائی فارمیسی دہلی، صدر دوا خانہ دہلی، حسنی فارمیسی لکھنؤ وغیرہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، معیاری دواسازی کر رہے ہیں اور یونانی دواؤں کے وسیع ترین ذخیرہ مفردات کو مرکبات کی شکل میں نہایت خوبصورت پیکنگ میں پیش کرکے ترقی طب کا مظاہرہ کر رہے ہیں، ان اداروں کے ذمے داروں سے ایک گذارش کی جسارت بھی کر رہا ہوں، لِلّٰہ غریب مریضوں پر بھی رحم کھائیں، دواؤں کی قیمتوں پر نظر ثانی کچھ ضروری معلوم ہوتی ہے، سچی بات تو یہی ہے کہ مسیح الملک کے بعد اگر کسی نے طب یونانی کو معالجاتی طور پر زندہ رکھا تو وہ حکیم عبدالحمید صاحب کی ذات گرامی تھی، یونانی طریقہ علاج کی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی اس کے فروغ کی متحدہ کوشش کریں اور معالجین طب یونانی اپنی اخلاقی ودینی ذمے داریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام الناس کی خدمت بغیر کسی آمیزش کے جاری رکھیں، کچھ حکماء یونانی مرکبات کے ساتھ جدید ادویہ کی آمیزش کرتے ہیں، یہ مریضوں کے ساتھ بے وفائی اور معاہدہ بقراطیہ کے ساتھ عہد شکنی ہے، خود اعتمادی کے ساتھ بھی دھوکہ ہے؛ اس لیے ان اداروں کی تیارشدہ دواؤں سے زیادہ سے زیادہ فروغ دے کر طب یونانی کے دائرہ کو وسیع تر بنائیں۔

(کتابیات: اطبائے عہد مغلیہ، کتابچہ الحکیم، رسالہ الحکیم، 1923 رسالہ برکات طب پاکستان)

■

Prof. Dr. Syed Fazlullah Qadri
Ibne Sena Harbal Clinic, Mohalla: Milkiyana
Phulwari Sharif, Patna - 801505 (Bihar)

تبصرہ وتعارف

خواتین سے متعلق جنسی ودیگر جرائم

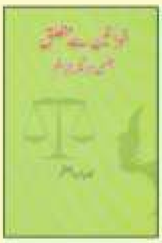

مصنف/مرتب: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 101، قیمت: 67 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ثوبان سعید، ایسوسی ایٹ پروفیسر،
خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی-فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ

موجودہ زمانے کی ترقی یافتہ اور روشن خیال دنیا عورتوں کے حقوق کے تئیں بے حد سنجیدہ اور فعال نظر آتی ہے، اور اسی ضمن میں خواتین کے تحفظ اور حقوق کی پاس داری کے لیے مختلف قوانین کے سہارے خواتین کی سماجی اور معاشی حیثیت کو مستحکم کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ یہ ایک خوش آئند اقدام ہے، لیکن اس رخ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ معاشرے میں خواتین کے تئیں بے جا تعصب اور معاندانہ رویہ بھی موجود ہے۔ اور سیکڑوں برس کے عصبیت زدہ ذہنوں میں اس نے اپنی جڑیں اس قدر مضبوط کرلی ہیں کہ اکثر وبیش تر تحفظ اور حقوق کے قوانین محض نقش دیوار بن کر رہ جاتے ہیں، اور حوا کی بیٹی اپنی عصمت وناموس پر قربان کردی جاتی ہے۔

خواجہ عبدالمنتقم صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ وزارت قانون، وزارت اقلیتی امور اور یونین پبلک سروس کمیشن سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے ہیں، لیکن اس کے علاوہ ان کی مصروفیت کا ایک میدان اور بھی ہے: قوانین کی مفید مطلب کتابیں اردو زبان میں تیار کرنا، تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد اس سے مستفید ہوسکیں۔ ابھی گذشتہ دنوں وقف قوانین کے نام سے بھی ایک مفید کتاب کونسل نے ہی شائع کی تھی۔ زیر تبصرہ یہ کتاب مختصر لیکن اہم ہے۔

خواجہ صاحب نے اس کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیباچہ اور ضمیمہ بھی ہے۔ کتاب کی ضخامت محض سو صفحات کے قریب ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے کہ کتاب کے مندرجات کو بہت ہی جامع مختصر اور ضروری باتوں تک ہی محدود رکھا گیا ہے۔

خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا محرک دراصل خواتین کے حقوق کے تعلق سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا وہ کنونشن ہے جو ستمبر 1981 سے نافذ العمل ہے، جس میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ دنیا کے ممالک کو چاہیے کہ خواتین کے ساتھ برتے جانے والے ہر قسم کے امتیازات کے خلاف اپنے اپنے آئین میں اس قسم کی توضیعات شامل کریں جن سے خواتین کو بھی مردوں کے مساوی سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی حقوق حاصل ہوسکیں۔

خواتین کے خلاف جنسی اور دیگر جرائم کی ایک طویل فہرست ہے، اور اس کی روک تھام کے لیے قوانین بھی موجود ہیں۔ حکومتیں اس سمت میں اقدامات بھی کرتی رہتی ہیں لیکن بدقسمتی سے جرائم کے اعداد وشمار میں کوئی قابل ذکر کمی واقع نہیں ہوپاتی اور جرائم نئی نئی شکلوں میں سماج کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ضروری اور مفید بات یہ ہے کہ قوانین پر سختی سے عمل پیرا ہونے کو یقینی بنایا جائے۔ ایک مزید وجہ یہ بھی ہے کہ اس سلسلے میں عوام کے اندر بیداری اور حساسیت کی وہ شدت نہیں جو مجرمین کو اس قسم کے اقدامات سے باز رکھنے میں کامیاب ہوسکے۔

پہلے باب میں 'تعزیرات ہند اور خواتین سے متعلق جنسی ودیگر جرائم' کے تحت خواتین کی آبروریزی، اغوا، ناجائز جنسی تعلقات، بھیک مانگنے کی غرض سے نابالغوں کا اغوا جیسے عناوین کی تعریف وتوضیح کرتے ہوئے اس کی سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں 'خواتین کے خلاف خانگی تشدد کے خاتمے کے قانون' کی اہم معروضات کو پیش کیا گیا ہے۔ ضمناً یہ بات بھی لکھی گئی ہے کہ دنیا کی تقریباً چوتھائی عورتوں کے ساتھ گھروں میں زیادتیاں کی جاتی ہیں اور دس سے پچاس فیصد تک عورتیں خانگی تشدد کا شکار بنتی ہیں۔ یقیناً ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

مصنف نے اس باب میں گھریلو تشدد کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے انسدادی قوانین کی تشریح بھی مختصراً بیان کردی ہے۔ تیسرا باب جہیز کے لین دین سے متعلق قانون کی وضاحت کرتا ہے، چوتھے باب میں بعض دیگر جرائم کے متعلق کچھ مفید باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچواں باب خواتین کی غیر شائستہ شبیہ پیش کرنے سے متعلق انسدادی قانون کی وضاحت اور تفصیل پیش کرتا ہے تو چھٹا باب عصمت فروشی اور

فاسقانہ کاروبار کی مختلف نوعیتوں کو پیش کرتے ہوئے اس کی تعزیری تفصیلات کو بھی بیان کرتا ہے۔

ساتویں باب میں خاتمۂ حمل سے متعلق قانون پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کے جواز وعدم جواز کے ساتھ ساتھ سزاؤں کی تفصیل بھی لکھی گئی ہے۔ اسی طرح آٹھویں باب میں حمل کے دوران تشخیص جنس سے متعلق قانون کی بحث کو سمیٹا گیا ہے۔ نویں باب میں قومی خواتین کمیشن کے قیام سے بحث کرتے ہوئے اس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز اس کے طریقۂ کار، دائرۂ عمل، فنڈ، حسابات وغیرہ کا تفصیلی گوشوارہ پیش کیا گیا ہے۔ دسویں اور آخری باب میں خواتین کو جائے ملازمت میں جنسی ایذا دہی سے محفوظ رکھنے کے لیے قانون کی تفصیلات لکھتے ہوئے خصوصی طور سے اس نکتے کو اٹھایا گیا ہے کہ کام کرنے کی جگہوں پر خواتین سے متعلق معاملات کس حد تک نازک ہو سکتے ہیں۔

غرض یہ کہ مختصری اس کتاب میں خواتین سے متعلق جنسی اور دیگر جرائم کی مختلف صورتوں کو جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ صرف انھیں توضیعات یا دفعات کی وضاحت کی گئی ہے جو منفرد نوعیت کی حامل ہیں، اور روزمرہ کی زندگی میں پیش آمدہ امکانی واقعات سے متعلق ہیں۔ اختصار اس کتاب کی خاصیت ہے۔ رہنمائی اور احتیاط کے نقطۂ نظر سے یہ کتاب خواتین وغیر خواتین دونوں کے لیے یکساں طور سے مفید اور اہم ہے۔

مضامین چکبست

مرتب: ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی

صفحات: 409 ، قیمت: 175 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی- 110025

مبصر: ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی

N/139-B1 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

اردو ادب میں پنڈت برج نرائن چکبست ایک محب وطن شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو شاعری میں ان کا پایہ خاصا بلند ہے۔ حب الوطنی ان کے یہاں قدر اعلیٰ کا درجہ رکھتی ہے اور ان کی تہذیبی، سماجی، علمی وادبی سرگرمیوں کا مرکز کہی جا سکتی ہے۔

چکبست نے محض 44 برس کی قلیل مدت میں جو شعری کارنامے یادگار چھوڑے ہیں ان کی اہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ مضامین چکبست کے علاوہ مقالات چکبست اور باقیات چکبست کے نام سے ان کے نثری مضامین پر مشتمل کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جس سے بحیثیت نثر نگار چکبست کی زیادہ بہتر تصویر ابھرتی ہے۔ مضامین چکبست اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ چکبست کے ان مضامین کا اولین مجموعہ ہے جو اس زمانے کے مشہور ادبی رسالوں مثلاً کشمیر درپن، زمانہ، اردوئے معلی، ادیب، گلدستہ پنچ میں اشاعت پذیر ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ پہلی بار 1928 میں انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد سے شائع ہوا تھا۔ جس میں محض ڈیڑھ صفحے پر مبنی حالات مصنف درج ہے۔

مضامین چکبست میں کل 20 مضامین ہیں۔ ان میں زیادہ تر ادبی ہیں۔ ان میں سے چند مثلاً دیباچہ گلزار نسیم، داغ دہلوی، اودھ پنچ، رتن ناتھ سرشار پورے طور سے باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ان مشاہیر کے سوانحی خاکے ہیں جن کی علمی، ادبی اور تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پنڈت رتن ناتھ در اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ سرشار پر پہلا اور باضابطہ مضمون ہے جس میں ان کی پیدائش، وجہ تسمیہ اور زبان وبیان پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'داغ اور اردو شاعری' جیسے مضامین ایک طرف چکبست کے ادبی وتنقیدی شعور کے غماز ہیں تو اردو تنقید کے ارتقا کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔

چکبست نے ایسے علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں پر بھی مضامین لکھے ہیں جن کی ادبی اور تاریخی لحاظ سے مسلم حیثیت ہے۔ اس سلسلے میں پنڈت تربھون ناتھ سپرو ہجر، بچھی نرائن سرور، منشی سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، منشی جوالہ پرشاد برق، پنڈت پران ناتھ سرسوتی، دادا بھائی نوروجی اور پنڈت بشن نرائن در کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ مضامین ادبی تاریخ کی ترتیب و تدوین میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں نیز ان کی حیثیت بنیادی ماخذ کی ہے۔ آفاقی صاحب نے اسی احساس کے تحت مضامین چکبست کی ترتیب وتدوین اور چکبست کی نثر نگاری کا اجمالی مطالعہ پیش کیا ہے۔

دور حاضر میں ان کی اہمیت اس لحاظ سے دوچند ہو جاتی ہے کہ جہاں ایک طرف ان سے چکبست کی علمی، ادبی وتنقیدی صلاحیتیں ظاہر ہوتی ہیں وہیں 19 ویں صدی کے اواخر اور 20 ویں صدی کے ابتدائی دور کے ادبی ارتقا، سماجی اور سیاسی صورت حال سے بھی ہم بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ آفاقی نے 'مضامین چکبست' کو بنیاد بنا کر چکبست کی نثری کاوشوں کا جائزہ بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

واضح ہو کہ چکبست نے بہت کم تنقیدی مضامین لکھے مگر ان مضامین سے ہی ان کی ادب شناسی کے جوہر اور لیاقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے لیکن ان کا لکھنوی مذاق بقول آل احمد سرور "انھیں صنفی اور شخصی معیار سے نکلنے نہیں دیتا۔"

اکثر ان کی تنقید کے رنگ میں قدامت پسندی کا رنگ جلوہ گر ہے۔ مرتب نے چکبست کی نثر نگاری کی امتیازی خصوصیات اور اسلوب کی بھی نشاندہی کی ہے۔ چکبست کی نثری کاوشیں سرسید اور حالی کی قائم کردہ جدید نثر نگاری سے یکسر مختلف ہیں۔ ان کی نثر میں سادگی اور بے تکلفی کے بجائے رنگینی اور صنعت گری کا رجحان غالب ہے۔ پھر بھی چکبست کی نثر نگاری اپنے تخلیقی رنگ وآہنگ اور انداز بیان کے اعتبار سے انفرادیت کا درجہ رکھتی ہے۔

آفاقی صاحب نے اس کتاب میں متن کی درستگی اور صحت کا بھرپور خیال رکھا ہے البتہ قاری کی سہولت کو ذہن میں رکھتے ہوئے جدید طرز املا کو ترجیح دی ہے۔ کتاب کی ترتیب میں جہاں کہیں املا کی غلطیاں تھیں ان کی تصحیح کی ہے۔ خاص طور سے مرکب الفاظ کو جدید مروجہ شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں متعدد عربی اصطلاحات کے علاوہ اردو، فارسی اور انگریزی شعرا و ادبا کا ذکر بھی ہے۔ حواشی کے تحت ان اصطلاحات اور اسما، کی تفصیلات درج ہے۔ آخر میں مرتب نے مشکل اور نامانوس الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کی ہے جس سے طلبا اور دوسرے لوگ یقیناً زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں گے۔

اس طرح چکبست کی نثر کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے میں مضامین چکبست کا لسانی ولسانیاتی اسلوب اور اسلوبیاتی مطالعہ چکبست فہمی کے بارے میں یقینی طور پر ایک نئی راہ روشن کرے گا۔ یہ کتاب کونسل کی دوسری کتابوں کی طرح قارئین اور محققوں کی نگاہ میں قدر ومنزلت حاصل کرے گی اور امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو بھی پورا کرے گی۔

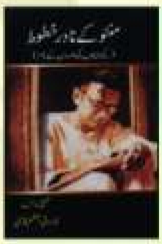

منٹو کے نادر خطوط

تحقیق وترتیب: فاروق اعظم قاسمی
صفحات: 62، قیمت: 55 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: امیر حمزہ،
L-11/14، حاجی کالونی، جامعہ نگر، نئی دہلی

تلاش وجستجو انسانی فطرت کا خاصہ ہوتا ہے۔ جس میدان میں مسلسل تلاش وجستجو کو بروئے کار لایا گیا ہے اس میدان میں ترقی دیکھنے کو ملی ہے۔ جس طرح سے تحقیق وتجربات سے دنیا نئی منازل طے کر رہی ہے اسی طریقے سے ہم ادب میں بھی مسلسل تحقیقات سے بلندی کی جانب گامزن ہیں۔

منٹو اگر چہ پچھلی صدی کا اردو کے اول درجے کا افسانہ نگار ہے لیکن اس کی بھی کئی چیزیں ہیں جو اب تک پردۂ خفا میں ہیں۔ مثلاً کئی ایسے نام سامنے آتے ہیں جن کو اس نے خطوط لکھے۔ لیکن وہ اب تک ہمارے ادب کا سرمایہ نہیں بن سکے تھے۔ جن میں سے کچھ کو فاروق اعظم قاسمی نے بہت ہی محنت اور جفاکشی سے اردو ادب کے حوالے کیا ہے جن کی تعداد 33 ہے۔ ان نادر خطوط کو جس تحقیق وتلاش کے بعد سامنے لایا گیا ہے وہ ہمیں فن تحقیق سکھلاتی ہے اور اس جانب بھی اشارہ دیتی ہے کہ ایک سرا کے ملنے سے دوسرے سرے کیسے کھلتے جاتے ہیں۔

منٹو کے خطوط کے متعلق موصوف نے پانچویں کڑی پیش کی ہے۔ ان سے قبل 1962، 1969 اور 1991 میں احمد ندیم قاسمی منٹو کے خطوط کی جمع وترتیب کر چکے ہیں۔ ان کے بعد اسلم پرویز نے 2012 میں ان کے خطوط کو مرتب کیا جس میں انھوں نے قدیم ترتیب سے محض بارہ خطوط کا اضافہ کیا۔

فاروق اعظم قاسمی نے جب سندی تحقیق میں داخلہ لیا تو انھوں نے 'منٹو کے خطوط ندیم کے نام' کے موضوع کا انتخاب کیا۔ انھوں نے اپنی تحقیق تو مکمل کی ہی ساتھ ہی ان کی کھوجی طبیعت نے 33 مزید خطوط سے اردو دنیا کو متعارف کرایا۔ اب تک منٹو کے خطوط سے متعلق یہ پانچویں تحقیق ہے۔ یہ تحقیق بالکل بھی آخری تحقیق نہیں کہی جاسکتی۔ کیونکہ اب بھی کئی ناموں کی جانب اشارے ملتے ہیں جن کو منٹو نے خطوط لکھے ہیں لیکن ان خطوط تک رسائی ممکن نہیں ہوسکی ہے۔

کتاب کے شروع میں تقریباً 12 صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے۔ واقعی یہ مقدمہ اتنا تحقیقی ہے کہ اکثر پیراگراف میں نئی نئی تحقیقات ان کے خطوط کے متعلق پیش کی گئی ہیں۔ مقدمہ میں انھوں نے سب سے پہلے سابقہ تحقیق کہ منٹو نے سب سے پہلا خط 1937 میں لکھا، اس کو اپنی تحقیق سے مسترد کر دیا اور اپنی تحقیق انھوں نے یہ پیش کیا کہ منٹو کا پہلا خط 13 ستمبر 1933 کا ہے جو مولانا حامد علی خاں کے نام ہے۔ اس خط کو بھی موصوف نے اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ اسی خط کے متن ''از راہ عنایت اپنے گرامی ناموں میں مجھے مکرمی اور محترمی ایسے الفاظ سے یاد نہ فرمایا کریں'' سے اشارہ ہو رہا ہے کہ اس سے پہلے بھی مولانا حامد علی خاں اور منٹو کے درمیان مراسلت ہو چکی ہے۔

اس کتاب میں آٹھ لوگوں کے نام خطوط ہیں۔ مولانا حامد علی خاں کے نام 14، مصطفی خاں کے نام 5، اپنی بڑی بہن ناصرہ اقبال کے نام 4، والدہ کے نام 2، مجید امجد اور اختر الایمان کے نام ایک ایک خط ہیں۔ ان کے علاوہ دو عمومی خطوط ہیں ایک رائلٹی سے متعلق اور ایک مختلف فیہ افسانہ سے متعلق ہے جو انگریزی میں ہے۔

موصوف نے مقدمہ میں اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ اسلم پرویز نے جب 2012 میں ان کے خطوط کو جمع کیا تو اس میں انھوں نے بارہ نئے ناموں کا اضافہ کیا۔ ان کے خطوط کا سراغ تو نہیں لگ سکا البتہ جن ذرائع سے ان ناموں کا پتہ چلتا ہے اس کا بھی ذکر نہیں ہے۔ لیکن فاروق اعظم قاسمی ان بارہ ناموں کے علاوہ مزید 19 اسما کا ذکر کرتے ہیں اور ان خطوط کے سراغ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

محقق نے جن خطوط کو تلاش کر کے اس کتاب میں جمع کیا ہے ان خطوط کا تعلق ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی بھی ہے۔ ان خطوط سے منٹو کے ابتدائی حالات کے بہت سے گوشے روشن ہوتے ہیں۔ ممبئی آنے سے قبل کی زندگی پر سے پردہ اٹھتا ہے۔ نیز مولانا حامد علی خاں سے متعلق جو خطوط ہیں وہ بہت ہی دلچسپ ہیں۔ ان خطوط میں منٹو اپنی فلم شناسی کا ثبوت پیش کرتے ہیں اور مولانا کے تئیں جو عقیدت ومحبت تھی اس کا بھی احساس کراتے ہیں۔ جن جن کے نام مکتوب ہیں موصوف نے ان کا اجمالی تعارف ان کے خطوط سے پہلے پیش کیا ہے اور ان کے خطوط کے اخیر میں حوالہ پیش کیا ہے کہ محقق کو یہ خطوط کہاں سے ملے۔ خطوط میں مذکورہ اشخاص بطور خاص اہل خانہ کا اشاریہ بھی مصنف نے پیش کیا ہے۔

امید ہے کہ ہمیشہ کی طرح یہ کتاب بھی مطبوعات کونسل میں سے اہم کتاب ثابت ہوگی اور اس کتاب سے یقیناً منٹو کے متعلق تحقیقات کے نئے دریچے روشن ہوں گے۔

مبارکباد پیش کرتا ہوں خصوصی طور پر فاروق اعظم قاسمی صاحب کو کہ انھوں نے اس کتاب سے نئی نسل کی نمائندگی کی اور ثابت کیا کہ اردو میں نئی نسل سے بہت ساری امیدیں وابستہ کی جانی چاہیے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق وتنقید

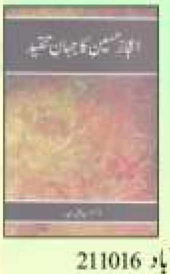

اعجاز حسین کا جہان تنقید

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر سید علی حیدر
صفحات: 170
مبصر: ڈاکٹر محمد صہیب، 156-B/9-B/1، شمس نگر، کریلا باغ، الہ آباد 211016

سید اعجاز حسین (1975-1898) اردو کی ادبی تاریخ کی ایک لازوال شخصیت ہے۔ وہ محقق بھی ہیں، ادبی مورخ بھی ہیں اور تخلیقی نثر کے ساتھ تنقیدی ادب کے صاحب طرز نقاد بھی۔ نثر ہی نہیں بلکہ شعر میں بھی باکمال تھے اور استاد شاعر کی حیثیت تھی۔ ان پر لکھا تو گیا لیکن شخصیت اور مقام و مرتبے کے اعتبار سے بہت کم لکھا گیا۔

عصر حاضر کے معروف ادیب و محقق ڈاکٹر سید علی حیدر نے اس کمی کو محسوس کیا اور اعجاز حسین کے علمی کارناموں کے تعارف کی طرف خصوصی توجہ کی۔ اس سلسلے کی ان کی تازہ ترین تصنیف 'اعجاز حسین کا جہان تنقید' ہے، جو زیر تبصرہ ہے۔ سید علی حیدر نے اس کتاب کی ترتیب یوں رکھی ہے:

(1) تنقید اور اردو تنقید
(2) اعجاز حسین اور تعبیر نقد
(3) اردو تنقید کا بدلتا منظر نامہ
(4) تحریر اعجاز
(5) اعجاز حسین: حیات نامہ

'تنقید اور اردو تنقید' جو اس کتاب کا پہلا مضمون ہے، میں تنقید کی ماہیت و اہمیت اور اس کے آغاز و ارتقا پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، جہاں یہ وضاحت ملتی ہے کہ تنقید ادب کے تعین قدر اور تشریح کا نام ہے اور تنقید سے ہی تخلیق کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اس مضمون میں عرب و عجم، مشرق و مغرب کے متعدد نظریات و روایات بیان کیے گئے ہیں جو مصنف کی ژرف نگاہی اور تفحص علمی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی کے ساتھ اردو تنقید کے ابتدائی خد و خال، ارتقائی مدارج اور زمرہ بندیوں پر بھی مفصل کام ہے۔ مولانا حالی کو پہلا باقاعدہ نقاد اور مقدمہ 'شعر و شاعری کو اردو کی پہلی تنقیدی کتاب تسلیم کیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون جس کو اس پوری کتاب کا ماحصل بھی کہا جاسکتا ہے 'اعجاز حسین اور تعبیر نقد' ہے۔ اعجاز حسین کی تحریروں میں تنقید کے جو جواہر ریزے بکھرے ہوئے ہیں، مصنف نے نہ صرف ان کی طرف متوجہ کیا ہے بلکہ تنقید کے معیار و میزان پر ان کی حیثیت اور مرتبے کے تعین کی بھی سعی بلیغ کی ہے۔ اعجاز صاحب کی تنقیدی بصیرت کی چھان پھٹک کے لیے مصنف نے ان کی تصنیفات 'مختصر تاریخ ادب اردو' 1934 (اعجاز حسین کی پہلی تصنیف) 'اردو ادب آزادی کے بعد' 1960، 'ادب اور ادیب' (مضامین کا مجموعہ) 1960، اور 'اردو شاعری کا سماجی پس منظر' کو پیش نظر رکھا ہے۔

سید اعجاز حسین کے یہاں تنقیدی عناصر کی تلاش کے دوران مصنف کا جوہر تحقیق بہت فعال نظر آتا ہے۔ یوں تو اعجاز حسین کا شمار ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں بلا اختلاف ہوتا ہے لیکن سید علی حیدر کو اصرار ہے کہ اعجاز صاحب ترقی پسند تنقید کے بھی بانی ہیں، وہ ترقی پسند فکر و نظر کے حامل اولین نقاد ہیں۔ اختر حسین رائے پوری ہوں یا مجنوں گورکھپوری اور فراق ہوں یا پھر سجاد ظہیر تنقید کی دنیا میں یہ لوگ اعجاز حسین کے بعد آئے۔

اعجاز صاحب کے دور تک اردو تنقید تاثراتی، جمالیاتی اور رومانی پیکر میں تھی لیکن اعجاز صاحب نے اپنی راہ الگ نکالی، 1934 میں پہلی بار انھوں نے ترقی پسند فکر کی اساس پر تنقید کا ستون قائم کیا اور پھر اس کے بعد 1936 میں ترقی پسند ادبی تحریک نے اس تنقید کو بلند سے بلند تر مقام پر پہنچایا اور اعجاز صاحب کے شاگرد احتشام حسین، وقار عظیم اور ممتاز حسین تنقید کی اس دنیا کے روشن نام ثابت ہوئے۔

مصنف نے آخر میں اعجاز حسین کی تحریروں کے نمونے بھی دیے ہیں، جن سے اعجاز صاحب کی تنقید نگاری کے فکری اور عملی طرز اور اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اعجاز حسین کے تنقیدی رویے اور اسالیب کا ایک جامع محاکمہ ہے۔

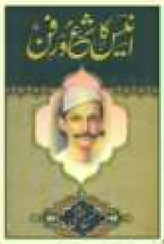

انیس کا شعور فن

مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 256، قیمت: 300 روپے
ناشر: انم پبلی کیشنز، رانچی
مبصر: جاں نثار معین، سینئر ریسرچ اسکالر
ڈپارٹمنٹ آف ویمنس ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی حیدرآباد

حسن مثنیٰ مراثی انیس کے اسرار و رموز سے آشنا ادیب ہیں۔ ان کی تصنیف 'انیس کا شعور فن' انیس اور مرثیہ شناسی پر اچھی کتاب ہے۔ فن مرثیہ گوئی ایک معروف صنف ہے۔ میر انیس نے اس صنف کو بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔ یہ شرف انھیں اپنے خاندان سے ملا چونکہ پردادا میر ضاحک، دادا میر حسن، بابا میر خلیق، چچا میر احسن اور چھوٹے چچا میر احسان بھی نے شعر و سخن کا چراغ روشن کیا تھا۔ انھیں مشاہدات اور تجربات سے انیس نے مرثیہ کے خد و خال متعین کیے۔ مثلاً طیور صبح کا زمزمہ کرنا، پیاس کا بیان، جنگ کا منظر، احباب اور اعزا کی قربانیوں کا منظر، رقت، گرمی کی شدت تپش جنگ کے مناظر کو ہو بہو اتارتے ہوئے انیس نے ایک منظم شکل و صورت میں مرثیہ گوئی کی۔ انھوں نے منظر کشی کے ساتھ ساتھ فصاحت اور بلاغت کو بام عروج پر پہنچادیا۔ مصنف نے انیس کے مرثیہ کے شعور اور فن پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

مشمولات کچھ اس طرح ہیں۔ انیس کا شعور فن، میر انیس لکھنو اور 1857، مراثی انیس اور جنگ کربلا کے اسلحے، مراثی انیس میں انسان سازی کے عناصر، مرثیوں میں ہندوستانی سماج کی عکاسی، مراثی میں رزمیہ عناصر، مراثی انیس میں ماں کا کردار، کلام انیس میں نعتیہ عناصر، مراثی انیس کے ناری پیکر، علمبردار کربلا میر انیس کی نظروں میں، انیس کے مرثیوں میں احوال روز و شب، مراثی انیس کے چند حاشیائی کردار اور انیس ناقدین کی نظر میں'۔

مصنف نے اس کتاب میں نسوانی کردار کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے کربلا کے نسوانی کردار پر خصوصی روشنی ڈالی ہے۔ انیس کے مراثی میں الگ پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے 'کلام انیس میں چند نعتیہ عناصر' میں ان کی تحقیق صاف نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین اس اعتبار سے بھی توصیف کے مستحق ہیں کہ مرثیہ نگاری کا رواج کم ہو رہا ہے۔ ایسے میں اس صنف پر لکھنا وقت کی ضرورت ہے۔

مصنف نے اپنے فہم و ادراک اور وسیع النظری سے ہر موضوع کا پوری طرح سے حق ادا کیا ہے۔ عام روایت سے ہٹ کر انھوں نے انیس کے کلام میں ہندہ کا کردار پیش کیا ہے۔ وہ محبِ رسول ہوتے ہوئے بھی یزید کی بیوی رہتی ہے۔ اس خانوادے سے منسلک ہونے کے باوجود اس پر تربیت کا اثر اس قدر تھا کہ وہ یزید کی زوجہ ہوتے

ہوئے بھی دین پر جمی رہی، اس میں کوئی کمی نہ آئی اور اس نے اپنے دل سے اس عقیدت ومحبت کو مجروح ہونے دیا۔ بغور دیکھا جائے تو یزید کی ایک چوک سے ہی اس کردار میں بھی جان آگئی کہ اس نے اہل حرم کو وہاں مقید کیا جو اس کے محل سے قریب تر تھے، جہاں سے نالہ وشیون کے ساتھ ساتھ عبادت الٰہی کی آوازوں نے ہندہ میں ایک قسم کا اضطراب پیدا کر دیا۔

کلام انیس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عورت کو حوصلہ مند، نڈر، بہادر، قربانی وایثار کا پیکر، صبر وبرداشت کی قوت سے آراستہ اور حق پرست ووفا شعار کردار کے طور پر پیش کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کے نسوانی کردار خاندان رسالت سے متعلق ہیں اور دوسری وجہ یہ بھی کہ یہ سبھی کردار عرب سے متعلق ہیں جن کے بارے میں ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ وہ عام عورتوں سے زیادہ جری ہوا کرتی ہیں۔ یہ بات صدفی صد درست ہے۔ ماں اپنے نونہالوں کو ہتھیاروں سے سجا کر میدان کارزار میں راضی بہ رضا روانہ کرتی نظر آتی ہیں۔

'انیس کا شعور فن' کے مضامین میں اچھے معیاری تنقید کا منظر نظر آتا ہے۔ کتاب میں شامل مضمون 'مراثی انیس میں ماں کا کردار' میں ماں کی اہم خصوصیات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جیسے بی بی حوا کی حیاداری، مریم کی عصمت، ممتا کی دیوی ہاجرہ کی حرمت، زلیخا کا عشق، خدیجہ کی وفاداری، دائی حلیمہ کی سعادت اور زینت کی پاسداری وغیرہ کو مرکزی خیال میں رکھا۔ ایک مضمون 'مراثی انیس کے ناری پیکر' میں ناری پیکروں کو حقیقی خدوخال کے ساتھ ابھارا ہے۔ دوسری طرف ایسے ناری پیکر جن کی سرشت میں ہی بدی تھی۔ ان ناری پیکروں نے جنگ کی خاطر ایک سے ایک اسلحے جمع کیے تھے تاکہ وہ بھی مردوں کی طرح کربلا میں اپنی خدمات انجام دے سکیں۔ 'مراثی انیس کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ' بھی اچھا مضمون ہے۔ مصنف کا انداز تحریر سلیس اور رواں ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی بات سمجھانے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ کتاب میں مرثیہ نگاری پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ مضامین کو سلیقہ مندی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ کتاب طلبہ وطالبات کے لیے مفید ہے۔

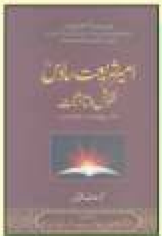

امیر شریعت سادسؒ نقوش و تاثرات

مؤلف: محمد عارف اقبال

صفحات: 684، قیمت: 500 روپے

ناشر: شعبہ نشر واشاعت مدرسہ امدادیہ، لہریا سرائے، دربھنگہ (بہار)

مبصر: محمد تحسین زماں، ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

امیر شریعت سادسؒ سے مراد مولانا سید نظام الدین صاحب (سابق جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) ہیں۔ آپ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، مولانا ولی رحمانی سے پہلے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت آپ کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوستان کے مختلف اداروں جیسے دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شوریٰ کے رکن بھی رہے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'امیر شریعت سادسؒ نقوش وتاثرات' مولانا سید نظام الدین صاحب کے حالات زندگی پر مبنی ہے جو ان کے سانحہ ارتحال کے بعد لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے ہندوستان کے جید علماء واسکالرس کے لکھے ہوئے مضامین کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مولانا کے حالات زندگی کے تمام گوشوں کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کے لیے انھوں نے اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ابواب کی تقسیم کچھ اس طرح ہے:

(1) حالات زندگی اور کارنامے، (2) اداروں سے وابستگی، (3) بزرگوں اور رفقاء سے تعلق، (4) ادبی خدمات، (5) 'باتیں میر کارواں کی' کے حوالے سے، (6) سانحہ ارتحال۔

باب اول: حالات زندگی اور کارنامے، کے تحت تقریباً اٹھائیس مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ اس باب کے آغاز میں معروف صحافی وقلم کار سہیل انجم کا قلمی خاکہ اور مؤلف کے ذریعے مولانا کا زندگی نامہ پیش کیا گیا ہے۔ قلمی خاکہ اور زندگی نامہ کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی شخصیت سراپا قاری کے سامنے موجود ہے۔ مضمون لکھنے والوں میں مدارس کے اہل علم بھی ہیں اور جامعات کے پروفیسر بھی۔ مولانا امین الدین شجاع الدین کے ذریعے لیا گیا انٹرویو قابل تعریف ہے، اس انٹرویو میں مولانا نے مسلم پرسنل لا کیا ہے؟ اس کے کیا اہداف ومقاصد ہیں،؟ حکومت اور میڈیا کا 1972 کے مسلم پرسنل لا کنونشن سے متعلق کیا رویہ تھا۔ ان سب پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، آج کے ماحول کے لحاظ سے یہ انٹرویو کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس انٹرویو کو کتابچے کی شکل میں چھپوا کر عام کرنے کی ضرورت ہے۔

باب دوم کا عنوان 'اداروں سے وابستگی' ہے۔ اس کے تحت چھ مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ ان مضامین میں اسلامک فقہ اکادمی، مسلم پرسنل لا، مدرسہ ریاض العلوم، المعہد العالی، مدرسہ امدادیہ اور جامعہ رشید العلوم وغیرہ سے ان کی کیا وابستگی تھی اس کا تفصیلی ذکر ان مضامین میں موجود ہے۔ باب سوم کا عنوان 'بزرگوں اور رفقا سے تعلق' ہے۔ اس باب میں آٹھ مضامین موجود ہیں۔ رفقا میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا قاضی مجاہد الاسلام اور دیگر عبقری شخصیات مثلاً مولانا شاہ ذوالفقار، مولانا ولی رحمانی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی وغیرہ سے ان کے تعلقات ومراسم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب چہارم کا عنوان 'ادبی خدمات' ہے۔ اس باب میں نو مضامین شامل کتاب کیے گئے ہیں جو مولانا کی شاعری، اداریے، خطوط اور خطبات پر مبنی ہیں۔

باب پنجم 'میر کارواں کی کے حوالے سے' ہے۔ اس باب کو مؤلف نے چار ذیلی عنوان کے تحت قائم کیا ہے۔ جو خطوط، منظومات، تاثرات، مقالات، رپورتاژ اور تبصروں پر مبنی ہے۔ باب ششم میں تعزیت نامہ، وفیات، قطعات وفات، اخباری بیانات اور آخر میں ضمیمہ کو شامل کیا گیا ہے۔ مؤلف نے اس باب کا عنوان سانحہ ارتحال رکھا ہے، جس میں تقریباً 37 لوگوں کے تعزیتی مضامین شامل ہیں۔ محمد عارف اقبال کا یہ کام نہایت قابل تعریف ہے۔

احمد صغیر (فن وفنکار فکشن)

مصنفہ: ڈاکٹر نزہت پروین

صفحات: 316، قیمت: 350.00 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف میاں سرائے سنبھل، یوپی 244302.

زیر تبصرہ کتاب جہاں ایک طرف احمد صغیر کے فن کا مکمل احاطہ کرتی ہے وہیں ڈاکٹر نزہت پروین کی تصنیفی صلاحیتوں کی غماز بھی ہے۔ اس کتاب کو جس خوبصورتی اور حسن سلیقہ کے ساتھ مصنفہ نے ترتیب دیا ہے وہ ان کی تصنیفی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ کتاب کے شروع میں "احمد صغیر بحیثیت فکشن نگار" کے عنوان سے ایک مقدمہ ہے۔ جس میں موضوع کی مناسبت سے احمد صغیر کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مقدمہ اس کتاب کا مختصر تعارف ہی نہیں بلکہ یہ موصوف کی شخصیت اور فن دونوں کا ہی مکمل احاطہ کرتا ہے۔ اس کے ذریعے جہاں ہم کو احمد صغیر کے شخصی کوائف معلوم ہوتے ہیں وہیں یہ علم بھی ہوتا ہے کہ

آپ کی کون سی کتاب کس سنہ اور کس مقام سے شائع ہوئی۔ غرض کہ یہ کتاب اور صاحب کتاب کا مکمل تعارفی روزنامچہ ہے۔ اس کے بعد ''احمد صغیر ایک نظر میں'' کے عنوان سے ان کے مکمل کوائف بھی دیے گئے ہیں۔ جو کتاب کے سات صفحات پر مشتمل ہیں۔ آگے شجرۂ نسب بھی دیا گیا ہے۔ اس طرح احمد صغیر کا مکمل تعارف کتاب کے قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے بعد مجموعی اعتبار سے احمد صغیر پر تبصراتی مضامین دیے گئے ہیں۔ بعدۂ اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ اور کتاب کو افسانے اور ناول کے مخصوص گوشوں میں تقسیم کر کے اسی کے حوالے سے مضامین پیش کیے گئے ہیں، جن میں سب سے پہلے ان کے افسانوی مجموعے ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' پر مشاہیر کے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کے ذریعے جہاں احمد صغیر کی فن افسانہ نگاری کی خوبیاں واضح ہوتی ہیں، وہیں ان کے افسانوں کی اہمیت وافادیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپ کے دوسرے افسانوی مجموعے ''انا کو آنے دو'' کے حوالے سے اردو کے اہم نقادوں کے مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ احمد صغیر کے افسانوی مجموعے ''درمیان کوئی تو ہے'' کے تعلق سے بھی نقادوں کے تاثرات شامل ہیں۔ اس کے بعد ایک اور افسانوی مجموعے ''داغ داغ زندگی'' پر ادیبوں کے رشحات قلم زینتِ کتاب ہیں۔ اس طرح احمد صغیر کے پانچ افسانوی مجموعوں پر احاطہ کرتی ہوئی اہل قلم کی یہ وہ گراں قدر تحریریں ہیں، جن کو فاضل مصنفہ نے ایک کتاب میں جگہ دے کر کوزے کو سمندر میں بند کر دینے کی مثال پیش کی ہے۔ کچھ کتابوں پر دیگر قلم کاروں کے تبصرے جو دیگر رسائل ومجلوں میں شائع ہوئے ہیں ان کو بھی جگہ دی گئی ہے، جن سے کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

احمد صغیر صاحب افسانہ نگاری کے ساتھ ہی ناول نویسی کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ آپ کے تین بڑے اہم ناول منظر عام پر آئے۔ اس کتاب میں ان پر بھی اہل قلم کی آرا کو جگہ دی گئی ہے۔

احمد صغیر کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دہشت گردی، پولس زیادتی، جنسی استحصال، ضعیف الاعتقادی، مذہبی دکھاوا، معاشرے کی بے بسی، خوف وسراسیمگی اور آج کے نظام کی بے حسی اور معاشرے کی دیگر برائیوں کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کو نہ تو بے جا تعریفوں کا مرقع بننے دیا ہے اور نہ ہی غیر مناسب تنقید کی مثال بنایا ہے۔ بلکہ پوری طرح حقیقت بیانی سے کام لے کر انھیں حق وانصاف کا مرقع بنا دیا گیا ہے۔ یہی آپ کی تحریروں کا حسن بھی ہے اور یہی ان کے معیار کی بلندیوں کی بنیاد بھی۔ ان کی تحریر میں ادبی چاشنی کے ساتھ ہی فنی خوبیاں اور قاری کو اپنی طرف کھینچنے کی مکمل صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ان کی تحریر سے بندھ سا جاتا ہے اور اس کو مطالعے میں ایک خاص حظ ولذت کا احساس ہوتا ہے۔ اور قاری مکمل کر کے ہی دم لیتا ہے۔ آپ کی ذات وفن کی یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی بنا پر ان کو اپنے ہمعصروں میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ زیر نظر کتاب آپ کے فن کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ جس کے ذریعے احمد صغیر کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔

نقوش افکار

مصنف: وارث ریاضی

صفحات: 275، قیمت: 300 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: اسعد اللہ، معرفت محمد محسن، 1444/45، فیاض گنج، آزاد مارکیٹ، پرانی دہلی 6

زیر تبصرہ کتاب 'نقوش افکار' وارث ریاضی صاحب کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جسے اب کتابی شکل میں یکجا کر کے افادۂ عام کے لیے قارئین کی نذر ہے۔ اس کتاب کے اندر کل پانچ ابواب 'تعلیم'، 'اسلامیات'، 'اقبالیات'، 'شخصیات' اور 'ادبیات' کے ہیں جس کے تحت کل انیس مقالے شامل کتاب ہیں۔

تعلیم کے باب میں چار مقالے شامل ہیں اور ان تمام مقالات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر علم کے نہ تو دنیا میں ترقی حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ آخرت میں۔ تعلیم کی تمام جزئیات وفروعات کا احاطہ کرتے ہوئے وارث ریاضی نے مختلف حوالہ جات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''قرآن کے اندر مختلف قسم کے علوم کی مثالیں مل جاتی ہیں جنھیں ہم سائنس کہتے ہیں مثلاً علم نباتات، علم حیوانات، علم حجر، علم بحر، علم ہیئت یہاں تک کہ علم جنین کا بھی ذکر ملتا ہے''۔ آگے کے صفحات میں ''علی گڑھ کے سفر کی جسمانی وعلمی فتوحات'' کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں ''جس ملک میں تین سو سے زیادہ زبانیں رائج ہوں وہاں ایک زبان کو مروج کرنا آسان نہیں تھا چنانچہ ہندوستان کے مسلم بادشاہوں نے ہندوستان کی سرکاری اور شاہی زبان تو فارسی رکھی لیکن صوبوں کی زبان وہی رہنے دی جو وہاں رائج تھی''۔ یہ دراصل ان لوگوں پر ایک گہرا طنز ہے جو اس ملک کے اندر ایک ہی زبان کی وکالت کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلامیات کا باب باندھ کر ہندستانی تناظر میں مصنف نے مسلم معاشرے کے رہن سہن اور ان کی صفائی ستھرائی کا جائزہ بحسن وخوبی لیا ہے اور معاشرے کے اندر طہارت اور پاکیزگی کے تئیں لاپروائی اور پھر ان سے پنپنے والی بیماریوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں ''مسلمانوں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جس میں دینی اور دنیوی دونوں علوم کے ماہرین ہیں یہ افراد یا تو اسلامی تقاضوں کے پیش نظر طہارت وپاکیزگی کے لیے پورا اہتمام کرتے ہیں یا طبی نقطۂ نظر اور حفظان صحت کی خاطر پاک وصاف رہتے ہیں۔ لیکن طہارت وپاکیزگی کے سلسلے میں اس طبقے کی سرگرمیاں اپنی ذات اپنے خاندان اور مکانات تک محدود رہتی ہیں''۔ آگے کی سطروں میں مسلمان بستیوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے رقمطراز ہیں ''طہارت وپاکیزگی سے عدم دلچسپی کی یہ صورت حال جب تک ہندوستانی مسلمانوں میں قائم رہے گی، گندگیوں سے پیدا ہونے والی متعدی اور غیر متعدی بیماریوں میں مبتلا ہو کر ہندوستانی مسلمان نہ صرف اپنی ذات اپنے خاندان کی ہلاکت کا سامان فراہم کریں گے بلکہ اپنی قوم اور ملک کے لیے تباہی کے اسباب مہیا کر جائیں گے''۔

''اقبالیات'' کے ضمن میں چار مقالات شامل ہیں اور ان چاروں مقالوں میں اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ایک مضمون میں اقبال کے افکار ونظریات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ کہ ''شاعرانہ اور فلسفیانہ کمالات اور اسلام سے گہری وابستگی کے ساتھ مغربی فلسفہ نے ان کے ذہن وفکر پر کچھ نہ کچھ اثر ڈالا ہے غالباً یہی اسباب ہیں جن کے باعث علامہ اقبال کے بعض افکار ونظریات، اہل سنت والجماعت کے اجتماعی عقائد سے مطابقت نہیں رکھتے''۔ پھر مصنف نے الگ الگ حوالہ جات سے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن شاید انھوں نے بلا تحقیق یہ بات لکھ دی پہلے انھیں تحقیق کرنا چاہیے تھا پھر لکھتے تو شاید بہتر ہوتا کہ کن حالتوں اور کن وجوہات کے تحت اقبال نے یہ بات کہی تھی اور جس 'مظلوم اقبال' نامی کتاب کا حوالہ دیا گیا اس کتاب کے بعض حصے خود ہی اہل علم کی نگاہوں میں تحقیق طلب ہیں۔ اس کتاب کے اندر لکھے ہوئے بین السطور کو پڑھنے کی کوشش کی جائے تو قصہ کچھ اور ہوگا۔ اس لیے مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ مصنف نے ایک عام مفروضے اور سنی سنائی باتوں کو اپنے مقالہ میں جگہ دی جو کہ بلا تحقیق ہے۔

شخصیات کے ضمن میں چھ عظیم ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں مولانا حسرت

موہانی، پروفیسر مختار الدین آرزو، پروفیسر نذیر احمد، مولانا قاضی مجاہد الاسلام اور علامہ سید ابوالحسن علی میاں ندوی کی ذات بابرکات ہیں۔ ادب کے متعلق علی میاں ندوی کے خیالات کو پیش کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں "روایتی ادب کے خلاف، مولانا علی میاں کی صدائے حق پوری اسلامی دنیا میں سنی گئی جس کے نتیجے میں 1984 میں "رابطہ ادب اسلامی" کا قیام عمل میں آیا اور علی میاں کو اس کا صدر منتخب کیا گیا، آج اسلامی ادب کی اہمیت پوری دنیا میں تسلیم کی جا چکی ہے اور "اسلامی ادب" پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ علی میاں کا یہ کارنامہ اسلامی دنیا میں کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔"

جبکہ کتاب کے آخری حصے کو مصنف نے عطا عابدی کی غزلوں کا مجموعہ 'بیاض' کے تقابلی مطالعے کے لیے وقف کیا ہے۔ پوری کتاب کے مطالعے کے بعد یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ جتنے مقالات اس کتاب میں شامل ہیں سب تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ لیکن زمانہ برق روی سے ترقی کی طرف گامزن ہے آئے دن ایک نئے مفروضے اور نئی تحقیقی کتابیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کچھ حضرات اس کتاب کے بعض حصوں پر معترض ہوں۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہر مصنف اپنے دور کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے اپنے مطالعے کی میز کی زینت بنایا جائے۔ ساتھ ساتھ کتاب کا ٹائٹل دیدہ زیب اور کمپوزنگ کی غلطیوں سے مبرا ہے۔

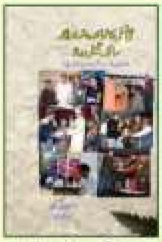

نئی نسل کا نمائندہ افسانہ نگار: **سالک جمیل براڑ**

مرتبین: ڈاکٹر محمد ایوب خان، ڈاکٹر محمد اسلم

صفحات: 136، قیمت: 200 روپے

ناشر: انم پبلی کیشنز، رانچی

مبصر: بانو، مکان نمبر 1043، کشن گنج، تیلی واڑہ، آزاد مارکیٹ، دہلی

زیر تبصرہ کتاب۔ نئی نسل کا نمائندہ افسانہ نگار۔ سالک جمیل براڑ، جس کے مرتبین ڈاکٹر محمد ایوب خاں اور ڈاکٹر محمد اسلم ہیں، 136 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مختلف زمروں یعنی شخصیت، فن، تبصرے، تراشے، تاثرات، افسانے، مختصر افسانے اور افسانچوں میں منقسم ہے۔

مالیر کوٹلہ زرخیز خطہ ہے جس نے اردو ادب کو کئی در نایاب دیے ہیں جو اردو ادب کے آسمان پر درخشاں ستاروں کی مانند تابانیاں بکھیرتے رہے ہیں۔ اردو ادب کا ایک ایسا زرخیز خطہ ہے جہاں افسانہ نگاروں کی ایک کھیپ نظر آتی ہے۔ اس کھیپ میں ایک اہم افسانہ نگار سالک جمیل براڑ ہیں۔ اس جواں سال افسانہ نگار نے کم وقت میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ اس مختصر ادبی سفر میں وہ کم و بیش سو افسانے ضبط تحریر میں لا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے دو افسانوی مجموعہ 'لمحے' اور 'مٹی کے رنگ' بھی منظر عام پر آکر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔

اس کتاب میں مشہور و معروف شخصیات کے مضامین شامل ہیں جو سالک جمیل براڑ کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کو روشن کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسلم، سالک جمیل براڑ کے بارے میں رقم طراز ہیں۔ "سالک ایک جنونی قسم کا نوجوان ہے، وہ اردو کا سچا عاشق ہے جو برسوں سے زبان کے فروغ کے لیے دل و جان سے سرگرم ہے۔ وہ ہمیشہ نئی نئی راہیں تلاش کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔"

بقول صاحب کتاب اس نوجوان افسانہ نگار کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کم و بیش دو درجن معتبر قلم کار خامہ فرسائی کر چکے ہیں۔ راقم السطور کی نظر سے جب یہ مضامین گزرے تو خیال آیا کہ سالک کے کچھ افسانے نیز ان کے فن اور شخصیت پر تحریر کیے گئے یہ مضامین و تاثرات کو کیوں نہ کتابی صورت میں اردو قارئین تک لایا جائے۔ ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کے ضمن میں یہ قدم لائق ستائش ہے۔ عظیم الشان صدیقی، شرون کمار ورما، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، مجاہد الاسلام، خالد کفایت، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، دیپک بدکی، عظیم اقبال، ایم رفیق، ایم مبین، ڈاکٹر رینو بہل، انوار احمد انصاری اور انیس میرٹھی نے سالک کے فکر و فن پر اپنی جو آراء پیش کی ہیں وہ تمام مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ منتخب افسانے اور افسانچے بھی شامل ہیں۔

سالک نے اپنے افسانوں میں معاشرے میں پنپ رہی برائیوں کو موضوع بنایا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے ان برائیوں کو بے نقاب ہی نہیں کرتے بلکہ سماج کا کریہہ چہرہ قارئین کے سامنے لاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر وہ برائیاں رہتی ہیں جو ہمارے سماج کو دیمک کی مانند چاٹ رہی ہیں۔ وہ اپنے افسانچے 'مطمئن' کے ذریعے معاشرے میں پنپ رہی داخلی برائیوں پر ضرب لگاتے ہیں۔ یہ ایک طنزیہ افسانچہ ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ موجودہ دور میں شہرت کے بھوکے لوگ کس طرح لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس کی بہترین مثال ان کا افسانہ 'تحفہ' ہے، جس میں پہلوان شمشیر سنگھ، پہلوان کاشی رام کی مجبوری کا سودا کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ بوجھ، واپسی، امن کا پیغام، ہیرو اور محبوب وغیرہ بھی اس نوعیت کے افسانے ہیں جن میں معاشرتی برائیوں کو اجاگر کیا گیا۔ بلا مبالغہ نو وارد افسانہ نگاروں کے لیے سالک جمیل براڑ مشعل راہ ہیں۔

فکشن

اُس کا دُکھ

مصنف: شکیل صدیقی، مترجم: ڈاکٹر الف ناظم

صفحات: 160، قیمت 150 روپے، سنہ اشاعت: 2015

مبصر: محمد امجد، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'اُس کا دُکھ' شکیل صدیقی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ شکیل صدیقی بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ ان کے یہ افسانے مجموعے کی شکل (کالی رات) میں شائع ہونے سے قبل ہندی کے معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بیشتر افسانے ہندوستان کی دیگر زبانوں مثلاً گجراتی، پنجابی اور تلگو وغیرہ میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ اسی مقبولیت کے پیش نظر اس مجموعہ ہندی (کالی رات) کو ڈاکٹر الف ناظم نے "اُس کا دُکھ" اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

اس وقت میرے سامنے ڈاکٹر الف ناظم کا ترجمہ شدہ افسانوی مجموعہ "اس کا دکھ" ہے۔ جس میں سولہ افسانے شامل ہیں۔ شکار، میں نہ دھرمی نہ ادھرمی، اس کا دکھ، علاج، شمو باجی وایا بکو ماموں، دروغائن، اے ای جی آمار دھرتی، مجاہد آزادی اعزاز اور کمبل، موت ایک امکان، درد سے کیوں نہ بھر آئے دل، ریلوے لائن پر لاش، علی حسن، دنگا، رات، کالی رات، اور لکھنؤ کی ایک شاہراہ۔ یہ افسانے فن سے قاری کو متحیر تو نہیں کرتے لیکن زندگی کی تلخ حقیقتوں اور الجھنوں سے روبرو ضرور کراتے ہیں۔ مجموعے کا پہلا افسانہ 'شکار' بدلتے ہوئے حالات میں پدرانہ اور جاگیردارانہ نظام کی تشدد آمیز سوچ کو تہ در تہ کھولتا ہے۔ پدرانہ اور جاگیردارانہ نظام کس طرح کبھی مذہب کے نام پر تو کبھی طبقہ،

ذات پات کے نام پر عورت کی زندگی مرد کے ہاتھوں رہن رکھتا ہے۔ اس افسانے سے اس کی مثال ملاحظہ ہو:

''اچھا پاپا یہ بتایئے سب سے زیادہ شکار کس جانور کا ہوتا ہے؟'' پاپا کے چہرے پر بھونچال کی سی کیفیت اتر آئی وہ بڑبڑا کر گاؤ تکیہ چھوڑ کر سیدھے بیٹھ گئے اور مجھے اس انداز سے دیکھا جیسے میں نے کوئی جرم کیا ہوا۔ یا ان سے کسی گہرے راز کے بارے میں پوچھ لیا ہو۔ ان کی آنکھوں میں ایک دھواں سا اٹھا تھا۔ اور وہ بدبدائے تھے۔ ''جانور کا نہیں عورت کا ہوتا ہے سب سے زیادہ شکار۔''... ''میں عامر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' ''شیخوں کی بیٹیاں..... ان لوگوں میں.....''

''ہم تیری شادی نہیں کر سکتے۔''

شکیل صدیقی نے بہت سے موضوعات کو اپنے افسانوں کے لیے منتخب کیا ہے۔ انھوں نے افسانے کے لیے خام مواد اپنے آس پاس کی چلتی پھرتی زندگی سے حاصل کیا ہے۔ وہ افسانہ لکھنے سے پہلے سماجی زندگی کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ پھر اس پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس لیے ان کے افسانے حقیقت کے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں پیش آنے والے نشیب و فراز کو اپنے افسانوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ نہ صرف حقیقت کے قریب پہنچ گئے ہیں بلکہ ان میں دلکشی اور جاذبیت بھی پیدا ہوگئی ہے۔

''نہ میں دھرمی نہ ادھرمی'' شکیل صدیقی کی ایک عمدہ کہانی ہے۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر کیسی کیسی تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کا بہت عمدہ نقشہ انھوں نے اس کہانی میں کھینچا ہے۔

شکیل صدیقی کے افسانوں سے مذہبی اور طبقاتی علاحدگی کے علاوہ طوائفوں کی زندگی کے المیے، مزدور طبقوں کے دکھ درد اور فرقہ پرستی کی سفاکی مؤثر طور پر منکشف ہوتی ہے۔ سماج میں اتنا بدلاؤ آگیا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی ہانڈی کا پکا ہوا کھانے لگے ہیں۔ بلکہ ایک جگہ بیٹھ کر ایک پلیٹ میں بھی کھا لیتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کے خلاف دل میں نفرت اور عداوت رکھتے ہیں۔ پہلے لوگ مختلف فرقوں اور طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، بھوکے رہ کر بھی ایک دوسرے کی ہانڈی کا نہیں کھاتے تھے۔ لیکن اتفاق واتحاد تھا۔ ایک دوسرے سے ہمدردی تھی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں دل وجان سے لگ جاتے تھے۔ جو چیزیں بار بار ان افسانوں میں شدت کے ساتھ ابھرتی ہیں وہ ہیں اپنی زندگی کے اہم فیصلے لینے، عورت کا حق اور مذہب، ذات کے فساد میں الجھایا گیا وہ معمولی انسان جو روٹی اور امان کی جدوجہد سے ہی نجات نہیں پا سکا۔ یہ انسان کالی رات کا بریشا ہو، دروغائن کی جھنجھو ہو یا درد سے کیوں نہ بھر آئے دل کا کشن۔ یہ بھی مصروف زندگی میں اپنے وجود کی جنگ لڑنے والے کردار ہیں۔ جو ہمیں اپنے ارد گرد روزانہ نظر آتے ہیں۔

اسی طرح ان کے دیگر افسانے مثلاً اس کا دکھ، علاج، مجاہد آزادی، اعزاز اور کمبل، موت ایک امکان، ریلوے لائن پر لاش وغیرہ میں سماج و معاشرے کے الگ الگ مسائل و میلانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے سماج کا آئینہ ہیں جو ہمیں خبر دیتے ہیں کہ بدلاؤ جو خاموش قدموں سے آہستہ آہستہ اپنے پیر ہمارے درمیان ہی رہ کر کب مظبوط بنا لیتے ہیں۔ ان کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کی جیتی جاگتی تصویر بھی پیش کر دیتے ہیں۔

شکیل صدیقی کے افسانوں میں انداز بیان کا تسلسل، دلچسپی اور جاذبیت اس طرح برقرار رہتی ہے کہ قاری ان کی تحریر کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ موقع ومحل کی مناسبت سے شعر استعمال کر کے کردار کے بیان میں ایک تازہ حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ افسانہ نگار ماحول کی منظر نگاری اس طرح کرتے ہیں کہ قاری افسانوں کے دالانوں، دریچوں اور گلیوں میں زندہ کرداروں کو دیکھتا، سنتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

ان کا یہ افسانوی مجموعہ ادب کے سرمائے میں ایک اضافہ ہے۔ ان کی تخلیقات میں ان کے تخلیقی عہد کے حالات سانس لیتے ہیں۔ امید ہے کہ ہمیں آئندہ بھی ایسے ہی سروکاروں کے ساتھ ان کے افسانے پڑھنے کو ملتے رہیں گے۔

دکھ کا گاؤں

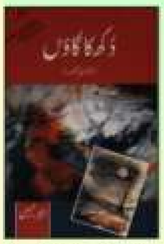

مصنف: ایم مبین

صفحات: 159، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی

محلہ گھیر مناف، امروہہ (یوپی) 44221

زیر تبصرہ کتاب ایم مبین کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں ان کے 16 افسانے مندرجہ ذیل عناوین سے شامل ہیں: دعوت، اسکول، دکھ کا گاؤں، اذیت نامہ، پرمپرا، آسیب، کیچڑ میں، جلوے، پس چہرہ، برف نہیں پگھلی، پرواز، ارتھی، بلی، گناہ، تلاش اور اے دل ناداں۔

اس کے علاوہ آخیر میں ان کا ایک مختصر سوانحی خاکہ بھی شامل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایم مبین صاحب ایک لکھاڑ قسم کے انسان ہیں کیونکہ 'دکھ کا گاؤں' سے پہلے ان کے آٹھ افسانوی مجموعے اردو میں اور تین ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہندی میں تین افسانوی مجموعے اشاعت کے لیے تیار ہیں۔ آپ کے تین ناول بھی ایک اردو اور دو ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس لحاظ سے ایم مبین صاحب ایک منجھے اور سلجھے ہوئے افسانہ نگار ہونے چاہئیں۔

ایم مبین صاحب کا افسانہ 'اسکول' بہت ہی خوبصورت اور بامقصد افسانہ ہے۔ اس طرح کے افسانے اردو زبان میں زیادہ سے زیادہ لکھے جانے چاہئیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ 'دکھ کا گاؤں' جو اس مجموعے کا نام بھی قرار پایا ہے اگرچہ اچھا افسانہ ہے مگر اس کی زبان بہت بچکانہ ہے۔ افسانے کا خاتمہ بھی صحیح طور پر نہیں ہو سکا ہے۔ افسانے کو آخیر میں کچھ ایسا موڑ دینا چاہیے تھا کہ 'دکھ کا گاؤں' دکھوں کا ہی گاؤں رہتا۔ جبکہ ایم مبین صاحب نے افسانہ اس لائن پر ختم کیا ہے ''جو اس کی باقی زندگی کو دکھوں سے پاک اور روشن کرنے والا تھا۔'' جب ایسا ہونا تھا تو یہ 'دکھ کا گاؤں' کیونکر ہو سکتا ہے۔

ایم مبین صاحب کا پانچواں افسانہ 'پرمپرا' ایک اچھا معلوماتی اور دل چسپ افسانہ ہے۔ ساتواں افسانہ 'کیچڑ میں' ایک اچھا افسانہ ہے شروع سے آخیر تک کہانی پن موجود ہے مگر آخیر تشنہ ہے۔ کہانی کو یوں ہی ختم نہ ہو کر 'حنا' کا بھی کوئی خاص رول ہونا ضروری تھا۔ وہ اپنے کردار سے اپنے اس زبانی دعوے کو ثابت کرتی ہے کہ ''ہر مسلمان اسامہ بن لادین نہیں ہوتا'' تو یہ ایک بامقصد افسانہ قرار پاتا۔ 'جلوے' ایم مبین کی ایک اچھی اور خوبصورت کہانی ہے مگر میسج غلط دیتی ہے۔ اگر 'مینا بھابی' خوددار ہیں تو کوئی خوددار ایسی حرکت نہیں کرتا جو مینا بھابی کر رہی تھیں۔ 'پس چہرہ' میں کردار کی بلند کرداری بہت خوب ہے پسند آئی۔ کہانی 'تلاش' کا سسپنس بہت خوبصورت اور دل چسپ ہے۔

ایم مبین صاحب کا افسانہ 'آسیب' ایک ڈرگ لینے والی لڑکی 'شیلی' کی روداد ہے جس میں کہانی پن کم ہے۔ زبان پر بھی گرفت کمزور ہے۔ مبین صاحب نے شیلی کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ہر کسی کی نظر میں وہ ایک من موجی، مست بولڈ لڑکی تھی'' کوئی من

موجی اور مست، بولڈ نہیں ہوسکتا۔

'اذیت نامہ' میں زبان و بیان کی خرابیاں بہت در آئی ہیں۔ 'اذیب نامہ' میں صفحہ 35 پر ہے کہ ''سنڈے کے دن سویرے 10-11 بجے تک سوتے رہتے'' ایک تو 'سنڈے' کے ساتھ دن کا لکھنا دوسرے، 'سویرے 10-11 بجے تک' سویرا نہیں ہوتا۔ سویرا طلوع آفتاب سے کچھ ہی دیر بعد تک رہتا ہے۔ اس طرح زبان و بیان کی غلطیاں اکثر افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان سبھی کی نشاندہی طوالت کا باعث ہوگی۔ اذیت نامہ کی زبان تو بہت ہی ناقص ہے بلکہ کسی نوسیکھیے کی زبان لگتی ہے۔ دیکھیے ''وہ ان پلنگ پر سوتے تھے اور ان پلنگ کے نیچے ان کا سامان رکھا ہوا تھا'' یہاں دونوں جگہ پلنگ کی جمع پلنگوں استعمال ہونی چاہیے تھی۔

'ارتھی' کا تو، ارتھ ہی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہانی یوں ہی شروع ہوتی ہے اور یوں ہی ختم ہو جاتی ہے البتہ اکثر جگہ کہانی پن ضرور جھلکتا ہے۔

ایم مبین صاحب کے یہاں کہانی لکھنے کا ایک اچھا سلیقہ موجود ہے مگر 'دکھ کا گاؤں' پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی لکھی کہانیوں پر نظر ثانی نہیں کرتے۔ بھاگتے دوڑتے کہانی لکھی اور شائع کرادی۔ 'دکھ کا گاؤں' کی پروف ریڈنگ بھی سنجیدگی سے نہیں کی گئی ہے کیونکہ اس میں پروفنگ کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں بعض جگہ جملے بے معنی اور بے ربط اور زائد بھی ہیں۔ اگر ایم مبین صاحب خود پروف ریڈنگ کرتے تو شاید املے کی غلطیوں کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی خامیوں پر بھی نظر ٹھہرتی کیونکہ ایک تخلیق کار خود ایک بہت اچھا ناقد بھی ہوتا ہے۔ ایم مبین صاحب کے یہاں خلاقیت تو خوب ہے مگر مزاج میں جلد بازی اور لاپروائی معلوم ہوتی ہے۔ 'دکھ کا گاؤں' میں در آئی خامیاں صرف ان کی غیر سنجیدگی کی غماز ہیں جس سے پرہیز کرنا ازبس ضروری ہے۔ 'دکھ کا گاؤں' میں نے بہت دل چسپی سے پڑھا بہت ہی خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ ہے ڈھیر ساری باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے مگر طوالت کی قیود دامن گیر ہیں۔

دان بھون

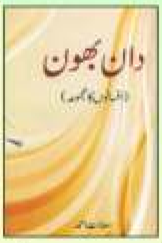

مصنف: سعادت احمد

صفحات: 96، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2015

طباعت: دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار

مبصر: آس محمد صدیقی، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر نظر کتاب 'دان بھون' سعادت احمد کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو 2015 میں تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکادمی کی جزوی مالی اعانت سے شائع کی گئی ہے۔ اس سے قبل ان کے افسانوں کے کئی مجموعے مثلاً 'دوسرا سفر' 'سمندر خاموش ہے' 'گلنار' 'ایوان محبت' اور چاندنی کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں کل دس افسانے شامل ہیں جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف موجودہ دور کے معاشرے اور اس کے تمام تر مسائل پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ 'رات اور دن' کے موضوع سے ہے۔ افسانہ نگار نے رات اور دن کے تحت زمینداروں اور کسانوں کے درمیان صدیوں سے چلے آرہے قرض لینے اور پھر وقت سے ادا نہ کر پانے کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کو نہایت ہی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ زمینداروں کے ذریعے کسانوں کا استحصال کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن اس افسانے کے مطالعے سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اب وقت بدل رہا ہے، مجبور، مظلوم اور بے بس کسانوں میں اب ظالموں سے ان کے ظلم کا حساب لینے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔

پون کمار (زمیندار) شنکر (کسان) کی بیوی کو حاصل کرنے کے لیے ظلم کی وہ ساری داستانیں لکھتا ہے جو وہ لکھ سکتا ہے لیکن اس کے باوجود شنکر اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ افسانہ نگار دور حاضر کے حالات سے بخوبی واقف ہے۔ آج کل روزانہ اخبارات میں اس قسم کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ آج فلاں گاؤں میں اتنے کسانوں نے خودکشی کرلی۔

'دان بھون' زیر بحث افسانوی مجموعے کا دوسرا اور اہم افسانہ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگار نے اسی کی مناسبت سے مجموعے کا نام 'دان بھون' رکھا۔ لفظوں کی ساخت کے اعتبار سے یہ دو الفاظ پر مشتمل ایک مرکب لفظ ہے جو کہ تشریح طلب بھی ہے۔ تشریح طلب اس وجہ سے کہ افسانہ نگار نے اسے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اردو زبان کی جائے پیدائش، اس کا پس منظر و ارتقائی سفر نیز موجودہ دور میں اس سے برتی جانے والی بے اعتنائی کو ''دان بھون'' کے تحت بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس کے مطالعے سے ہم اردو زبان کے عہد زریں سے بھی واقف ہوتے ہیں اور اس کی بدحالی کے دور کا مشاہدہ تو بہر حال ہم اپنی آنکھوں سے کر ہی رہے ہیں۔

اس افسانوی مجموعے میں شامل تیسرا افسانہ 'تنخیاں' ہے۔ اس کا موضوع عورت ہے اور معاشرے کے وہ بدکردار آدمی بھی جنھیں بقول غالب 'آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا' ہیں۔ فطری اعتبار سے عورت آدمی کی خوشی و انبساط کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ تکریم و احترام کی حق دار بھی ہے۔ اس اہم پہلو کا ادراک رکھنے کے باوجود معاشرے کے چند تعلیم یافتہ افراد بھی افسوسناک طریقے سے عورت کو صرف اور صرف ہوس مٹانے کا ایک آلہ سمجھتے ہیں اور اس کی زندگی کو جہنم بنانے میں کوئی کسر نہیں رکھ چھوڑتے۔ اس جوش و جنون میں وہ اپنی ذمے داری کو فراموش کر چکے ہوتے ہیں یہ وقت کا ایک بہت ہی سنگین المیہ ہے۔ اس کی مثال اس افسانے کا ایک کردار 'رحمن' ہے جو امریکہ سے آیا ہے اور جو 'زینو' کی عزت سے اس قدر کھلواڑ کرتا ہے کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

'جال' ایک اچھوتے موضوع پر مبنی افسانہ ہے جس کے تحت مخلوط تعلیم اور اس کے منفی اثرات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایک ساتھ پڑھنے والے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان پروان چڑھتے رشتوں اور ان کی وجہ سے معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل کو افسانہ نگار نے نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ موضوع بحث بنایا ہے۔

افسانہ 'نیا زمانہ' کا موضوع یونیورسٹی میں زیر تعلیم لڑکیاں ہیں جس میں نئے زمانے کی لڑکیوں کی تعلیمی زندگی کا نقشہ نہایت ہی دل کش پیرائے میں نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد ہمیں یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ یہ لڑکیاں ڈگری حاصل کرنے کے بعد جب عملی زندگی میں قدم رکھیں گی تو کس قسم کا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اس کہانی کے دو اہم کردار نرملا اور سریتا ہیں۔ نرملا کا تعلق مڈل طبقے سے ہے جبکہ سریتا ایک اونچے گھرانے کی آزاد خیال لڑکی ہے۔ یہ دونوں کردار اپنے اپنے طبقوں کی بھرپور نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی زبان، طرز تکلم اور رہن سہن سے افسانہ نگار نے اس افسانے میں کشش و خوب صورتی پیدا کردی ہے۔

پیش نظر مجموعے کے مطالعے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار افسانے کے تمام تر فنی لوازمات سے نہ صرف واقف ہے بلکہ انھیں عملی طور پر برتنے میں بھی اپنی مہارت کا ثبوت پیش کر گیا ہے۔ وہ نئے زمانے کے نئے مسائل سے خوب خوب واقف ہے خاص طور پر کالج اور یونیورسٹیوں میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کر رہے لڑکیوں

اور لڑکوں کی ذہنی کیفیت اور ان کے مسائل کی پیش کش پر وہ ملکہ بھی رکھتا ہے۔ اسی طرح 'تہہ بہ تہہ'، 'تجلّی' اور 'انجام' جیسے افسانے اس کے خلاقانہ ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔ کتاب طباعت، قیمت اور ضخامت کے اعتبار سے موزوں ومناسب ہے۔ موجودہ عہد کے مسائل پر جس غور وفکر، بصیرت وبصارت اور عمق گہرائی کے ساتھ اپنے تجربات ومشاہدات کو افسانوی قالب میں افسانہ نگار نے خوبصورتی وعمدگی سے ڈھالا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

حدوں سے آگے

مصنف: ڈاکٹر محمد مستمر

صفحات: 160، قیمت 160 روپے

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامع مسجد، دہلی

مبصر: عبدالرزاق زیادی، 121 چندر بھاگا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

اردو فکشن کی تمام اصناف میں مختصر افسانہ ابتدا سے مقبول اور ہر دلعزیز صنف رہا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اگرچہ اس میں موضوعات، تکنیک اور اسلوب و اظہار کی سطح پر مختلف تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن پھر بھی اس کی اہمیت وافادیت میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی بلکہ ہر دور میں اس میں اضافہ ہی ہوا۔ آج کی مصروف ترین اور بھاگم بھاگ والی زندگی میں تو افسانے کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ یہی وہ ادبی صنف ہے جس میں انسان کو فرصت کے لمحات میں اپنی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے موجودہ دور کو فکشن اور بالخصوص افسانے کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس طرح ہر دور میں اردو افسانے کی مقبولیت کی اساس موضوعاتی تنوع اور تکنیکی گوناگونیت کے ساتھ ساتھ اس کے غیر معمولی تاثر وتاثیر کو قرار دیا جاتا ہے اسی طرح ان کے لکھنے والوں کی ادبی قدر و قیمت ان کے خود تراشیدہ انداز واسلوب سے قائم ہے۔ رومانویت ہو یا حقیقت نگاری یا پھر جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت ہر دور میں افسانہ نگاروں کی ایک ایسی جماعت ضرور نظر آجاتی ہے جن کی ادبی شناخت کا دار و مدار موضوعات کے علاوہ ان کے منفرد انداز بیان اور اسلوب اظہار پر ہے۔ یہ سلسلہ تا حال جاری وساری ہے۔ ڈاکٹر محمد مستمر اکیسویں صدی کے ایک ایسے ہی فن کار ہیں جنھوں نے اپنے منفرد انداز واسلوب اور مخصوص موضوعات کی بدولت قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں بہت جلد کامیابی حاصل کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'حدوں سے آگے' اگرچہ ڈاکٹر محمد مستمر کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے لیکن علمی وادبی دنیا میں بہت پہلے سے ہی وہ اپنی شناخت ایک ادب شناس اور ناقد کی حیثیت سے قائم کرا چکے ہیں۔ 'علیم اختر مظفر نگری کی شاعری: ایک مطالعہ' (یوپی اردو اکادمی سے انعام یافتہ) اور 'تنقیص وتقریظ' ان کی اہم کتابیں ہیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں اور قارئین سے داد وتحسین بھی حاصل کر چکی ہیں۔ 'شاخ مرجھا گئی' کے عنوان سے ان کی پہلی کہانی سب سے پہلے 2008 میں ہریانہ اردو اکادمی کے موقر رسالہ 'جمنا تٹ' میں شائع ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد تو ملک وبیرون ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں ان کے افسانے زینت بنتے چلے گئے اور نتیجتاً یہ افسانوی مجموعہ 'حدوں سے آگے' معرض وجود میں آیا۔

زیر نظر مجموعہ 'حدوں سے آگے' میں ڈاکٹر محمد مستمر کے دس افسانے ناآسودگی، تحریک، قدموں کے نشاں، امتزاج، میرا قصور، شاخ مرجھا گئی، حدوں سے آگے، چولا، میرے استاد اور کل جگ میں...؟ شامل ہیں۔ اگرچہ یہ سارے افسانے عصری مسائل و معاملات پر لکھے گئے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کا تعلق جنسی موضوعات سے ہے۔ بقول ڈاکٹر اختر آزاد "محمد مستمر ایک بے باک افسانہ نگار ہیں۔ جنس ان کا محبوب موضوع ہے۔ جہاں تک ایک عام آدمی نہیں سوچ سکتا، وہاں تک مستمر کے تخیل کی اڑان پہنچتی ہے جسے افسانوی لباس پہنا کر قاری کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ساری چیزیں زندگی کا حصہ نظر آتی ہیں۔ وہ افسانے میں نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل، جن کا تعلق ہمارے شب وروز سے ہے، وہ ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

بلاشبہ پیش نظر مجموعے کے افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان میں خاص طور سے ان موضوعات ومسائل کو جگہ دی گئی ہے جو واقعی بہت ہی اہم اور حساس ہیں اور عام لکھنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہیں یا پھر انھیں موڈرنیٹی کا نام دے کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر محمد مستمر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ منٹو اور عصمت کی طرح انھیں مسائل و معاملات کو اپنا موضوع بناتے ہیں جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور ان کے اظہار و بیان میں انھیں کسی طرح کی کوئی پرواہ بھی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ان کا ٹائٹل افسانہ 'حدوں سے آگے' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اظہار و بیان کے لحاظ سے بھی مستمر کے افسانوں کو ایک امتیاز حاصل ہے۔ ان کو اپنی بات سلیقے کے ساتھ پیش کرنا خوب آتا ہے۔ دوران مطالعہ اگرچہ کچھ الفاظ وجملے ایسے مل جاتے ہیں جن کی بنیاد پر ان کے یہاں جنس زدگی اور فحش نگاری کا احساس ہوتا ہے لیکن جب ہم ان کی گہرائی میں جاتے ہیں تو وہ واقعی حقیقت حال اور تقاضائے کردار نظر آتے ہیں اور جن کے بغیر کہانی یا کہانی کار کا تانا بانا تیار ہی نہیں ہوسکتا ہے۔

کتاب کے ٹائٹل سے لے کر طباعت تک ساری چیزیں عمدہ اور جاذب نظر ہیں۔ سرورق پر بنی تصویر کتاب کے نام کی نمائندگی کرتی ہے۔ مجموعے کی ضخامت کے اعتبار سے قیمت بھی مناسب ہے۔ پیش لفظ طور پر لکھا ہوا ڈاکٹر اختر آزاد کا مضمون 'اکیسویں صدی کا افسانہ نگار: ڈاکٹر محمد مستمر' بھی بے حد اہم اور کارآمد ہے۔

شعری مجموعے

غالب اور درگت

مصنف: ٹی۔ این۔ راز

صفحات: 228، قیمت: 250/روپے، سنہ اشاعت 2016

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ظفر عالم، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی

ٹی۔ این۔ راز، کی کتاب 'غالب اور درگت' طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ یوں تو اردو ادب میں غالب کے حوالے سے مختلف ادیبوں نے اپنے ذوق نظر کے مطابق خامہ فرسائی کی ہے لیکن راز نے غالب کے حوالے سے اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ انھوں نے غالب کے اشعار کو طنزیہ ومزاحیہ پیکر میں ڈھالنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ راز اس سے قبل غالب کی 60 غزلوں کی اردو نما ہندی میں تشریح کر کے 'غالب۔ سنگیت کے سانچے میں ڈھلی غزلیں' کے عنوان سے ایک کتاب شائع کر چکے ہیں۔ غالب شناسی کے پہلے مرحلے میں بحسن خوبی کامیابی حاصل کرنے کے بعد مصنف کے اشتیاق میں مزید اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں انھوں نے غالبیات سے متعلق دوسری کتاب 'غالب اور درگت' کے نام سے قاری کی خدمت میں پیش کی۔

زیر تبصرہ کتاب کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کی راز کی سرشت میں مزاح پیوست ہے اور یہ خوبی انھیں رب کائنات کی طرف سے فطری طور پر ودیعت کی گئی ہے۔اس لیے وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کی ''ہنسنا ہنسانا ایک ربی نعمت ہے۔جب تک آدمی میں (Sense of Humour) اندر کی چیز نہ ہو تب تک اس کے لیے نہ ہنسنا ممکن ہے نہ ہنسانا''۔راز نے اپنے طبیعی میلان کی وجہ سے غالب کی شاعری کا انتخاب کرکے طنز و مزاح کی چاشنی سے آراستہ کیا۔یہاں یہ بات واضح ذہنی چاہیے کہ انھوں نے غالب کے شعری سرمایے کو صرف تفریحاً نہیں استعمال کیا بلکہ ان کی رنگا رنگ طبیعت نے آسان اور عام فہم الفاظ کا جامہ پہنا کر سماجی برائی کی طرف توجہ دلانے کی بہترین سعی کی ہے۔

نہ تو جیب میری کٹتی، نہ قمیض میری پھٹتی　　جو نکٹ بلیکیوں میں کوئی رشتہ دار ہوتا
پسر لیڈر کا پیچھے رہ گیا کچھ جعل سازی میں　　نہیں تو اس کا قد بھی باپ سے بڑا ہوتا
اس کے ہی روز و شب ہیں وہی کامیاب ہے　　جو خود ہی اپنے قول کا قائل نہیں رہا
ٹی وی ننگے پن کی ہے تبلیغ میں　　بچے اب ماں باپ سے شرمائیں کیا
مجھ کو ملے گا بیچے کا پیسہ نہ ایک بھی　　یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں
جیتے جی ہر لحد سے ہم تیل چرا کر لائے تھے　　مرنے کے بعد قبر پر کوئی دیا جلائے کیوں
انسانیت کو لوٹنے والوں کا کچھ علاج　　ایسے حرام جسموں کو بس لات چاہیے

انسانی معاشرے میں عورتوں کو مختلف مقام حاصل ہے کہیں ماں کے طور پر تو کہیں بہن کی شکل میں اور کہیں بیوی کے روپ میں تو کہیں سالی اور محبوبہ کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔راز نے بھی غالب کی طرح اپنی شاعری میں نسوانی کرداروں کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ان کی شاعری میں عورت مختلف شکل میں منفرد اداؤں کے ساتھ نظر آتی ہیں۔اس ضمن کے اشعار قاری کو بہت سارے تجربات و مشاہدات کا پتہ دیتے ہیں:

غصہ بیوی کا محبت کے سے　　بھولنا چاہا مگر یاد آیا
اس خوف سے کہ بیوی اڑا لے کہیں نہ جیب　　سویا تو میں ضرور تھا غافل نہیں رہا
یہ نہیں ہے وہ نہیں ہے، روز بیگم کا ہے تاؤ　　لے نہ ڈوبے ہم کو یہ اپنی گرہستی ایک دن
ہم وفا کا ان سے اب یہ صلہ پائیں گے کیا　　کر کے شادی عمر بھر جوتیاں کھائیں گے کیا
پیسے کا مول تول ہے اب عشق کا نہیں　　محبوب بھی بھروسے کے قابل نہیں رہا
کہیں بن نہ جائے زنجیر دل کی　　بہت ان کی زلفوں کے خم دیکھتے ہیں
میرے پیام عشق کا انجام یہ ہوا　　بھیجی ہیں اس نے گالیاں خط کے جواب میں

کہا جاتا ہے کہ کسی شاعر کے شعر میں شراب و شباب کا ذکر نہ ملے تو وہ صرف واعظ کا وعظ بن کر رہ جاتی ہے۔اس لیے راز نے غالب سے چھیڑ کرنے کی ٹھانی تو اس کا پورا حق ادا کیا بس فرق یہ ہے کہ انھوں نے ماڈرن زمانے کی مے گھول کر کاک ٹیل بنا دیا۔

غالب کے شعری سرمایے سے بہت سے شاعروں نے اپنے مذاق سخن کو کافی بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔راز نے لاشعوری طور پر ہی سہی غالب کی زمین پر کچھ ایسے اشعار کہے جس میں ایک جہان معنی آباد ہے شعریت کی بھرپور آمیزش کے ساتھ ساتھ داخلیت و تہہ داری کی بہترین کارفرمائی نظر آتی ہے:

کہیں بن نہ جائیں زنجیر دل کی　　بہت ان کی زلفوں کے خم دیکھتے ہیں
جب سے بڑھا ہے شہر میں موتوں کا سلسلہ　　ہمراہ اپنے رکھتا ہوں اک نوحہ گر کو میں

راز نے غالب کی زمین کو طنزیہ و مزاحیہ لہجے سے سرسبز و شاداب کرنے کے بعد انھوں نے اخبار دیکھیے، نذر زوف، جاڑے میں، پانی، لوگ، چائے کے عنوانات کے علاوہ اردو ادب کی مشہور شخصیتوں فانی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، شکیل، کنور مہندر سنگھ بیدی، قتیل شفائی، فراق گورکھپوری، ساحر لدھیانوی، احمد فراز وغیرہ کی زمینوں پر نظمیں اور غزلیں کہی ہیں جو حماقتن کے باب میں شامل کی گئی ہیں۔جگر مرادآبادی کی زمین پر کہے گئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رشوت کے ہتھکنڈے سیکھے ہیں بزرگوں سے　　آبائی وراثت کو پروان چڑھانا ہے
سودا تو چلو طے ہے پر اتنا سمجھ لیجے　　نیچے بھی ہے کچھ سیوا اوپر بھی چڑھانا ہے
اردو کا محافظ ہے ہندو نہ مسلماں ہی　　بے گود سے بچے کو اب کس نے اٹھانا ہے

کتاب میں شامل اردو ادب کے کئی مشہور معروف ادیبوں کی قیمتی آرا سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کی راز موجودہ دور کے ان بہترین شعراء میں سے ایک ہیں جن کی شعری حسیت کو پروفیسر گوپی چند نارنگ، کالی داس گپتا رضا، قتیل شفائی، ڈاکٹر بشر بدر، ندا فاضلی پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، کملیشور، اور حقانی القاسمی وغیرہ جیسے مایہ ناز ادیبوں نے سراہا ہے۔

راز کی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کے بارے میں حقانی القاسمی کی یہ رائے ہی کافی ہوگی کہ''...یہ ایک ایسا خوب صورت نگار خانہ ہے جو زندگی کے تمام رنگوں سے سجایا گیا ہے۔ایسی شاعری سفر و حضر میں آپ کی بہترین رفیق تنہائی ثابت ہو سکتی ہے''۔امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس کتاب کو مزید پزیرائی حاصل ہوگی۔

احساس آئینہ

شاعر: نجم الہادی
صفحات: 144، قیمت 250 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: جاوید ڈار، کاگروٹ، کالگام، (جموں وکشمیر)

شاعری کی عظمت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے خیالات کو کتنے پرزور اور حسین انداز سے زندگی پر منطبق کرتا ہے۔اس کی اخلاقی قوت، اس کا تخیل، اس کے جذبات و احساسات، اس کی قوت فکر، اس کا ذوق جمال زندگی کی آمیزش سے اس کے فن میں نکھار پیدا کرتے ہیں۔جہاں تک شاعری میں احساسات کا تعلق ہے تو یہ شاعری کی روح ہے۔یہاں احساس خیال کو جنم دیتا ہے اور خیال شاعر کا جزو لاینفک ہوتا ہے، وہ علم نہیں عرفان دیتا ہے۔وہ نظریہ نہیں نظر بخشتا ہے، گویا تخلیقی عمل ان دونوں کو بیک وقت اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور یہ تمام خوبیاں ہمیں نجم عثمانی کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'احساس آئینہ' کو 70 غزلوں سے مزین کیا گیا ہے لیکن حصہ غزل سے پہلے غزل ہی کی ہیئت میں چار حمدیہ اشعار ہیں۔موضوع ہر چند کہ روایتی ہے لیکن فنی برتاؤ میں حدت و ندرت نظر آتی ہے۔نیز قوافی بھی نہایت ہی خوبصورت استعمال میں لائے گئے ہیں۔پہلا شعر بطور نمونہ دیکھیے:

مٹی سے اس نے پھول کھلائے ہزار رنگ
رہتی ہے جن کو دیکھ کر انساں کی عقل دنگ

اس کے بعد تین نعتیں ہیں جس میں سے ہر نعت سات اشعار پر مشتمل ہے اور یہ بھی غزل ہی کے فارم میں ہیں۔مثلاً:

آپ کے نقشِ قدم سے راستہ روشن ہوا
ذات کے اندر سفر کا سلسلہ روشن ہوا
رحمتِ عالم ہیں وہ، ان کی اداؤں کے نثار
دشمنوں کے حق میں بھی دستِ دعا روشن ہو

زیرِ تبصرہ کتاب میں جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے، موضوعات اور معنوی طور پر ان میں روحِ عصر کی بے چینیاں ہی نظر آتی ہیں۔ لیکن مشاہدات و تجربات کے زاویے نئے نئے معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل فن شاعری کا دارومدار اور اس کی اساس پوری طرح تخیل کی مرہونِ منت ہوا کرتی ہے۔ اگر شاعری میں تخیل کا فقدان ہو تو ایسے موزوں مصرعوں کو کلامِ منظوم تو کہا جاسکتا ہے لیکن اسے کسی طرح بھی کسی فنکار کا فنی شاہکار نہیں کہا جاسکتا۔ چونکہ نجم عثمانی ایک حساس شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فنِ مصوری میں بھی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں لہٰذا وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں اس کا خاکہ اپنی مصورانہ صلاحیتوں اور ہنرمندی سے پورے طور پر ذہن کے کینوس پر پہلے ہی مرتب کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار کو پڑھتے وقت قاری کو شعر کی گہرائی اور گیرائی تک پہنچنے میں کسی طرح کی دقت درپیش نہیں ہوتی۔ ان کا اسلوب بے حد دلکش ہے اور زبان اپنی شیرینی اور شائستگی کی خود آئینہ دار ہے۔ میں یہاں پر موصوف کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ وگرنہ آپ کے مطالعے کے لیے کیا ملے گا:

آرزو کے شہر کی سوغات حصے میں ملی — دن کے خواہش مند تھے ہم رات حصے میں ملی
میں کربلائے زیست میں تنہا حسین تھا — میرے مقابلے پہ جہاں صف بہ صف تھے لوگ
اس سے بچھڑ کے چاند ستاروں سے کھیلنا — کیا خاک شب میں نور نظاروں سے کھیلنا
دیکھ ذرا ہشیار پرندے — آگے ہے دیوار پرندے
ٹوٹی کشتی کے لیے طوفان کیسے ہوگئے — وہ ہمارے حال سے انجان کیسے ہوگئے
آنکھوں کے سامنے تھا جو منظر بدل گیا — شاید مزاجِ شہرِ ستمگر بدل گیا

'احساس آئینہ' سے پہلے نجم عثمانی کا پہلا شعری مجموعہ 'شمار نفس' 1984 میں منظرِ عام پر آیا۔ چونکہ موصوف ترقی پسند تحریک سے کافی متاثر تھے لہٰذا اس مجموعہ کلام میں بھی ترقی پسند خیالات کی پوری چھاپ نظر آتی ہے۔ چونکہ غزل اور نظم شاعر کا پسندیدہ میدان رہا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ موصوف نے سب سے پہلے نظم پر ہی قلم اٹھایا اور ان کے قلم سے سب سے پہلے جو صنف نکلی وہ نظم ہی تھی۔ 'اردو زباں' کے عنوان سے سب سے پہلی نظم لکھی جس میں اردو زبان کی داستان حسرت بیان ہوئی ہے اور پھر دوسری نظم ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر 'آ انقلاب بڑھ کے مرا ہاتھ تھام لے' کے عنوان سے لکھی۔

زیرِ تبصرہ کتاب کا انتساب شاعر نے اپنی والدہ مرحومہ زبیدہ خاتون کے نام کیا ہے۔ پیش لفظ جناب علقمہ شبلی نے 'زندگی کا چہرہ' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں نجم عثمانی صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سید منظر امام صاحب نے تقریظ کے طور پر 'شاعری جو دامنِ دل کھینچتی ہے' کے عنوان سے موصوف کے ادبی سفر اور ان کی تخلیقات، نیز ان کے کلام کے چند اہم پہلو گنائے ہیں پھر خود نجم عثمانی صاحب نے اپنے حالاتِ زندگی کے کچھ اہم گوشے اور اپنے ادبی سفر کے آغاز سے ہمیں آشنا کیا ہے جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔

بہرحال 'احساس آئینہ' کو ادبی حلقوں میں پزیرائی حاصل ہونی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب قارئین کے درمیان ایک وقیع مقام حاصل کرے گی۔ میں ذاتی طور پر نجم عثمانی کو مبارکباد دیتا ہوں۔

خاکے

بادل چھاؤں

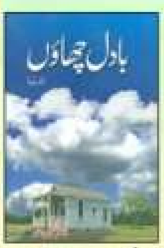

مصنف: ڈاکٹر شکیل احمد
صفحات: 208، قیمت: 180 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: فہیم بک ڈپو، مئوناتھ بھنجن، یوپی، سال اشاعت: 2016
مبصر: ابرار احمد اجراوی
پوسٹ: اجرا، وایا رایام فیکٹری، مدھوبنی 847237 (بہار)

ڈاکٹر شکیل احمد علمی و ادبی حلقے میں تعارف اور تعریف کے محتاج نہیں۔ اب تک ان کے زرخیز قلم سے کئی نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ 'اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی: ابتدا سے 1947 تک'، 'مئو: شہرِ ہنروراں' اور 'سمٹتا سائبان' ان کے تحقیقی، تخلیقی اور نیم تخلیقی نثری بیانیے ہیں۔

زیرِ نظر تاثراتی خاکوں کا مجموعہ 'بادل چھاؤں' ان کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے اساتذہ، بے تکلف معاصرین، احباب و رفقائے درس اور بزرگوں کا قلمی خاکہ اتارنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بقلم خود ٹائٹل پر بین القوسین خاکہ کا ذیلی عنوان چسپاں تو کر دیا ہے، مگر ان تحریروں کو صنف خاکہ کے مروجہ عناصر پر منطبق کرنا ذرا مشکل ہے۔ مصنف کو خود اس کا بجا طور پر اعتراف بھی ہے۔ ان تحریروں کے اجزاء کی بنیاد پر ان کو سوانحی، کوائفی اور تاثراتی مضمون قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک دو سوانحی مضامین بہت طویل اور مفصل ہیں، جب کہ بیش تر میں اختصار و اجمال کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ یہ تحریریں اقتباسات سے بالکل پاک تو نہیں، مگر غیر ضروری طویل اقتباس سے انھیں ثقیل بنانے کی کوشش بھی نہیں کی گئی ہے، کیوں کہ خاکہ جاتی یا نیم سوانحی تاثراتی تحریریں اخذ و نقل اور اقتباس سے زیادہ علم و مشاہدہ پر ارتکاز کرتی ہیں۔ ان تاثراتی تحریروں میں تاریخی واقعات و واردات کا اندراج بھی، اس کے صنف خاکہ میں شمولیت پر احتجاج کناں ہے اور پھر اس کا جابہ جا خالص علمی اسلوب نگارش بھی اسے سوانحی یا نیم سوانحی بیانیہ قرار دینے پر مصر ہے۔ بہرحال مؤلف نے اپنی منتخب پسندیدہ شخصیات کو شنیدہ سے زیادہ دیدہ عناصر سے ہم آمیز کر کے جس طرح رواں علمی اور ادبی انداز میں پیش کیا ہے، اس سے ان شخصیات کی زندگی کے شب و روز، ان کی علمی ادبی، تدریسی، مذہبی، سیاسی اور سماجی مصروفیات کا ایک بہترین مرقع تیار ہو گیا ہے۔ اندازِ تحریر کہیں خالص علمی اور تحقیقی ہے، تو کہیں کہیں خاکے کا امتیازی عنصر چٹخارے دار زبان بھی استعمال کی گئی ہے۔ جابہ جا مزاحیہ اور طنزیہ اسلوب بھی قاری سے روبرو ہوتا ہے۔

کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات سے وابستہ 16 شخصیات کا سوانحی تعارفی بیانیہ پیش کیا گیا ہے، ان میں کئی نام قومی سطح پر ہی نہیں، بلکہ عالمی سطح پر بھی شہرت و عظمت کے حامل رہے ہیں۔ حال ہی میں وفات پانے والے بیسویں صدی کے مشہور ماہر تعلیم اور سول سرونٹ سید حامد اور علم و تحقیق کی دنیا کے آفتاب نیمروز قاضی اطہر مبارک پوری ایسی نابغۂ روزگار شخصیات ہیں، جو نہ صرف ہندستان میں بلکہ بیرون ہند بھی عظمت و رفعت کا نشان تصور کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ جن شخصیات کا سراپا کھینچا گیا ہے، ان میں مولانا عبدالمجید حریری، مولانا امانت اللہ معروفی، فضا ابن فیضی، اثر انصاری، عابد سہیل، اوپندر ناتھ اشک وغیرہ بھی اپنے متعلقہ میدان میں ہندستان کی حد تک کم شہرت کی حامل نہیں۔ مصنف نے اخیر میں قند مکرر کے طور پر اپنی دوسری تالیفات پر مشاہیر اہل قلم اور ناقدین ادب کی طویل اور مختصر تبصرہ نما تحریروں کو شامل کیا ہے۔ ان تحریروں میں اکثر میں

مداحی کا پہلو ہے، مگر اطہر افضال اور جابر زماں کی مفصل تنقیدی تحریروں کی حرف بحرف شمولیت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کافی اعتدال پسند اور صاف گو ہیں اور اتنے نرم مزاج ہیں کہ تعریف و تحسین کے ساتھ مخلصانہ تنقید کو برداشت کرنے کا مادہ بھی رکھتے ہیں۔

فاضل مصنف ادب شناس خواص اور عوام الناس دونوں کے لیے لکھتے ہیں، اس لیے کتاب کا اسلوب اور انداز تحریر زیادہ علمی نہیں، بلکہ سادہ، عام فہم اور عوامی ہے۔ زبان بہت آسان، واضح، جملے چھوٹے چھوٹے اور اردو کے روزمرہ سے قریب ہے۔ کہیں اپنی علمیت و ادبیت اور فارسی آمیز اردو دانی کا رعب جمانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہی وصف کسی تحریر کو حیات جاودانی عطا کرتا اور مصنف و تخلیق کار کو عوام وخواص کے حلقے میں محبوبیت اور مقبولیت کی معراج طے کراتا ہے۔ چناں چہ اپنے علاقے کی ہر دل عزیز علمی شخصیت قاضی اطہر مبارک پوری کا خاکہ لکھتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''قاضی بابا تصنیف و تالیف اور کتاب وقلم کے آدمی تھے۔ اپنی وضع قطع سے عالم اور مدبر نظر آتے تھے۔ اسی کے ساتھ احباب، پڑوسی اور بچوں کے درمیان بہت بے تکلف بھی تھے۔ ہر قسم کی نمائش اور تصنع سے پاک تھے۔ ملنے ملانے میں جس قدر بے تکلف اور سادہ مزاج تھے دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ ان کے ساتھ کوئی تکلف نہ برتا جائے۔ بڑے بننے اور بزرگی کی نمائش سے انھیں چڑ تھی۔ اپنا ہر کام خود کرتے تھے۔'' (ص 37)

ڈاکٹر شکیل احمد کو جزئیات نگاری اور زیر نظر شخصیت کے جہان شعور و احساس کی سیاحت کرتے ہوئے، اس کی پرتوں کو کھولنے میں بھی درک حاصل ہے۔ وہ خاکہ لکھتے ہوئے اشخاص و افراد اور اس کے اعمال و اقوال سے سرسری نہیں گزرتے، بلکہ اس شخصیت کی پسند و ناپسند، نشست و برخاست، اس کے بود و باش اور دوسرے امتیازی عناصر کو انتہائی جزرسی اور غیر جانب داری کے ساتھ سپرد قرطاس کرتے جاتے ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ اردو کا تخلیقی مزاج کہیں متاثر یا مجروح نہیں ہوتا۔ مئو کے اپنے ایک ہم عصر دوجندر ناتھ پانڈے کی سراپا نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پان اور کھینی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے۔ عمدہ پان نفیس تمباکو زردہ اور پاندان گھر پر رکھتے تھے۔ چمکتا ہوا اگالدان بھی استعمال میں رہتا۔ یہ شوق گھر تک محدود تھا کالج اور کلاس میں اس سے پرہیز کرتے۔ دھوتی کرتا پاجامہ خاص مواقع پر استعمال کرتے پینٹ شرٹ سوٹ ٹائی بند گلے کا کوٹ یہ بھی پہنتے تھے۔ کالج انھی ملبوسات میں جاتے بالوں کی سفیدی پر خضاب سے قابو پانے کی کوشش کرتے۔'' (ص 113)

مصنف نے انھی صاحبان فکر و نظر کو موضوع تحریر بنایا ہے، جنھوں نے تعلیم و تدریس، سیاست و سماج اور تصنیف و تالیف کے میدان میں اپنے وقیع کارناموں کے نقوش ثبت کیے ہیں، اس لیے ان سوانحی تحریروں میں بھرتی کے غیر ضروری واقعات نہیں، بلکہ زیادہ تر معلوماتی اور مفید عناصر ہیں اور انھیں اشخاص و افراد کی مختلف النوع خدمات، ان کی کاوشوں اور ان کے روشن تجرباتی نقوش کو بیان کیا گیا ہے، جن سے مصنف ذاتی طور پر وابستہ اور متاثر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشخاص کے پہلو بہ پہلو مصنف بھی ہر جگہ قولاً و عملاً گردش کرتا اور اپنا مطلوبہ کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔ زبان و بیان رواں اور عام فہم ہے۔ پروف خوانی میں دقت نظر اور احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مگر اب بھی صد فی صد اغلاط کتابت سے پاک نہیں۔ امید ہے یہ کتاب بھی علمی اور ادبی حلقوں میں قدر دانی کے ہاتھوں لی جائے گی اور ان کی بصیرت کا معتبر حوالہ ثابت ہوگی۔ طباعت و کتابت معیاری اور عمدہ ہے اور قیمت بھی معقول رکھی گئی ہے۔

رسائل وجرائد

ادبی گزٹ

نگراں: ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی

مرتب: ظہیر حسن ظہیر

طباعت: اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس، مئو ناتھ بھنجن (یوپی)

مبصر: قرۃ العین، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ادبی گزٹ کے عنوان سے ظہیر حسن ظہیر نے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی نگرانی میں مئو ناتھ بھنجن سے ایک ادبی جریدہ کی اشاعت شروع کی تھی۔ اس کے چھ شمارے اس سے قبل منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جلد نمبر سات کی اشاعت بھی بہت پہلے ہو جانی چاہیے تھی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس کی اشاعت میں تاخیر ہو گئی۔ ظہیر حسن نے ابتدائیہ لکھتے ہوئے سال رواں میں وفات پانے والے ادیبوں اور شاعروں کو بھی یاد کیا ہے۔ ان کی تحریر ان ادیبوں کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا احاطہ کیے ہوئے ہے کہ اہل اردو پر جو غم کے پہاڑ ٹوٹے ہیں وہ ناقابل تلافی ہیں اور اردو دنیا کے لیے عظیم نقصان ہے۔ ظہیر حسن نے ان ادیبوں کی اسکرپٹ، اخلاقیات، خلوص و محبت اور طریقہ کار کو اختیار کرنے کو ہی اصل خراج عقیدت کہا ہے۔

عالمی اردو مجلہ ادبی گزٹ دور حاضر کے ادبی رسائل میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے اور اس کا ہر شمارہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادبی گزٹ نمبر 7 کے مشمولات اور مضامین کے حوالے سے بہت ہی وقیع اور معیاری شمارہ ہے۔ ادبی گزٹ کا اداریہ لاجواب ہے۔ موصوف نے ابتدائیہ میں جن ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں گفتگو کی ہے اس سے شمارہ کے معیار میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ زیر تبصرہ شمارے میں جتنے قلم کار شامل ہیں ان سبھوں کی ادبی دنیا میں ایک منفرد شناخت ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر مولا بخش، وغیرہ ایسے فنکار ہیں جنھیں بیک وقت تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے۔ ان کے مضامین میں تنوع ہے جبکہ حقانی القاسمی نے 'سخن شجر پر شاخ قندیل' میں یاور وارثی کی تخلیق کے حوالے سے جو مضمون تحریر کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ ان کی شاعری میں تازگی و تازہ کاری اور کلاسکیت کی روح ہے اور یہی کمال حقانی القاسمی کو اپنے عہد کے ممتاز ادیب و نقاد کہنے پر مجبور کرتا ہے۔

پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی اور پروفیسر طارق چھتاری کے مضامین دلچسپ اور معلوم افزا ہیں جبکہ احمد رشید نے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی شخصیت اور جہات کے عنوان سے ایک معلوماتی مضمون ہے جس میں انھوں نے موصوف کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔

زیر نظر شمارے میں اور بھی بہت سے مضامین ہیں جن میں محمد زبیر کا 'مولانا حالی کی سوانح نگاری کی معنویت'، مولانا حالی کی متنوع اور ہمہ جہت شخصیت پر ایک معلوماتی تحریر قرطاس پر بکھیری ہے۔ حالی سرسید کی اصلاحی اور ادبی تحریک کے ہم نوا بھی تھے۔ انھوں نے جتنے بھی اصلاحی و ادبی کارنامے انجام دیے ان سب کا احاطہ اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ زیر تبصرہ گزٹ میں 'نظر اپنی اپنی خیال اپنا اپنا' کے عنوان سے مختلف ادیبوں اور دانشوروں نے گزٹ کے حوالے سے جو نیک تمنائیں اور تاثرات بھیجے ہیں وہ لائق توجہ اور پڑھے جانے کے قابل ہیں۔

اس شمارے کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں تمام اصناف سخن کا احاطہ کرتے ہوئے مضامین شامل اشاعت کیے جاتے ہیں۔ اس گزٹ میں شامل مضمون 'ڈراما فسادی کی

تصویر کشی' مینولال کا تحریر کردہ ہے۔ فسادی عصمت چغتائی کا ایک مختصر ڈراما ہے جس میں ایک متوسط طبقے کے دو جوان دلوں کے جذبات محبت کی کہانی ہے۔ یہ ڈراما کئی معاملوں میں اہم ہے۔ عصمت نے اس ڈرامے میں ان لوگوں سے مکالمہ کیا ہے جو عشق تو کسی اور سے اور شادی کسی اور سے کرتے ہیں۔

اس شمارہ میں ایس ایم عباس، آنند لہر، عبدالمغنی شیخ، احمد رشید، شرافت حسین، ڈاکٹر محمد مستمر، جبیں نازاں، توصیف بریلوی، عبدالباری، صابر فخر الدین، اور سراج فاروقی کے افسانے اور افسانچے ہیں جنھیں پڑھ کر ان میں زندگی کی لہریں دیکھنے کو ملی۔ شارق عدیل اور سعید رحمان کی حمد اور اثر انصاری کی نعت عمدہ ہیں۔ اس میں شامل نظمیں اور غزلیں بھی اچھی ہیں۔ اس معیاری اور عمدہ گزٹ کے لیے دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے یہ امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس کو داد و تحسین سے نوازا جائے گا۔ روشن طباعت، عمدہ کاغذ اور بہترین ترتیب و تزئین کے باعث یہ کتاب معنوی اور صوری لحاظ سے بہت خوب اور کار آمد ہے۔

مختصر تبصرے

جستجو

مصنف: مینو بخشی/صفحات: 136

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مینو بخشی اردو کے شعری افق پر جس تیزی کے ساتھ نمودار ہوئیں ہیں اس بات کا ثبوت ان کا یہ تیسرا شعری مجموعہ 'جستجو' اب قارئین کے سامنے حاضر ہے۔ اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے 'شگفتگی' اور 'موج سراب' کے عنوان سے شائع ہو کر مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ اگرچہ مینو بخشی نے نظمیں، قطعات اور رباعیاں بھی کہی ہیں لیکن فطری طور پر وہ غزل کی شاعرہ ہیں۔

مجموعے میں شامل تمام غزلیں، عشقیہ رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں جس میں ایک عورت کی دلی کیفیت اور عشقیہ جذبات و احساسات کی ترجمانی بڑی عمدگی کے ساتھ کی گئی ہے۔ ان کی غزلیں عشق و محبت کے پرلطیف جذبوں کے ساتھ، سوز و گداز، ہجر و صال کی مسحور کن کیفیت سے قاری کو محظوظ کرتی ہیں۔ مینو بخشی اپنی شاعری میں صرف داخلیت کو ہی پیش نہیں کرتیں بلکہ خارجی فکر کے عناصر بھی نہایت سلیقے سے سمونا جانتی ہیں۔ ان کے یہاں عشق مجازی کا جو تصور دیکھنے کو ملتا ہے اس کے ڈانڈے عشق حقیقی سے بھی جا ملتے ہیں:

ترے حضور مجھے شرح آرزو کر کے
بڑا سکون ملا، تجھ سے گفتگو کر کے
وہ ایک نام جو میرے لیے ہے وجہِ سکون
میں اس کا نام جو لیتی ہوں تو وضو کر کے

اس قسم کے اشعار معنویت کی دبیز چادر اوڑھے دکھائی دیتے ہیں۔ اس قسم کے اور بھی کئی اشعار ہیں جن کا کلاسیکی اثر دکھائی دیتا ہے۔ مینو بخشی نے کلاسیکی غزل گو شعرا کا نہ صرف اثر قبول کیا ہے بلکہ ان زمینوں میں نہایت موزوں اشعار بھی کہے ہیں۔ مینو بخشی نے غزل کے اسرار و رموز کو ملحوظ رکھتے ہوئے فنی و فکری صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مصرعوں کی ساخت اور اس کی بنت میں معنوی جہت اور تہہ داری، اسلوب کی سادگی، نغمگی، شائستگی اور تغزل کو خاطر نگاہ رکھا۔

شام کی دہلیز پر

مصنف/ناشر: انس مسرور انصاری/صفحات: 152

زیر تبصرہ کتاب 'شام کی دہلیز پر' انس مسرور انصاری کا شعری مجموعہ ہے۔ انس مسرور انصاری اپنی شعری تخلیقات میں زندگی سے جڑی صداقتوں کو بڑی دل کشی اور خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے اشعار قاری پر عصری حسیت کے حوالے سے اپنی گرفت بنانے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ہر غزل میں عہد جدید کا کرب اور اقدار شکنی کی گونج صاف سنائی دیتی ہے جو معاشرتی، سماجی اور سیاسی فریب کاری، ذہنی انتشار، رشتوں سے فرار، غربت کی چوٹ، اقدار کی پامالی وغیرہ موضوعات پر مبنی ہے۔ ان اشعار میں فکری بصیرت اور فنی بصارت دونوں بدرجہ اتم موجود ہے۔ زبان کی سادگی اور دلکشی کے باعث یہ غزلیں اپنا مقام آپ بنانے میں کامیاب ہیں:

میں نے دن بھر کی مشقت کا صلہ پایا ہے
چند سکے ہیں میرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح
اس دور میں سچائی کا انعام ہے تذلیل
سچ بول کے دل آج پریشان بہت ہے

یہ اس قسم کے اشعار ہیں جس میں وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ یہ نئی نسل کے نوجوان شاعر کی فکر ہے جو وقت اور حالات کے تحت انسان میں خود اعتمادی اور حوصلہ بھرنا چاہتی ہے خیال کی پختگی اور توانائی کے ساتھ زبان و بیان کی سادگی اور دلکشی کے باعث یہ مجموعہ اپنا مقام بنانے میں کامیاب ضرور ہوگا۔

لاڈلے جانور

مصنف: متین اچل پوری/صفحات: 196

متین اچل پوری کی نظر ہمیشہ بچوں کی تربیت اور ان کی ذہنی نشو و نما کرنے میں مشغول رہی ہے۔ انھوں نے ہر عمر کے بچوں کے لیے نظمیں لکھی ہیں جو ان کے لیے راہ نما ثابت ہوتی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'لاڈلے جانور' میں بھی کم عمر بچوں کی نفسیات اور ذہنی سطح کو دھیان میں رکھ کر ان کی معلومات اور دلچسپی کے لیے جانوروں کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی نظموں کو پڑھ کر بچے جانوروں کی اچھی بری خصلت سے آگاہی حاصل کر سکیں گے۔ ایک طرف جہاں گھریلو جانوروں کی سادگی، افادیت اور وفاداری سے واقفیت ہو سکے گی وہیں خطرناک اور موذی جانوروں کو بھی جان سکیں گے۔ غرض کہ اس کتاب سے بچوں کو طرح طرح کے جانور سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ جیسے گھوڑا، کتا، بھینس، بکری، شیر، چیتا، پانڈا، چھپکلی، خرگوش، سانپ، گرگٹ وغیرہ۔ گویا یہ تمام جانور اپنی خوبی اور خامیوں کے باعث ہماری زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جس طرح کتا اور گھوڑا خیر خواہی اور وفاداری کی مثال ہیں تو گائے اور بھینس ہماری ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ گو کہ ان نظموں سے بچوں کو اپنے اطراف میں موجود بہت ساری معلومات کے ساتھ ایک بہتر انسان بننے کی طرف رغبت بھی مل سکتی ہے۔ یہ نظمیں بچوں کی پوشیدہ صلاحیتوں، قوتوں کو جگانے، ان میں نیک جذبہ پیدا کرنے اور اس پر عمل کرنے میں حوصلہ اور امنگ پیدا کر سکتی ہیں۔ امید ہے کہ متین اچل پوری کی یہ خوبصورت نظمیں بچوں کے ادب میں اضافہ ثابت ہوں گی۔

راحت افزا

مکان نمبر R-206، تیسری منزل، گلی نمبر 5، سرسید روڈ، ہلال ہاؤس، نئی دہلی۔ 25

عالمی نامہ

'گواہی خود میرے جذبات دیں گے' کا اجرا

کناڈا: 'حضرت امیر خسرو کلچرل سوسائٹی کینیڈا کے زیر اہتمام روزنامہ 'انقلاب' کے نمائندے صحافی اور شاعر شبیر شاد کے پہلے شعری مجموعہ کلام 'گواہی خود میرے جذبات دیں گے' کا اجرا معروف نقاد وادیب ڈاکٹر تقی عابدی اور معروف قلم کار ناظم الدین مقبول کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ صدارت سوسائٹی کے سرپرست ذیشان سحر نے کی، اسٹیج سکریٹری کے فرائض سوسائٹی کے نائب صدر داراب علی نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ تقریب اجرا میں ٹورنٹو کے سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔ کناڈا کے شہر مسی ساگا کے ہوٹل گرینٹ کونٹیلل کے وسیع ہال میں تقریب کا آغاز انگل ہیوروا اسکول کے طالب علم ایذان علی نے نعت پاک سے کیا۔ رسم اجرا کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی نے مجموعۂ کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شاعری ہماری تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ غزل صرف رومانی گفتگو کا نام ہے، اگر شاعر کے دل میں درد زمانہ بھی ہے تو وہ مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اصل مسئلہ انسانیت کا ہے، زمانہ تہذیب وتمدن کا نام تو لیتا ہے، مگر ایمانداری سے اس پر کھرا نہیں اترتا۔ انھوں نے ٹورنٹو کو اردو کا شہر بتاتے ہوئے کہا کہ وہ مجموعہ کے خالق شبیر شاد کو ایک معیاری مجموعہ کلام ترتیب دینے پر شہر ٹورنٹو کا سلام پیش کرتے ہیں۔ ناظم الدین مقبول نے کہا کہ غزل دراصل دکھ کی شاخ پر کھلتی ہے، شعر دھند میں ہوتے ہیں، خیال بارش کی بوندوں کے ساتھ اترتے ہیں۔ مضمون دھنک کے رنگوں سے آتے ہیں، جگنو کی روشنی میں تخیل کے سورج چمکتے ہیں، ادراک اور احساس لفظ چنتے ہیں۔ یہ سلیقہ جس کو آجائے وہ اچھا شعر تخلیق کرسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے شاد کی شاعری درد دل کی ترجمان اور درد زمانہ کی عکاس محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی غزل کو اپنے درد کی آواز بنایا ہے۔ شاعری کے روایتی موضوعات کو سادہ زبان میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور سہل اور عام فہم زبان اختیار کی ہے۔ سوسائٹی کے سرپرست ذیشان سحر اور صدر رفعت عالم نے سوسائٹی کی جانب سے مومنٹو پیش کیا۔

شبیر شاد نے سوسائٹی کے عہدیداران اور کارکنان کا اعزاز دیے جانے اور شعری مجموعہ کے اجرا کی تقریب منعقد کرنے پر شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر مشہور گلوکار شاہد علی خاں، رفعت عالم نے شبیر شاد کی غزل اور حاضرین کی فرمائش پر مختلف شعرا کی غزلیں اور قوالیاں پیش کی۔ تقریب میں وسیم الدین اسلم، شیخ ذکی احسن، عمران احمد، ظہیر حبیبی، محمد ناصر رئیس الدین خاں (سابق جیلر ٹورنٹو)، فاروق عمر، عالیہ ذیشان، اروما علی، وجاہت صدیقی، اسما عمر، یاسمین، ندیم علی (میوزک ڈائریکٹر) اشفاق احمد کے علاوہ ٹورنٹو کی اہم شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 مئی 2017

بزم احباب کناڈا کے زیر اہتمام مفت اردو اسکول کی سالانہ تقریب انعامات

مسسی ساگا: ہر سال کی طرح اس سال بھی مفت اردو اسکول میں تعلیم پانے والے بچوں کی سالانہ تقریب انعامات مسسی ساگا کے اسکول میں منعقد کی گئی جس میں سالانہ امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات میں انعامات اور اسناد تقسیم کیے گئے۔

تقریب کا آغاز جماعت اول میں تعلیم پانے والے سبحان غوری کی تلاوت سے ہوا پھر اسی ہونہار بچے نے نعت رسول مقبول کو متاثر کن لحن میں سنایا۔ اسکول کی خواتین اساتذہ آمنہ ظفر، شہلا کنول اور حسن جہاں کی جانب سے ترتیب دیے گئے ایک ثقافتی شو میں اسکول کی طلبہ و طالبات نے اردو زبان کی اہمیت پر تقاریر کیں۔ چند بچوں نے نظمیں سنائیں اور کچھ نے مزاحیہ کلام بھی پڑھا۔ ان میں مہرین فاطمہ، منام نوید، شارق امین، آمنہ حق، مروان سکندر، سارہ سکندر، حماد سید، محمد تمام چودھری، جہاں آرا، فودیل سید، عائشہ علی اور محمد حزیم ملک شامل ہیں۔

مفت اردو اسکول کے 12 سال مکمل ہونے پر کمیونٹی کی اہم شخصیات اور والدین نے اظہار خیال کرتے ہوئے انتظامیہ کے اخلاص اور اردو زبان کی خدمت کے جذبوں کو سراہتے ہوئے اسے ایک عظیم الشان کام قرار دیا۔ مہمانان خصوصی دل محمد نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے ناظم الدین مقبول اور ان کے رفقا کو مبارک باد دی اور زبان کے تئیں ان کے ایثار کے اعلیٰ جذبوں کو سراہا۔ آکسفورڈ کالج اور مدینۃ العلوم اسکول کے چیئرمین محمد واجد الدین نے اپنے خطاب میں مفت خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ اس خودنمائی اور ذاتی شہرت کے دور میں زبان کی خدمت ایک قابل ستائش کام ہے۔ مہمان خصوصی قونصل جنرل عمران صدیقی نے بچوں کی اس تقریب کو ایک بہترین تقریب قرار دیا۔ بچوں میں انعامات کی تقسیم اور اسناد کے علاوہ سالانہ امتحان میں اچھی کارکردگی دکھانے والے بچوں میں انعامات کی تقسیم پر انھوں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی جانب سے تعاون کا یقین دلایا۔ اس موقعے پر رکن صوبائی اسمبلی ڈاکٹر شفیق داری کی جانب سے تقریباً 50 طلبا و طالبات کو اردو تعلیم حاصل کرنے اور رضا کارانہ طور پر اردو پڑھانے والی خواتین کو توصیفی اسناد پیش کی گئیں۔

دوسری جانب رئیس الدین خان سابق چیف آف ٹورانٹو جیل اور ان کی بیگم کی جانب سے پیکرینگ میں ان کی رہائش گاہ پر سہارنپور سے آئے ہوئے مہمانان شبیر شاد اور راؤ محبوب علی کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ شبیر شاد کی صدارت میں جن شعرا و شاعرات نے اس نشست میں اپنا کلام سنایا، ان میں قرین شاہ، شگفتہ صدیقی، فرزانہ ناز، عبدالحی بشارت، سکندر ابوالخیر، بینا خالد، خالد عزیز، ناظم الدین مقبول، روا فاطمہ، منور جہاں منور، فاطمہ زہرہ جبیں، درخشاں صدیقی اور ذیشان سحر شامل تھے۔ مشاعرے کی نظامت ناظم الدین نے انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 جون 2017

مقصود الٰہی شیخ کی ادبی خدمات پر تقریب

برطانیہ میں مقیم نامور افسانہ نویس مقصود الٰہی شیخ کے ادبی مقام اور خدمات کے حوالے سے مقامی ریسٹورینٹ کینفے ریگل ٹی ٹی میں ایک خوبصورت تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کی میزبان فریدہ شیخ تھیں۔ شمالی انگلستان کے علمی ادبی سیاسی و سماجی طبقہ کے معزز خواتین و حضرات نے شرکت کی۔ یہ تقریب اپنی نوعیت کی بالکل منفرد تھی جس میں شیخ صاحب کی تخلیقات برائے فروخت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک میز پر ان کے فن اور شخصیت کے حوالے سے پنجاب یونیورسٹی لاہور اور دوسرے جامعات نے جو تحقیقی مقالاجات لکھے ان کی ایک ایک کاپی موجود تھی جو ان کی ادبی خدمات کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میزبان فریدہ شیخ نے اعلان کر رکھا تھا کہ آج شیخ صاحب کی جتنی کتابیں فروخت ہوں گی ان کی تمام کی تمام آمدنی کینسر ریسرچ کے ایک خیراتی ادارے Together against cancer کو دی جائے گی۔

ادب سے پیار کرنے والے جہاں جمع ہوں وہاں علمی و ادبی باتیں نہ ہوں ایسا ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ اس تقریب کو ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا۔ سب کو یہاں بات کرنے کا موقع فراہم کرنے کا اہتمام ہوا تو یعقوب نظامی نے ہال میں بیٹھے صاحب رائے اور اہل ذوق خواتین و حضرات کو موقع دیا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ آغاز میں یعقوب نظامی نے بریڈفورڈ کی ادبی تاریخ کے کچھ جھروکوں سے پردہ اٹھایا جب 55 سال پہلے شیخ صاحب اس شہر میں تشریف لائے تب یہاں ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی بہتات تھی علمی و ادبی منظرنامہ خالی تھا چنانچہ شیخ صاحب نے احباب کے ساتھ مل کر اس شہر میں علمی و ادبی فضا قائم کی جو گذشتہ پچپن سال سے جاری و ساری ہے۔ جوں جوں ماضی کے دریچے کھلنے لگے تو ہال میں موجود خواتین و حضرات بھی ماضی میں جا پہنچے اور پھر بات چیت کا ایک دلچسپ سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے اردو کے ایک منفرد افسانہ نویس انور سعید نے شیخ صاحب کی علمی کاوشوں پر بات کا آغاز کیا۔ انور سعید کی بات کو ڈاکٹر سلیم الرحمٰن نے آگے بڑھایا اور شیخ صاحب کی ادبی خدمات کا بہت ہی اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا۔ پھر ڈاکٹر صفات علوی نے شیخ صاحب کے جوانی کے افسانے اور ادبی خدمات سے حاضرین محفل کو روشناس کیا۔ شیخ صاحب کے ادبی مرید محمد شفیق نے اپنے مرشد شیخ صاحب کے ساتھ اپنے ادبی اور ذاتی تعلقات کو خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ اس تقریب میں مردوں کے شانہ بشانہ خواتین کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ بریڈفورڈ میں جو پہلی ادبی تقریب ہوئی اُس کی صدارت ایک خاتون صدیقہ شبنم حبیب (نامور شاعر حبیب حیدرآبادی کی بیگم) نے کی تھی۔ ڈاکٹر سکندر کے بعد مسز محمودہ نذیر نے ادب سے ہٹ کر شیخ صاحب کی سیرت پر بات کی جس سے پوری محفل بہت محظوظ ہوئی۔ آخر میں برطانیہ کی تاریخ میں پہلے ایشیائی لارڈ میئر محمد عجیب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مقصود الٰہی شیخ کی علمی ادبی اور صحافتی خدمات کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ مقصود الٰہی شیخ اور فریدہ شیخ نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: یعقوب نظامی، بریڈفورڈ، برطانیہ

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبر نامہ

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

مولانا ابوالکلام آزاد پر سیمینار

لکھنؤ: بھارت رتن ایوارڈ سے سرفراز مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک سوراج اور آزادی سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہندو مسلم اتحاد تھا۔ وہ مسلمانوں کو مذہب پر قائم رہتے ہوئے جنگ آزادی میں حصہ لینے کی دعوت دیتے تھے۔ ان کا دائرہ ادب و سیاست، مذہب تاریخ اور فلسفے کے میدان تک پھیلا ہوا تھا۔ مولانا آزاد کے نظریۂ باہمی، ہم آہنگی کی آج اشد ضرورت ہے۔ مولانا آزاد محب اردو زبان بھی تھے، اردو کے خلاف چلائی جانے والی مہم کے دوران مولانا آزاد نے ہندوستانی زبان کو سرکاری کام کاج کی زبان بنانے کی حمایت کی تھی مگر ملک کے بٹوارے کے بعد مولانا کا اردو کا دعویٰ کمزور پڑ گیا۔ ان خیالات کا اظہار اودھ ویلفیئر فاؤنڈیشن و قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے جے شنکر پرساد ہال، قیصر باغ میں منعقد سیمینار بعنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد' کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ سیمینار کے آغاز میں اودھ ویلفیئر فاؤنڈیشن کی صدر اور کنوینر پروگرام صبیحہ سلطانہ نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے انھیں گلدستے پیش کیے۔ سیمینار میں خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی سابق ریاستی وزیر انیس منصوری و ڈاکٹر تسنیم کوثر اسسٹنٹ پروفیسر کرامت حسین گرلس کالج نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے طور پر دنیا میں شناخت بنانے والے محی الدین احمد کی مذہبی معلومات کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اخبار 'الہلال' میں ان کے تحریر کردہ مضامین غیبی آواز کی مانند مسلم قوم کو

متاثر کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے جنگ آزادی میں کود پڑنے کی دعوت دیتے تھے۔ مولانا کی مادری زبان عربی تھی لیکن ان کی اردو تحریریں بھی لاجواب تھیں۔ سیمینار میں دیگر مقررین مسٹر قمر الہدیٰ، شہریار جلالپوری، ارجن پنڈت، الیاس منصوری، ڈاکٹر شوبھا ترپاٹھی، رمضان سیتاپوری وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ روزنامہ 'جدید خبر' 21 مئی 2017

خسرو شناسی پر سیمینار

لکھنؤ: ڈاکٹر خورشید جہاں سوسائٹی کی جانب سے حضرت امیر خسرو کی حیات و خدمات پر ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں سوسائٹی کی منیجر ڈاکٹر خورشید جہاں نے مہمانوں کا استقبال کیا اور خسرو شناسی پر روشنی ڈالی اور سوسائٹی کے غرض و غایت کو بیان کیا۔ پروگرام کے افتتاح میں حاجی حافظ عثمان صاحب انفارمیشن کمشنر نے کہا کہ اردو کی تشکیل و ترقی میں سب سے پہلا نام امیر خسرو کا آتا ہے، اردو امیر خسرو کی دین ہے۔ ورلڈ بک ڈے کے موقعے پر ڈاکٹر خورشید جہاں نے کہا کہ حضرت امیر خسرو سات سو سال پہلے ہندوستان آئے، صوبہ اتر پردیش پٹیالی ان کی جائے پیدائش ہے۔ جن کو سلطان الشعرا بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے آٹھ بادشاہتیں دیکھیں اور ان کے ساتھ رہے اور سب کے مقبول نظر رہے۔

ہم NCPUL کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کے بہت ہی مشکور و ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنا تعاون دیا اور اردو ادب کو فروغ دینے میں ان کی ہمہ جہت شخصیت قابل تعریف ہے۔ اس کے بعد کلیدی خطبہ پروفیسر آزرمی دخت صفوی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے امیر خسرو کی شخصیت اور شاعری پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج پورے ہندوستان کو امیر خسرو کی ضرورت ہے۔ ملک کی سالمیت کے لیے آج امیر خسرو کے پیغام کو ملک میں عام کرنا ضروری ہے۔

مہمان اعزازی کابینی وزیر ڈاکٹر ریتا بہوگنا جوشی

نے کہا کہ ہم ہمیشہ ایک رہے اور ہمیشہ ایک رہیں گے۔ خسرو سماج کا آئینہ ہیں اور انھیں ہندوستان کا طوطا کہا جاتا ہے۔ پروفیسر خان عاطف سابق صدر فارسی لکھنؤ یونیورسٹی نے بہت جامع تقریر کی اور کہا امیر خسرو نے ہندوستان کو جنت کہا ہے۔ یہ امن والمان اور باہمی رواداری کا مرکز ہے۔ پروفیسر تنویر چشتی اتراکھنڈ ممبر یوجنا آیوگ نے اپنے تاثرات میں کہا کہ خسرو گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ اردو اور ہندی زبان امیر خسرو کی طرف سے ہمارے لیے ایک تبرک ہے۔ نواب جعفر میر عبداللہ نے بھی اپنے بلند خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار کی نظامت انجینئر فرح سروش ملک نے انجام دی۔ محترمہ تسنیم انجم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خورشید جہاں، ڈاکٹر خورشید جہاں گرلس اینڈ بوائز انٹر کالج سمیتی لکھنؤ، 9 مئی 2017

حضرت امیر خسرو توسیعی خطبہ

نئی دهلی: شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی میں ہر سال کی طرح قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون

سے ساتویں حضرت امیر خسرو توسیعی خطبہ کا انعقاد 23 مئی 2017 کو ہوا جس کی صدارت پروفیسر علیم اشرف خان صدر شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی نے کی اور بطور خطیب، سابق صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر عمر کمال الدین نے شرکت کی۔ انھوں نے نکات بیدل کے دو اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ کے عنوان سے خطاب کیا اور انھوں نے بیدل اور نکات بیدل کی اہمیت وافادیت پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے اس کے دو اردو تراجم کے تقابلی مطالعے کے باعث نہایت دقیق وعمیق مشاہدہ سے ایسے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جو بالعموم اب تک تحقیق کی نظر سے افتادہ تھیں۔ پروفیسر چندر شیکھر نے پروفیسر عمر کمال الدین کے مقالہ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایسے پر مغز خطاب ریسرچ اسکالرس کے لیے بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ آخر میں پروفیسر علیم اشرف خان، صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے اپنے صدارتی خطبے میں لکھنؤ یونیورسٹی سے آئے ہوئے مہمان پروفیسر عمر کمال الدین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ ان نامور اساتذہ میں ایک ہیں جو مخطوطوں پر بڑا کام کرتے رہے ہیں۔ آخر میں انھوں نے بیدل کے حوالے سے نہایت عالمانہ گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بیدل کو سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے، کیونکہ بیدل کے یہاں ہندی، سنسکرت، برج بھاشا وغیرہ کے الفاظ وتراکیب پائی جاتی ہیں جس کی انھوں نے مثالوں سے وضاحت بھی کی ہے۔ اس توسیعی خطبہ میں نظامت ڈاکٹر علی اکبر شاہ نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مئی 2017

'اردو صحافت آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

اردو صحافت آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے نہرو یوا میلا کمیٹی کے زیر اہتمام 'اردو صحافت آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد' عنوان پر ایک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام میں مقالہ نگار اردو داں طبقے کے ساتھ اردو صحافت سے وابستہ افراد نے بھی شرکت کی۔

پروگرام کی صدارت مسلم راشٹریہ منچ کے جوائنٹ کنوینر محمد مظاہر خاں نے کی جبکہ اس سمینار کی نظامت کے فرائض حافظ تمیم احمد سیمی نے انجام دیے۔ آغاز تلاوت کلام اللہ سے حافظ عبدالباسط اور حافظ محمد عالم نے نعت رسول کا نذرانہ پیش کرکے کیا۔ سمینار کے مہمان خصوصی مسلم راشٹریہ منچ کے قومی کنوینر محمد افضال نے کہا کہ اردو صحافت نے جنگ آزادی سے لے کر آج تک ہر میدان میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جنگ آزادی میں اردو صحافت کے ذریعے ایسا ماحول پیدا کیا گیا جس سے عوام آزادی کے آندولن میں کود پڑے اور انگریزوں کی غلامی سے اس ملک کو نجات دلائی لیکن آج اردو صحافت کا مقام گرتا جارہا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم ایک بار پھر اس کے قد کو بڑھائیں۔

صولت پبلک لائبریری کے چیئرمین سین شین عالم نے کہا کہ اردو صحافت نے جس طرح جنگ آزادی میں قربانیاں پیش کیں۔ اسی طرح آج بھی یہ اردو صحافت ایک مشن کے طریقہ پر کام کررہی ہے جس کا تعاون ہماری ذمہ داری ہے، ہمیں اس کا تعاون کرتے ہوئے اس کا کردار اتنا بلند کرنا ہے کہ اس کی اپنی الگ پہچان بنے۔ ان کے علاوہ جے این یو کے ڈاکٹر شفیع ایوب بریلی کالج کی ڈاکٹر شیو یا ترپاٹھی، سید آصف حسن، محمد معروف، توقیر احمد وغیرہ نے بھی اردو صحافت پر روشنی ڈالتے ہوئے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کے اختتام پر نہرو یوا میلا کمیٹی کی صدر زیبا تبسم اور محمد جان ترکی نے بھی حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 مئی 2017

اردو افسانوں میں دیہی زندگی کی عکاسی

اونرهوا، بلرام پور: اردو افسانوں میں دیہی زندگی کا بڑا خزانہ موجود ہے۔ اردو افسانہ نگاری نے نہ صرف اردو ادب کے رخ کو موڑا بلکہ دیہی زندگی کو بھی جگہ دی۔ ان خیالات کا اظہار ایم ایل کے ڈگری کالج کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر طارق کبیر نے مدرسہ عائشہ صدیقہ گرلز اسکول کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے منعقدہ سمینار میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس سے قبل مدرسہ عائشہ صدیقہ گرلز اسکول کے وائس پرنسپل امتیاز احمد نے سوسائٹی کا مختصر تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر طارق کبیر نے کہا کہ اردو افسانے میں آغاز سے ہی دیہی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ جس سے دیہی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو افسانوں میں آج بھی دیہی زندگی کی عکاسی

دیکھنے کو ملتی ہے کیونکہ عصر حاضر کے افسانہ نگار کسی نہ کسی شکل میں دیہی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ اس موقعے پر سوسائٹی کے سرپرست مولانا عبدالعلیم مدنی نے تعلیم کی اہمیت اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے طلبا و طالبات کو محنت اور لگن کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی نصیحت کی۔ انھوں نے مختلف کہانیوں میں دیہی زندگی کے عنصر کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ افسانوں میں کہیں نہ کہیں دیہی زندگی کا پہلو نظر آتا ہے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر سعید احمد، ریسرچ اسکالر اور صحافی نثار احمد، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر حبیب الرحمٰن نے بھی کسانوں کے مسائل اور چھوت چھات کے مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے اردو افسانوں میں دیہی زندگی کی عکاسی کو مختلف رجحانات کی شکل میں واضح کیا۔ اخیر میں سوسائٹی کے چیئرمین احتشام خان نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 24 مئی 2017

وضع اصولِ اردو لغت سازی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے ٹرانسلیشن سیل کے زیر اہتمام، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومتِ ہند، نئی دہلی کے تعاون سے برائے 'وضعِ اصولِ اردو لغت سازی' کے موضوع پر منعقدہ سات روزہ قومی ورکشاپ کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ اردو میں لغت نویسی کے اصولوں پر بہت زیادہ کام نہیں ہوا ہے خاص طور پر لغت نویسی کے جدید اصولوں کی روشنی میں لغت سازی کے اصول وضوابط مرتب کرنے کی کوشش بڑے پیمانے پر نظر نہیں آتی۔ شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ اس سات روزہ قومی ورکشاپ کا یہی مقصد تھا کہ اردو اور دیگر زبانوں بالخصوص انگریزی کی ممتاز لغات کو سامنے رکھ کر جدید اصولوں کی روشنی میں اردو میں لغت نویسی کے اصول وضع کیے جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے صدر شعبۂ لسانیات پروفیسر علی رفاد فتیحی کی پہل پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے یہ سات روزہ قومی ورکشاپ منعقد ہوا جس میں تحریری طور پر اتنا مواد جمع ہوگیا کہ اردو میں لغت سازی کے موضوع پر ایک جامع کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر قاضی افضال حسین، مہمان خصوصی ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ، پروفیسر غضنفر، ڈاکٹر عارف حسن خاں، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی اور خود پروفیسر علی رفاد فتیحی نے

'اردو کی موجودہ صورتِ حال اور ہماری ذمہ داریاں' کے موضوع پر منعقدہ سمینار

جن خیالات کا اظہار کیا تھا اور رہنما خطوط کی نشاندہی کی تھی بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

ورکشاپ کے کنوینر پروفیسر علی رفاد فتیحی نے بذاتِ خود بے حد دلچسپی لی اور شرکا کی رہنمائی کی۔ ان کے علاوہ اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر غضنفر، ماہرِ عروض ڈاکٹر عارف حسن خاں، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، ڈاکٹر زبیر شاداب وغیرہ نے بھی اپنے تجربات اور مفید خیالات پیش کیے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد فریدی کے کلماتِ تشکر پر اس سات روزہ قومی ورکشاپ کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 مئی 2017

اردو کی موجودہ صورتِ حال اور ہماری ذمہ داریاں

احمد آباد: گجرات کی تاریخی یادگار سردار ولبھ بھائی پٹیل اسمارک بھون کے سمینار ہال میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور لوک سیوا سنگھ، احمد آباد کے باہمی اشتراک سے مورخہ 7 مئی 2017 بروز اتوار ایک قومی ادبی سمینار بعنوان 'اردو کی موجودہ صورت حال اور ہماری ذمہ داریاں' زیر صدارت ڈاکٹر نثار احمد انصاری منعقد ہوا۔

مہمانان خصوصی پروفیسر مان سنگھ، شعبۂ علم کیمیا سینٹرل یونیورسیٹی آف گاندھی نگر کانتی بھائی ایم کنٹرکٹر، ایوب خان (دوردرشن اینکر) ایڈووکیٹ اقبال شیخ، بدرالدین شیخ ایڈووکیٹ (میونسپل کونسلر) جناب تسنیم عالم بی ترمذی۔ ڈاکٹر نبیل صدیقی اور شاذیہ فریدی نے اردو کی موجودہ صورت حال پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے محبانِ اردو سے بچوں کو اردو اسکولوں میں بھیجنے کی طرف خصوصی توجہ دینے کی درخواست کی۔ پروفیسر مان سنگھ اور دیگر مہمانان خصوصی نے اردو کو ایک شیریں زبان قرار دیتے ہوئے اسے ایک قومی سطح کی عوامی زبان قرار دیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

صدر جلسہ پروفیسر نثار احمد انصاری نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد اردو کی ترویج و اشاعت میں کچھ مشکلات ضرور آئیں مگر محبانِ اردو کی محبت اور عقیدت نے جلد ہی اس زبان کو مقبولیت کے آسمان پر پہونچا دیا۔ آج اردو زبان ملک کی دیگر زبانوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہے۔ اس کی ترویج و اشاعت کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر کام ہو رہا ہے۔ آخر میں محمد مظفر حسین چشتی نے اپنے مہمانان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد مقالہ خوانی کی نشست کا آغاز ڈاکٹر نبیل صدیقی (دہلی) کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں 7 مقالے پڑھے گئے۔

مقالات کی قرأت کی دوسری نشست کی صدارت ڈاکٹر وسیم انور (مدھیہ پردیش) نے کی۔ دوسرے اجلاس میں بھی چار پر مغز مقالے پیش کیے گئے۔

صدر مجلس ڈاکٹر وسیم انور نے پیش کیے گئے مقالات پر اپنے زریں خیالات پیش کیے آخر میں اس پروگرام کے میزبان محمد مظفر حسین چشتی نے اظہار تشکر کے کلمات کے ساتھ قومی اردو کونسل بھارت سرکار کے پروگراموں نیز اردو کے فروغ کے لیے جاری کیے گئے اردو ڈپلومہ کورس کی خصوصی ستائش کی

پریس ریلیز محمد مظفر حسین، برائے لوک سیوا سنگھ احمد آباد، 30 مئی 2017

اقبال اور بیدل

نئی دہلی: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے انجمن اسلام میں منعقد ہونے والا لکچر 'اقبال اور بیدل' کے عنوان پر تھا جسے رام پور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید حسن عباس نے پیش کیا۔ پروفیسر سید حسن عباس نے انجمن کے ذمے داروں کو اس اہم موضوع پر لیکچر کے انعقاد پر مبارکباد دی اور بیدل عظیم آبادی اور علامہ اقبال کے شعری و فکری مشترکات پر روشنی ڈالی۔

انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال ان خوش قسمت لوگوں میں ہیں جن پر کثرت سے لکھا گیا ہے اور لوگ کچھ نہ کچھ اقبال کے بارے میں جانتے ہی ہیں لیکن بیدل کے ساتھ ایسا رویہ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ ان کو مشکل شاعر سمجھ کر کنارے کر دیا گیا۔ جبکہ ایسی بات نہیں۔ بیدل کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف خود اقبال نے 'مرشد کامل' کہہ کر کیا ہے۔ پروفیسر سید حسن عباس نے اپنے خطاب میں خاص کر بیدل کی حیات و خدمات کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور بتایا کہ علامہ اقبال کی نظر میں بیدل بہت محترم تھے بلکہ علامہ نے جن چار لوگوں سے خود کے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے ان میں ایک بیدل بھی ہیں۔ پروفیسر عباس نے نہایت صاف گوئی سے بیدل کے بارے میں تذکرہ نویسوں کی غلط باتوں کو خارج کیا اور کہا کہ اگر انھوں نے تحقیق و جستجو سے کام لیا ہوتا اور سنی سنائی باتوں پر توجہ نہ دی ہوتی تو شاید وہ بیدل کی تصویر صحیح اور اچھی پیش کر سکتے تھے۔ پروفیسر سید حسن عباس نے بیدل اور خسرو، بیدل اور غالب، بیدل اور اقبال کے درمیان پائے جانے والے فکری اشتراکات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بیدل انسانی زندگی اور اقبال زندہ دلی کا ترجمان شاعر ہے۔

جلسے کی صدارت انجمن اسلام کے وائس چیئر مین جناب مشتاق انتولے نے کی۔ انجمن کے ڈائرکٹر معروف اردو ناقد و محقق پروفیسر عبدالستار دلوی نے پروفیسر سید حسن عباس کا استقبال کیا۔ جناب مشتاق انتولے نے اپنی صدارتی گفتگو میں پروفیسر سید حسن عباس کی پر مغز تقریر کی ستائش کی اور کہا کہ پروفیسر عباس نے جس طرح موضوع کا حق ادا کیا ہے وہ ان ہی جیسے باخبر حضرات سے ممکن ہے۔ آخر میں سعیدہ پٹیل نے شرکا و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 9 مئی 2017

بڑودہ میں کل ہند مشاعرہ

بڑودہ شہر میں کل ہند محفلِ مشاعرہ

احمد آباد: دی اکھل بھارتیہ سماج سیوا ٹرسٹ، احمد آباد اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (بھارت سرکار) نئی دہلی کے باہمی اشتراک سے بڑودہ شہر کے روشن میموریل ہائی اسکول کے کیمپس میں بتاریخ 6 مئی 2017 ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ صدارت ڈاکٹر (پروفیسر) انور ظہیر انصاری نے کی۔

ابتداً مشاعرہ میں شریک مہمانان خصوصی شری امیت کمار سنگھ DRM بڑودہ، شری ایس کے ورما ADRM بڑودہ، شری دیپک مول چندانی سینئر DOM بڑودہ، شریمتی ڈاکٹر جینیا گپتا سینئر DOM(G) بڑودہ، شری نشانت نرائن DOM بڑودہ، شری ستیش بلوی (ہندی آفیسر)، زین العابدین انصاری اور صدر مشاعرہ ڈاکٹر (پروفیسر) انور ظہیر کے ہاتھوں انیس احمد انیس کے شعری مجموعہ 'تنویر غزل' کے اجرا کی رسم انجام پائی، اس کے بعد صدر موصوف نے 'تنویر غزل' کا مختصراً تعارف پیش کیا۔

رسم اجرا کے بعد نعت پاک سے باقاعدہ طور پر مشاعرے کا آغاز ہوا، جس میں شبیر ہاشمی، ذیشان بھڑ گانوی، عظیم دیواسی، ساجد جام نیری، ساگر ترپاٹھی، مقصود اشرف، نعیم آفتاب، محترمہ شہناز ملتانی، عارف شیخ، تاثیر صدیقی، عمر بارہ بنکوی اور نواب اندوری، ساگر برہان پوری اور 'تنویر غزل' کے خالق انیس احمد انیس نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا اور داد و تحسین حاصل کی۔ آخر میں ہندوستان گیر شہرت کے مالک طنز و مزاح کے استاد شاعر روشن خان گرگٹ احمد آبادی نے اپنے کلام سے محفل کو قہقہہ زار بنا دیا۔

شعری پروگرام کے بعد صدر مشاعرہ ڈاکٹر (پروفیسر) انور ظہیر انصاری نے اپنے خطبۂ صدارت سے نوازا، انھوں نے شعرائے کرام کو شعری تخلیق کے ساتھ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں عملی حصہ لینے کا مشورہ دیا۔ صدر موصوف کے بعد انور منصوری صدر دی اکھل بھارتیہ سماج سیوا ٹرسٹ احمد آباد نے مشاعرے میں تشریف لائے مہمانان خصوصی، شعرائے کرام اور بڑودہ کے ادب نواز سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (بھارت سرکار) کا ذکر کرتے ہوئے اس کے فعال کردار کی حد درجہ ستائش کی مشاعرہ کی نظامت قمرالحسن ساحل نے کی۔

پریس ریلیز: محمد اشفاق شیخ، احمد آباد، 31 مئی 2017

خواتین دنیا

خواتین کے لئے اردو میں سرکاری سطح پر شائع کیے جانے والا یہ واحد رسالہ ہے۔ آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان اس مجلہ کا یہ پہلا شمارہ ہے۔ جس میں خواتین کے مسائل و متعلقات کے حوالے سے خیال افروز اور فکر انگیز تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ ادبیات کا بھی ایک اہم گوشہ ہے۔ خواتین کے مزاج اور ذوق کے مطابق نگارشات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس میں آپ کو ہر صفحہ پر تنوع نظر آئے گا۔ خواتین کے لئے ایک مکمل رسالہ ہے جسے آئندہ اور بھی بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس کے لئے آپ کے مشورے اور تجاویز درکار ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ اپنی تخلیقات ارسال کریں اور اس رسالے کی ممبر سازی کے لئے بھی اپنا تعاون پیش کریں۔

ہندوستانی خریداروں کے لئے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 10 روپے

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھئے:

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی۔

110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

سودمند تعلیم سے ہی طلبا کی ترقی ممکن: پرکاش جاوڈیکر

لکھنؤ: مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب پرکاش جاوڈیکر نے کہا کہ سودمند تعلیم سے ہی طلبا کی ترقی ممکن ہے۔ طلبا کے لیے کتابی تعلیمات کے علاوہ شخصیت سازی کو اہم بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ تعلیم کا اصل مقصد ایک اچھا انسان بنانا ہونا چاہیے۔ جاوڈیکر گومتی نگر کے سٹی مانٹیسری اسکول کے آڈیٹوریم میں اساتذہ سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کے طلبا کو کتابی علم کے ساتھ ساتھ شخصیت سازی پر بھی خصوصی توجہ دی جارہی ہے جو لائق تعریف ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد اچھا انسان بنانا ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب سب کو بہتر تعلیم ملے۔ انھوں نے اساتذہ کی ٹریننگ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہر بچے میں کچھ نہ کچھ خوبی ہوتی ہے جس کو اساتذہ کو پہچاننا ہوگا اور اسی بنیاد پر اس کی شخصیت سازی کرنا ہوگی۔ جاوڈیکر نے مزید کہا کہ نہ تو تمام پرائیویٹ اسکولوں میں بہت اچھی پڑھائی ہوتی ہے اور نہ ہی تمام سرکاری اسکولوں میں تعلیم غیر معیاری ہوتی ہے۔ انھوں نے ریاست میں تعلیم کے گرتے ہوئے معیار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر چھٹے کلاس کے طلبہ کو درجہ چار کی باتیں نہیں معلوم تو یہ تشویشناک ہے۔ انھوں نے کہا کہ ٹیچروں کو تھوڑا سمجھا کر، تھوڑا موٹیویٹ کرکے اور تھوڑا ڈنڈے کا خوف دکھا کر اسکولی تعلیم کے معیار میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔ قبل ازیں، مرکزی وزیر نے شمع روشن کرکے اساتذہ اجلاس کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ پروگرام کی صدارت نائب وزیر اعلیٰ دنیش شرما نے کی۔ اس موقعے پر وزیر مملکت بیسک تعلیم انوپما جیسوال، وزیر مملکت برائے جونیئر ہائی اسکول تعلیم سندیپ سنگھ اور بی جے پی قومی ترجمان سدھانشو تریدی بھی موجود تھے۔ سی ایم ایس کے کوالٹی ایشو اور انیوویشن شعبے کی سربراہ شمتا باسو نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے سی ایم ایس کے بانی

ڈاکٹر جگدیش گاندھی اور ادارہ کے پریسیڈنٹ و چیف آپریٹنگ افسر پروفیسر گیتا گاندھی نے بھی خطاب کیا۔ پروگرام میں ملک کی مختلف یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے منتخب سی ایم ایس کے 57 طلبا اور حکومت ہند کی اطفال سائنس داں اسکیم سے سرفراز طلبا کے ساتھ ہی ملک اور بیرون ممالک میں منعقد تعلیمی مقابلوں اور سرگرمیوں حصہ لینے والی طلبا کی ٹیموں کو بھی سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 مئی 2017

مستقل ٹیچر کے تقرر پر ہی گرانٹ ملے گی

نئی دھلی: فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے کہا ہے کہ اگر کوئی کالج، یونیورسٹی یا تعلیمی ادارہ اپنے یہاں مستقل ٹیچر نہیں رکھے گا تو حکومت ان کی گرانٹ کا حصہ انھیں نہیں دے گی۔ یہ پوچھے جانے پر کہ دہلی یونیورسٹی اور دیگر کئی تعلیمی اداروں میں کنٹریکٹ پر ٹیچرس کی تقرری کی جارہی ہے اور سالوں سے وہ پڑھا رہے ہیں۔ اس طرح تعلیم کے معیار میں بہتری کیسے آئے گی، مسٹر جاوڈیکر نے کہا ''ہم نے کنٹریکٹ پر ٹیچر کی تقرری نہیں کی ہم تو کہہ رہے ہیں کہ آپ مستقل اساتذہ کی تقرری کریں۔ ہمیں مینڈیٹ تو مستقل ٹیچرس کے لیے ملا ہے۔ ہم نے سرکاری گرانٹ کو اس سے لنک کیا ہے۔ جو ادارے مستقل ٹیچرس کی تقرری کریں گے انھیں گرانٹ کا حصہ ملے گا۔ ہم نے معیار کو بھی اس سے مربوط کیا ہے جس سے تعلیمی معیار میں بہتری آئے گی اور اس سے گرانٹ میں بھی اضافہ ہوگا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 مئی 2017

سب کو شکشا، اچھی شکشا

نئی دھلی: فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزارت نے تین سالہ مدت کارکردگی مکمل کرنے پر اپنا رپورٹ کارڈ جاری کرتے ہوئے کہا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہم ہندوستان کے بنیادی تعلیمی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیمی نظام کو بین الاقوامی سطح پر معیاری اور مفید بنائیں گے۔ نیشنل میڈیا سینٹر نئی دہلی میں پرہجوم پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فروغ انسانی وسائل کے مرکزی

وزیر پرکاش جاوڈیکر نے کہا کہ وزیر اعظم نریندر مودی نے نعرہ دیا ہے ''سب کا ساتھ، سب کا وکاس'' اور ہماری وزارت کا نعرہ ہے ''سب کو شکشا، اچھی شکشا۔'' انھوں نے کہا کہ ہمارے دیش میں 26 کروڑ طلبہ و طالبات اور 22 لاکھ سرکاری اسکول ہیں جہاں تقریباً ایک کروڑ اساتذہ تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ سرکاری اسکولوں کے معیار میں نقص ہے لیکن نوودے ودیالیہ اور کیندریہ ودیالیہ کے معیار و وقار کی زبردست تعریف بھی کی۔ سہ سالہ کارکردگی رپورٹ پیش کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ گذشتہ تین برسوں کے دوران ہم نے تین کروڑ سے زائد افراد کو خواندہ بنایا ہے۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر نے اعلان کیا کہ حکومت جلد ہی پرائیویٹ سیکٹر کی مدد سے 20 ورلڈ کلاس انسٹی ٹیوٹ قائم کرے گی۔ انھوں نے یو جی سی کے ریفارم پر زور دیتے ہوئے کہا کہ حکومت اس کے لیے جلد ہی قدم اٹھائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ گیارہ سینٹرل یونیورسٹیوں کے معیار کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ پرکاش جاوڈیکر نے اپنی وزارت کی حصولیابیاں شمار کرانے کے دوران سب سے زیادہ زور تعلیم کے معیار پر دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 مئی 2017

ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی نئی چانسلر

نئی دہلی: منی پور کی گورنراور سابق مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی چانسلر منتخب کرلی گئی ہیں۔ یونیورسٹی سے جاری اعلامیہ کے مطابق وہ اس عہدے پر آئندہ 5 سال تک فائز رہیں گی۔

واضح رہے کہ 77 سالہ ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ کا لیفٹیننٹ گورنر (ریٹائرڈ) مسٹر ایم اے ذکی کی 5 سالہ میعاد مکمل ہونے کے بعد انتخاب عمل میں آیا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے اپنے اس عہدے کا چارج 26 مئی 2017 کو لے لیا ہے۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے نجمہ ہپت اللہ کا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی چانسلر منتخب کیے جانے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ڈاکٹر ہپت اللہ کی سیاسی اور سماجی دونوں خدمات سے فائدہ اٹھائے گی، ہمارے لیے یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہمیں ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 مئی 2017

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی بدلتی صورتِ حال

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام سابق صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد کے یومِ پیدائش کے موقعے پر فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی بدلتی صورتِ حال کے موضوع پر منعقدہ اس لیکچر میں جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر سید احتشام حسنین نے کہا کہ جن اہم شخصیات نے یہاں خطبہ پیش کیا ہے، وہ مجھ سے بہت زیادہ اہم ہیں۔ مجھے انتہائی مسرت ہے کہ مجھے اس لیکچر کو دینے کا موقع ملا۔ سابق صدر جمہوریہ کا تعلق دہلی سے تھا۔ انھوں نے جدوجہد آزادی میں بھی حصہ لیا۔ انھوں نے ہمارے ملک میں متعدد وزارتوں کی ذمے داری بھی نبھائی۔ ان کی سیاسی زندگی بھی خاصی موثر اور اہم رہی ہے۔ وہ صرف سیاسی لیڈر، ماہر تعلیم نہیں رہے بلکہ وہ سماجی مصلح بھی تھے۔ موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ تعلیم پر ملک کی حکومت خاصی رقم خرچ کرتی ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ 75 فیصد بچے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ 43 فیصد طلبہ و طالبات ایسے اداروں میں جاتے ہیں جنھیں حکومت مالی مدد نہیں دیتی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے بڑے بڑے شہروں سے لوگ آئی آئی ٹی میں آتے تھے اور اب چھوٹے چھوٹے شہروں سے بھی طلبہ و طالبات آئی آئی ٹی پہنچ رہے ہیں۔ لوگ پڑھنا اور پڑھانا چاہتے ہیں۔ سابق چیف جسٹس آف انڈیا جسٹس اے ایم احمدی نے ملک میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کے قیام اور اسے چلانے میں آنے والے مسائل پر گفتگو کی اور انھوں نے اپنا ذاتی تجربہ بھی بیان کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمن نے کہا کہ سید احتشام حسنین نے جس طرح کا پیپر پیش کیا ہے، اس پر سرسری گفتگو نہیں کی جاسکتی ہے۔ مسائل قابل غور ہیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ ڈاکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ ہم اس لیکچر کے ذریعے سابق صدر جمہوریہ کو یاد کررہے ہیں اور ہندوستان کی اہم شخصیات کو اس موقعے پر خطبہ کے لیے مدعو کرچکے ہیں۔ فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس لیکچر کی شاندار تاریخ رہی ہے اور آج کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ یہ ہوا کہ ہمارے درمیان اس ملک کے ممتاز سائنس داں پروفیسر سید احتشام حسنین موجود ہیں۔ اس موقعے پر جموں وکشمیر کے چیف جسٹس، جسٹس بدر دُرریز احمد مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔ جلسے میں شاہد مہدی، پروفیسر ارتضیٰ کریم، خواجہ شاہد، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر حنیف ترین، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر ابوبکر عباد، نورین علی حق، عینین علی حق، مظفر حسین سید، ذکی طارق، انجم جعفری، سفینہ، شہلا نواب کے علاوہ بڑی تعداد میں مختلف علوم وفنون کے لوگ شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مئی 2017

اتر پردیش:

انجمن محبان اردو کی شعری نشست

امروہہ: انجمن محبانِ اردو کی ایک شعری نشست ثروت چلڈرن ہوم محلہ چاہ غوری میں ہوئی جس کی صدارت مرزا ساجد امروہوی نے فرمائی۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر پٹیالہ یونیورسٹی پنجاب کے سابق پروفیسر ڈاکٹر ناشر نقوی مسند پر جلوہ افروز رہے۔ نظامت کے فرائض سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز حافظ طاہر حسن نے تلاوت قرآن پاک سے کیا جبکہ یاور علی نے مرزا ساجد امروہوی کی لکھی نعت پیش کی۔ واضح ہو کہ انجمن محبان اردو کی جانب سے خصوصی شعری نشستوں کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں کچھ مضمون نگار اپنے مضامین بھی پڑھتے ہیں۔ اس خصوصی محفل میں ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے اپنا انشائیہ 'رف کاپی' پڑھ کر سبھی کو متاثر کیا اور لوگوں نے انھیں بھرپور داد سے نوازا۔ مشہور افسانہ نگار شکیل جاوید نے 'پاگل کون' کے عنوان سے اپنا افسانہ پیش کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کی۔ اس کے بعد زبیر ابن سیفی، شمیم عباسی، ڈاکٹر مبارک امروہوی، ڈاکٹر ناصر امروہوی، شہاب انور نے کلام پیش کیا۔

آخر میں ڈاکٹر ناشر نقوی نے بے باک تبصرہ کیا۔ ناشر نقوی کی عالمانہ گفتگو کو سبھی نے پسند کیا۔ مرزا ساجد امروہوی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرے نزدیک تنقید سے مراد کسی تخلیقی پیش کش کے اسرار و رموز، خوبیوں، خامیوں اور اس کے بین السطور خیالات کی تقسیم پیش کرنے کے ساتھ ان کے ادبی معیار کا تعین کرنا بھی شامل ہے۔ اس موقعے پر عمائدین شہر کی بڑی تعداد موجود تھیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 مئی 2017

'علامہ اختر علی تلہری احوال و آثار' کے موضوع پر توسیعی خطبہ

علامہ اختر علی تلہری احوال و آثار

رام پور: شہرۂ آفاق رامپور رضا لائبریری کی جانب سے پانچویں توسیعی خطبہ بعنوان علامہ اختر علی تلہری: احوال و آثار کا اہتمام کیا گیا جس کا آغاز تلاوت کلام الٰہی اور نعت سرور کونینؐ سے کیا گیا۔ ڈائرکٹر لائبریری پروفیسر سید حسن عباس نے علامہ اختر علی تلہری کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مرحوم فارسی، عربی، اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کے ماہر اسکالر تھے۔ کئی زبانوں پر بیک وقت دسترس ہونے کا شرف حاصل ہونے کی وجہ سے آپ ہر بات کو بآسانی سمجھاتے تھے۔ آپ نے شعری و ادبی دنیا میں کافی کام کیا ہے۔ خصوصی مقرر سابق صدر شعبہ اردو میرٹھ کالج میرٹھ ڈاکٹر خالد حسین خاں نے علامہ اختر علی تلہری پر اپنا جامع مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے فروغ ادب کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اپنے آپ میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مرحوم کی ولادت 1902 میں ہوئی جبکہ وفات 1971 میں ہوئی ہے۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر آفتاب اختر نے کی جبکہ نظامت لائبریرین ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 26 مئی 2017

قاضی عبدالغفار کا فکری امتیاز

سنبھل: اترپردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے ماڈرن ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیراہتمام ایک قومی سمینار بعنوان 'قاضی عبدالغفار کا فکری امتیاز' منعقد کیا گیا جس میں مقامی و بیرونی شعرا و ادبا نے شرکت کی۔ دیپا سرائے میں واقع آزاد گرلس کالج کے ہال میں منعقدہ اس سمینار کا آغاز کالج کی طالبہ نے کیا بعد میں نعت پاک بھی پیش کی گئی۔ سمینار کی صدارت حاجی یامین برکاتی نے انجام دی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں قاضی عبدالغفار کو ایک ہمہ جہت شخصیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ قاضی صاحب نے جس میدان میں بھی طبع آزمائی کی اس میں ایک انفرادیت پیدا کی۔ ایم جی ایم کالج میں شعبہ اردو سے وابستہ ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس سمینار سے ہمیں قاضی عبدالغفار کی زندگی اور ان کی فنی خصوصیات کے نئے اور مخفی گوشوں کو جاننے سمجھنے اور ان پر غور وخوض کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ اس سے اردو شائقین کو اس کی تلقین حاصل ہوگی کہ وہ اردو کی ایسی دیگر شخصیات پر مزید کام کریں۔ اس موقع پر ڈاکٹر منور تابش، ڈاکٹر شہزاد احمد وغیرہ نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 10 مئی 2017

سرسید اور ان کی وراثت

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کی دوصد سالہ تقریبات کے تحت محسن الملک ہال میں

'سرسید اور ان کی وراثت' موضوع پر منعقدہ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی شعبۂ ہندی کے ممتاز استاد پروفیسر شمبھو ناتھ تیواری نے کہا کہ سرسید کی شخصیت کو کسی ایک فرقہ تک محدود نہیں کیا جاسکتا وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور یہی سبب ہے کہ انھوں نے بہت سے ایسے کام انجام دیے جوان سے قبل اور ان کے بعد کوئی انجام نہیں دے سکا۔ انھوں نے کہا کہ ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کے لیے انگریزوں نے جان بوجھ کر اردو ہندی کا جھگڑا پیدا کیا۔ انھوں نے حاضرین سے اپیل کی کہ وہ اپنے اندر سائنسی فکر پیدا کریں اور علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھائیں۔ اے ایم یو ایگزیکیوٹو کاؤنسل کے رکن ڈاکٹر نسیم احمد خاں نے کہا کہ سرسید نے 'آثارالصنادید' تصنیف کرکے دہلی کی اس تاریخ کو محفوظ کردیا جسے انگریزوں نے مٹانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ افسوسناک امر ہے کہ جب سرسید نے کالج کھولا تو قوم نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ انھوں نے سرسید کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی کئی کتب پر تفصیلی معلومات مہیا کرائیں۔ انھوں نے طلبہ سے اپیل کی کہ وہ علاقائیت سے دور رہ کر علیگیرین بنیں۔

پروگرام کو آرڈینیٹر پروفیسر شکیل صمدانی نے کہا کہ سرسید نے کالج کے قیام میں جس خلوص کا مظاہرہ کیا اس کی مثال کم ہی ملتی ہے اور انھوں نے سب کو ساتھ لے کر جس ادارہ کی بنیاد رکھی وہ آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں سب کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ انھوں نے سرسید کی زندگی کے ابتدائی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سرسید کو ایک مثالی انسان بنانے میں ان کی والدہ نے اہم رول ادا کیا۔ شعبۂ قانون کے استاد ڈاکٹر وسیم علی نے کہا کہ تعلیم کا اصل مقصد سبھی کو ایک بہتر انسان بنانا ہے جو سرسید چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے سارے مسائل کا حل تعلیم ہے۔ مہمان کا خیرمقدم لٹریری سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر غفران احمد نے کیا۔ نظامت ابراہیم قادری نے کی۔ جبکہ نصیب احمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر مختلف مقابلوں کے فاتحین کو مہمان خصوصی نے سرفراز کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 مئی 2017

انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام محفل مسرت

امروہہ: انجمن ترقی اردو اترپردیش شاخ امروہہ کا اجلاس دفتر انجمن پر زیرصدارت نائب صدر اترپردیش ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی کے بعنوان محفل مسرت منعقد ہوا۔ اجلاس کے دوران سرزمین امریکہ میں اردو ادب و ہندی ساہتیہ کے فروغ میں سرگرم کردار ادا کرنے والی تنظیم النور انٹرنیشنل کے کنوینر معروف شاعر نور امروہوی کو امریکہ میں شاندار عالمی مشاعرے کے انعقاد کے لیے مبارکباد پیش کرتے ہوئے نور امروہوی کی ادبی خدمات پر مسرت

کا اظہار کیا گیا۔ اجلاس کے آغاز میں کنوینر انجمن ترقی اردو اتر پردیش امروہہ مشکور حسن شوق امروہوی نے بتایا کہ امریکہ میں اردو ادب کی خدمات انجام دینے والے نور امروہوی آبائی طور پر امروہہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کاروباری وجوہات کے سبب فی الوقت امریکہ ڈیلیس ٹیکساس میں مقیم ہیں۔ کم عمری سے ہی اردو سے والہانہ عشق رکھنے والے نور امروہوی مغربی تہذیب کے درمیان امریکہ میں رہتے ہوئے اردو کے فروغ اور اس کی بازیابی کے لیے سرگرم کردار ادا کررہے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر مقررین نے بھی النور انٹرنیشنل کے بانی نور امروہوی کو گذشتہ دنوں امریکہ میں ہوئے کامیاب عالمی مشاعرہ کے لیے مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 5 جون 2017

تلنگانہ:

جامعہ عثمانیہ تاریخ تہذیب اور امکانات

حیدرآباد: جناب اے کے خان مشیر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ نے کہا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی صدی تقاریب سال بھر جاری رہیں گی اور اس میں مختلف پروگرام منعقد کیے جاتے رہیں گے اور ان میں عثمانیہ سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں کو شامل کیا جاتا رہے گا۔ وہ ہوٹل دی پلازا بیگم پیٹ میں جامعہ عثمانیہ صدی تقاریب کے سلسلے میں 'جامعہ عثمانیہ تاریخ، تہذیب اور امکانات' کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ قومی سمینار کے اختتامی اجلاس میں بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کررہے تھے۔ اس سمینار کا اہتمام محکمہ اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ اور تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکادمی نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ جس مقصد سے یہ سمینار منعقد کیا گیا وہ کامیاب رہا۔ انھوں نے کہا کہ دائرۃ المعارف کو اس لیے بچانا ضروری ہے کہ دارالترجمہ تو ختم ہوچکا ہے۔ یہاں علم کا قیمتی ذخیرہ ہے۔ جناب اے کے خان نے کہا کہ جب تک تاریخ کے بارے میں نہیں سوچیں گے اس وقت تک مستقبل طے کرنا مشکل ہے۔ پہلے اردو میں تعلیم ہوتی تھی اور انگریزی لازمی مضمون تھا اب صورت حال الٹ گئی ہے۔ جناب سید عمر جلیل سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود نے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی صدی تقاریب محکمہ اقلیتی بہبود یا اردو اکادمی کرے۔ لاکھوں لوگ جن کی یادیں اور احساسات جامعہ سے وابستہ ہیں ان کا یہ تاثر رہا کہ وہ صدی تقاریب کا حصہ نہیں بن سکے، اس لیے یہ تقاریب منعقد کی جارہی ہیں۔ عالمی اردو کانفرنس بھی منعقد کرنے کی تجویز ہے۔ ویژن آف عثمانیہ کا اہتمام کیا

لسانی اقلیتی فورم تمل ناڈو کے عہدے داران کی تمل ناڈو کے وزیر اعلیٰ مسٹر ای پلنی سامی سے ملاقات

جائے گا۔ جامعہ عثمانیہ میں اردو تعلیم کا تجربہ کامیاب رہا اور فارغین نہ صرف کامیاب رہے بلکہ وہ ایک مثال بنے اور اپنے اپنے شعبوں میں نام کمایا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 25 مئی 2017

تمل ناڈو میں فروغ اردو کی کوششیں

لسانی اقلیتی فورم تمل ناڈو کے عہدے داران نے تمل ناڈو کے وزیر اعلیٰ مسٹر ای پلنی سامی سے ملاقات کی اور اسکولی نصاب میں اقلیتی زبانوں کو شامل کرنے کا پرزور مطالبہ کیا۔ وفد میں ڈاکٹر سی ایم کے ریڈی (تلگو)، مسٹر ول چند جین (ہندی) مسٹر نارائن بھٹ (کنڑا) اور جناب انور (ملیالم) جناب پی کے شبیر احمد اور جناب ملک العزیز (اردو) شامل تھے۔ تملناڈو اردو رابطہ کمیٹی کے صدر جناب ملک العزیز نے ایک علیحدہ یادداشت میں تملناڈو اسٹیٹ اردو کو دوبارہ متحرک کرنے کا مطالبہ کیا۔ قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ریاست تمل ناڈو میں سن 2006 میں منظور شدہ قانون کی رو سے ریاست میں سوائے تامل کے اور کوئی زبان نہیں پڑھائی جائے گی۔ اردو، ہندی، تلگو، کنڑا اور ملیالم والے لسانی اقلیتی فورم، تملناڈو کے زیر اہتمام سیاسی اور قانونی سطحوں پر اپنے حقوق کی لڑائی لڑرہے ہیں۔ گذشتہ دو سالوں سے مدراس ہائی کورٹ نے اسٹے دے کر دسویں جماعت میں تمام زبانوں کے امتحانات کو بحال کیا۔ اب اگلے برسوں کا مرحلہ زیر آزمائش ہے۔ تمل ناڈو اردو رابطہ کمیٹی، عوامی سطح پر بیداری پروگرام منعقد کرتی آرہی ہے۔

پریس ریلیز: ملک العزیز، صدر تمل ناڈو، اردو رابطہ کمیٹی، 7 جون 2017

جھار کھنڈ:

فروغ اردو کانفرنس

دھنباد: الاصلاح اسکول واسع پور کے وسیع میدان میں 'ہمارا واسع پور چیریٹیبل فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام فروغ اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی ترنمول مغربی بنگال سے ترنمول ایم ایل اے معین الدین شمس نے اپنے خطاب میں کہا کہ اگر کسی قوم کی شناخت کو ختم کرنا ہے تو اس سے اس کی تہذیب و تمدن، زبان اور کلچر کو چھین لو اور قوم سے زبان چھن جائے گی تو وہ فوراً مر جائے گی۔ اردو زبان تمام ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ یہ اسی زمین سے پیدا ہوئی ہے۔ ہم اردو والوں کی بدنصیبی ہے کہ ہم نے اردو کو بھلایا ہی نہیں بلکہ اسے توڑنے میں تھوڑی بھی جھجک نہیں۔ آج اردو کی بدحالی کے ذمے دار حکومت سے زیادہ ہم خود ہیں۔ ہمارا واسع پور چیریٹیبل فاؤنڈیشن کے کوآرڈینیٹر محمد اعجاز علی نے ایک تجویز نامہ پیش کیا، ان میں خصوصی طور پر اردو کے فروغ کے لیے کیسے کام کیا جائے۔ 9 نومبر کو ڈاکٹر اقبال کا یوم پیدائش ہے اور 11 نومبر کو ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی یوم پیدائش ہے اس ادارہ کی جانب سے 9 نومبر سے 11 نومبر تک تین دنوں تک اردو میلے کا انعقاد اس سال سے شروع کیا جاتا ہے۔ اس موقعے پر معزز مہمان دھنباد ایسوسی ایشن کے صدر ایڈوکیٹ رادھے شیام گوسوامی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے اور لائبریری کھولنے میں مدد کرنے کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 مئی 2017

جموں و کشمیر:

تخلیق کار سے ملاقات

سرینگر: نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں 'تخلیق کار سے ملاقات' سلسلۂ تقاریب کے تحت ایک سادہ مگر بارونق ادبی نشست 23 مئی کو منعقد کی گئی جس میں اُردو کے معروف فکشن نگار وحشی سعید مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے۔ تقریب کی صدارت ناظمہ نظامت فاصلاتی تعلیم پروفیسر نیلوفر خان نے کی۔

تقریب کی ابتدا تلاوت کلام پاک سے ہوئی۔ اس کے بعد خطبہ استقبالیہ پروفیسر نیلوفر خان نے پیش کرکے تمام سامعین کا نہایت ہی احترام اور تزک و احتشام کے ساتھ استقبال کیا۔ تقریب میں ریاست جموں و کشمیر کے مشہور و معروف فکشن نگار جناب وحشی سعید نے اپنا ایک

'اقبال، شبلی اور عطیہ فیضی' کے موضوع پر منعقدہ تقریب

افسانہ 'ملک کا آخری بادشاہ' پڑھا۔ جس پر طلبہ و طالبات نے اچھی خاصی بحث کی۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر عرفان عالم نے کی جب کہ مہمان کا تعارف اور شکریے کے کلمات ڈاکٹر الطاف انجم نے پیش کیے۔

پریس ریلیز: الطاف انجم، اسسٹنٹ پروفیسر اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی، 29 مئی 2017

مہاراشٹر:

اقبال، شبلی اور عطیہ فیضی

بھیونڈی: ادبی کارواں، بھیونڈی کے زیر اہتمام اردو بیرا ہال میں منعقدہ ایک ادبی تقریب بہ عنوان 'شبلی، اقبال اور عطیہ فیضی' پر تقریر کرتے ہوئے معروف نقاد، کالم نگار اور شاعر شمیم طارق نے کہا کہ سیاسی، تمدنی اور ادبی تاریخ کو محض وقت گذاری کے لیے پڑھنا وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔ ماضی کے واقعات مستقبل میں رونما ہونے والے حالات کو سمجھنے اور ان کے مضر اثرات سے بچنے کی تحریک دیتے ہیں۔ موصوف نے تینوں افراد کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ عطیہ فیضی ایک سلیمانی بوہرہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ان پر مغرب کے اثرات غالب تھے لیکن وہ مشرقی انداز اور اردو و فارسی زبانوں وتہذیب کی دلدادہ تھیں۔ شبلی سے ان کا تعلق حسن علی فیضی نے کرایا جو ترکی میں کاروبار کرتے تھے۔ شبلی نے ان کے نام خطوط لکھے، ملاقاتیں کیں، شاعر تھے، جمالیاتی حس کے مالک تھے اس لیے اچھے جملے بھی لکھے مگر ان میں گناہ کا عنصر تلاش کرنا بذات خود ایک گناہ ہے۔ ان خطوط کا محرک گناہ کا نہ ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ عطیہ کے خطوط کو اپنی بیٹی اور گھر کی عورتوں کو بھی سناتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی عورتوں کی تعلیم کے قائل تھے اور تعلیم یافتہ مسلم عورت کا جیتا جاگتا نمونہ عطیہ میں دیکھتے تھے۔

اقبال بھی عطیہ کی طرف ان کے علم اور ذہانت کے سبب متوجہ ہوئے، عطیہ بھی اقبال کی طرف متوجہ ہوئیں ان کے تعلقات میں جذباتی لمحے بھی آئے، غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں مگر وہ تعلیم نسواں کو عام کرنے کے لیے ایک دوسرے سے قربت محسوس کرتے رہے۔ اس دور میں اقبال نے جو نظمیں کہیں ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں عشق کے تصور کا بتدریج ارتقا ہوا ہے۔

اس کے بعد کے دور میں اقبال نے آزادی نسواں اور حقوق نسواں کا جہاں یہ نعرہ بلند کیا کہ وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ ... وہیں یہ یاد دہانی بھی کی ہے کہ نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد... آپ نے مزید فرمایا کہ مسلم معاشرے میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بے سمتی کا شکار ہیں ایسے میں شبلی اقبال اور عطیہ کے تعلقات اس مسئلہ کا علاج تلاش کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ موصوف نے تینوں شخصیات کا تعارف کروایا پھر ان کے رشتے پر بھی روشنی ڈالی اور یہ نتیجہ نکالا کہ لڑکے، لڑکی دونوں کی تعلیم ضروری ہے مگر الگ الگ حدود میں رہ کر۔ فی زمانہ یہ حدود پامال ہورہی ہیں کیونکہ تعلیمی نظام اور ماحول ہی کچھ ایسا ہے اس لیے ضروری ہے کہ لڑکے اور لڑکی کو اپنی حد میں رہنے کا احساس ہم اپنے طور پر دلائیں۔

صدارتی خطبہ میں ایڈوکیٹ یسین مومن نے علامہ اقبال کے فرزند جسٹس جاوید اقبال کی کتاب 'زندہ رود' کی روشنی میں اقبال پر گفتگو کی۔ آپ نے شمیم طارق کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کے خطوط کی تشریح بعد کے لوگوں نے اپنے طور پر کی۔ جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب میں بہت تفصیل سے عطیہ فیضی کا تذکرہ کیا ہے موصوف نے کئی اقتباسات بھی سامعین کے گوش گزار کیے۔

استقبالیہ تقریر میں رکن ادبی کارواں فہیم مومن نے واضح کیا کہ آج کی ادبی تقریب کا مقصد علمی و ادبی شخصیات کے کارناموں، نگارشات اور تعلقات کی روشنی میں بدلتے ہوئے حالات میں ان کی معنویت تلاش کرنا اور ایسے معاشرے کی تشکیل کی کوشش کرنا ہے جہاں مرد و عورت اپنی حدود میں رہتے ہوئے اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ اس مجلس میں ممبئی سے محترم شاہنواز تھانہ والا، ان کی اہلیہ محترمہ ثمینہ شاہنواز، بھیونڈی سے سینئر صحافی محترم اختر کاظمی، ممبئی

سے معروف ہومیو پیتھی معالج ڈاکٹر انور امیر نے بہ حیثیت مہمان شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت صلاح الدین ایوبی ہائی اسکول کی معلمہ مومن ثمرین فرقان نے انجام دی۔ عبدالمجید انصاری نے شکریہ جبکہ مشتاق احمد نے مہمانان کے تعارف اور گل پوشی کے فرائض انجام دیے۔

پریس ریلیز: مومن فہیم احمد عبدالباری، بھیونڈی، 28 مئی 2017

شامِ افسانہ

ممبئی: نہرو سینٹر، ممبئی کی جانب سے 'شامِ افسانہ' کا انعقاد نہرو سینٹر کے کلچر ہال میں عمل میں آیا۔ اس افسانہ خوانی کی حسین محفل کے فنکار شہر کے دو اہم افسانہ نگار جناب سلام بن رزاق اور جناب اشتیاق سعید تھے۔ جبکہ نظامت کے فرائض جناب لطافت حسین قاضی (ڈائریکٹر کلچر، نہرو سینٹر) نے انجام دیے۔ موصوف نے ابتدائیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ نہرو سینٹر لگاتار 27 سال سے مشاعرے منعقد کرتا رہا ہے۔ اس بار ہم نے سوچا کہ افسانے پر بھی کچھ کام ہونا چاہیے، کیونکہ دن بہ دن افسانہ نگار کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں اور نئے لوگوں کی اس جانب پیش قدمی نہ کے برابر ہے۔ یہی سبب ہے جو ہم نے افسانہ خوانی کی یہ محفل سجائی ہے۔

اس محفل میں اشتیاق سعید نے اپنا افسانہ 'فرنگی' سُنایا، جو قومی یکجہتی پر مبنی تھا۔ اس افسانے کو سامعین نے خوب سراہا۔ بعدازاں سینئر افسانہ نگار سلام بن رزاق نے اپنا برسوں پرانا افسانہ 'ایکلویہ' سُنایا جو ہندو متھ پر مبنی تھا۔ جسے فیاض احمد فیضی نے خوب سراہا اور کہا سلام بن رزاق کا یہ افسانہ بہت سی خامیوں کے باوجود بے مثال افسانہ ہے۔ جبکہ سامعین پر سکوت کا غلبہ تھا۔ اس محفل میں نہرو سینٹر کے جنرل سکریٹری محترم آئی۔ ایم۔ قادری کے علاوہ فیاض احمد فیضی، فاروق سیّد، ڈاکٹر سلیم خان، ڈاکٹر ریحان انصاری، عبید اعظم اعظمی، شوکت مرزا، عبدالباری ایم۔ کے اور شاداب رشید موجود تھے۔ لطافت حسین قاضی کے شکریہ پر محفل اختتام کو پہنچی۔

پریس ریلیز: اشتیاق سعید، ممبئی، 30 مئی 2017

مدھیہ پردیش:

یادِ ملا رموزی

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی محکمہ ثقافت کے ذریعے گلابی اردو کے خالق ملا رموزی کی یاد میں 'یادِ ملا رموزی' کے تحت مورخہ 22 مئی 2017 رویندر بھون، بھوپال میں طنز و مزاح و ملا رموزی پر سمینار اور مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ پروگرام کے افتتاح میں اکادمی کی سکریٹری ڈاکٹر

نصرت مہدی نے پروگرام کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔

سب سے پہلے ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں اور ڈاکٹر رضیہ حامد نے 'ملا رموزی-فن، حیات اور شخصیت' پر اپنے مقالے پڑھے۔ اس کے بعد کل ہند مزاحیہ مشاعرے کی شروعات ہوئی۔ مشاعرے میں حضرات شفیق عابدی (بنگلور)، احمد علوی (دلی)، شاداب بے دھڑک (چینئی)، بے تکلف شاجاپوری (شاجاپور)، سراج شعلہ پوری (ممبئی)، طوفان آفندی (بھوپال)، واحد انصاری (برہانپوری)، شاہد عدیلی (حیدرآباد)، نشتر امروہی (امروہہ)، ارشد ندیم (دلی)، شیخ نظامی (جبلپور)، عبدالسلام کوکر (رتلام)، اشوک ناگر (اندور)، خورشید پچیکو بھوپالی (بھوپال) اپنا کلام سنایا۔ مشاعرے کی نظامت جناب شفیق عابدی، بنگلورو نے بہت خوبصورت انداز میں کی اور مشاعرے کے اختتام تک سامعین کو باندھے رکھا۔

پریس ریلیز: سکریٹری ایم پی اردو اکادمی، مدھیہ پردیش، 26 مئی 2017

اعزاز و اکرام:

ڈاکٹر طارق منصور اے ایم یو کے نئے وائس چانسلر

علی گڑھ: مشہور سرجن اور تعلیمی میدان میں قابل ریکارڈ کارنامے انجام دینے والے پروفیسر طارق منصور نے علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر کی حیثیت سے عہدہ سنبھال لیا ہے۔ انھوں نے عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنی ترجیحات پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ عالمی سطح پر مشہور اس یونیورسٹی کو بلند مقام دینے کی کوشش کریں گے۔ انھوں نے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یونیورسٹی کا قیام جن مقاصد کے لیے کیا گیا ہے وہ ان کی اولین ترجیح ہوگی۔ وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کے عہدے کی مدت آئندہ پانچ سال ہوگی۔ حال ہی میں وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے اعلیٰ تعلیم کے شعبہ کے ڈپٹی سکریٹری مسٹر سورت سنگھ کے دستخط سے جاری ایک مکتوب میں صدر جمہوریۂ ہند کے ذریعے پروفیسر منصور کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے تقرری کی اطلاع دی گئی تھی۔ پروفیسر منصور نے وائس چانسلر کے عہدے کا چارج لینے سے قبل سرسید کے مزار پر گلہائے عقیدت پیش کیے اور چارج لینے کے بعد سرسید ہال (نارتھ) اور موریسن کورٹ کے طلبا سے تبادلہ خیال کیا۔

پروفیسر طارق منصور 20 ستمبر 1956 کو علی گڑھ کے ایک معزز، تعلیم یافتہ اور باوقار خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ اسی یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ انھوں نے 1978 میں جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس اور 1982 میں ایم ایس کی ڈگری حاصل کی۔ 1994 میں انھوں نے انٹرنیشنل کالج آف سرجنس سے ایف آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنی 35 سالہ عملی زندگی میں وہ متعدد انتظامی عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ 2013 میں انھوں نے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کے پرنسپل اور سی ایم ایس کا عہدہ سنبھالا اور چند ہی سال میں انھوں نے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کو نئی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ انھوں نے 1983 میں جنرل سرجری شعبہ میں کلینیکل رجسٹرار کی حیثیت سے جوائن کیا اور ایم بی بی ایس کلاس کے لیے تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔ پروفیسر منصور کے 90 سے زائد تحقیقی مقالات قومی و عالمی سطح کے جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ 80 سے زائد قومی و عالمی کانفرنسوں میں حصہ لے چکے ہیں۔ انھوں نے 49 پوسٹ گریجویٹ تھیسس کی نگرانی کی ہے اور وہ کئی اہم اعزازات سے سرفراز کیے جا چکے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 مئی 2017

سید محمد اشرف 'نواں قومی ایکتا ایوارڈ' 2017 سے سرفراز

علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی کے پرانے طالب علم اور مشہور و معروف مصنف و افسانہ نگار سید محمد اشرف (IRS)

ممبر، انکم ٹیکس سیٹلمنٹ کمیشن و نائب صدر البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی، علی گڑھ کو 'نواں قومی ایکتا ایوارڈ 2017' سے آل انڈیا قومی ایکتا منچ، مغربی بنگال اردو اکادمی اور راشٹریہ اردو بھاشا وکاس پریشد کی جانب سے منعقد ہوئے ایک قومی سمینار میں نوازا گیا۔ یہ ایوارڈز سید محمد اشرف صاحب کو اردو ادب میں ان کی اہم خدمات کے لیے نوازے گئے ہیں۔ اس موقعے پر البرکات ایجوکیشنل کے ریاستی صدر پروفیسر سید محمد امین کے ساتھ البرکات ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز کے تمام تدریسی و غیر تدریسی عملے نے انھیں مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 مئی 2017

رام پور میں یوم صحافت وتقریب اعزاز

رامپور: رامپور رضا لائبریری اور صولت پبلک لائبریری کے اشتراک سے خیابان رضا واقع رنگ محل میں 'یوم صحافت وتقریب اعزاز' کی ایک پروقار محفل منعقد کی

گئی جس کی صدارت ثروت عثمانی اسٹیشن ڈائرکٹر آکاشوانی رامپور نے کی جبکہ نظامت کے فرائض پروگرام کنوینر اور صولت پبلک لائبریری کے چیئرمین س ش عالم نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ پروگرام میں مہمانانِ ذی وقار کے طور پر ٹی پی سنگھ اے ڈی جے، معروف مصنف ڈاکٹر شریف احمد قریشی، ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مارتنڈ پرتاپ سنگھ، سٹی مجسٹریٹ اوم کار سنگھ، سبکدوش پروفیسر سید سعید احمد، ضلع انفارمیشن آفیسر عقیل احمد موجود رہے۔ تقریب کو مہمانِ خصوصی ٹی پی سنگھ، محمد مسلمین، تمکین فیاض، اکھلیش شرما، وپن کمار شرما، شاہد محمود خاں، شعیب صدیقی، روی کمار سکینہ نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے پر ان بزرگ صحافیوں کو دوشالہ اعزاز اور خصوصی انعامات سے سرفراز کیا گیا جو عرصہ دراز سے صحافت کی دنیا میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں یا دے چکے ہیں جن میں مہیندر پرساد گپتا، ہوش نظامی، اوم کار رتن اوم، ناظم علی خاں ناظم، شاہد محمود خاں، مجتبیٰ عابدی، عبدالملک سلیم، رفیع الدین خاں، فضل شاہ فضل، محمد صولت علی خاں (علیگ) اور مشکور احمد خاں قابل ذکر ہیں جبکہ ان صحافیوں کو بھی اعزاز دیا گیا جو فی الوقت صحافت کے میدان میں سرگرم ہیں جن

محمد مسلمین، تمکین فیاض، عادل مجددی، ڈاکٹر شعائراللہ خاں، غفران فریدی، ذیشان مراد، سندیپ کمار پنو، شکور خاں، شنو خاں، عامر خاں، فہیم قریشی، خورشید احمد خاں، وپن کمار شرما، اکھلیش شرما کے نام قابل ذکر ہیں۔ ضلع کی سوشل تنظیموں کے صدور کو بھی ٹرافی دے کر ان کی سماجی خدمات کو سراہا گیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 22 مئی 2017

احمد عرفان کو ادب وسماجی خدمات کے لیے اعزاز

لکھنؤ: محبان اردو کی جانب سے فعال ادیب اور سماجی کارکن احمد عرفان علیگ کو اترپردیش کے سابق کارگزار

وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عمار رضوی کے بدست مسیحا اردو سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک اعزازی سرٹیفکیٹ وشال پیش کی گئی۔ اعزازی سرٹیفکیٹ وشال پیش کرنے والے وفد نے سوسائٹی کے سرپرست سدرت اللہ انصاری، سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر مسیح الدین خان، ناگرک ادھیکار پریشد کے صدر رفیع احمد وغیرہ موجود تھے۔ اعزازی سرٹیفکیٹ وشال پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الدین خان نے کہا کہ احمد عرفان علیگ کو یہ اعزاز ان کی اردو زبان، ادب اور سماجی خدمت کے لیے دیا جارہا ہے۔ سدرت اللہ انصاری نے کہا کہ آج ہمارے لیے خوشی کی بات ہے کہ احمد عرفان علیگ جیسے متحرک وفعال شخص کا اعزاز کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ ڈاکٹر مسیح الدین خان اکثر چھوٹے بڑے پروگرام کرتے رہتے ہیں اور یہ اردو زبان اور محبان اردو کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 28 مئی 2017

پاپولر میرٹھی کو دبئی میں سرٹیفکیٹ اور نشان یادگار سے نوازا گیا

دبئی: دبئی میں ہندوستانی سفارت خانہ کے ذریعے منعقد

جشن گلزار دہلوی کے مشاعرہ میں معروف شاعر پاپولر میرٹھی نے خوب داد لوٹی۔ اندر دھنش نام سے منعقد اس پروگرام میں گلزار دہلوی کے علاوہ منظر بھوپالی اور پاپولر میرٹھی کو بھی بلایا گیا تھا۔ ہندوستانی سفارت خانہ میں منعقد اس پروگرام میں دبئی کے مقامی لوگوں کے علاوہ وہاں موجود ہندوستانیوں نے بھی کافی تعداد میں شرکت کی۔ پش کن آغا نے پروگرام کی ذمے داری کو سنبھالا۔ جبکہ امان رضوی نے نظامت کی۔ اس موقعے پر دبئی کے انتظامیہ افسران نے سرٹیفکیٹ اور نشان یادگار دے کر پاپولر میرٹھی کو نوازا۔ اس موقعے پر دیگر شخصیات کو بھی افسران کے ذریعے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 مئی 2017

عالمی یوم اردو ایوارڈ 2017

نئی دھلی: عالمی یومِ اردو آرگنائزنگ کمیٹی کی میٹنگ زیر صدارت جلال الدین اسلم دفتر تنظیم ہذا نیو سیلم میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر عالمی یوم اردو ایوارڈز 2017 کا اعلان کا گیا۔ واضح ہو کہ اردو کی ترویج واشاعت میں نمایاں خدمات انجام دینے والے کچھ چنندہ افراد کو 1997 سے 9 نومبر 'عالمی یومِ اردو' کے موقعے پر ایوارڈ سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اس سال کے لیے بزرگ شاعر پنڈت آنند موہن گلزار زتشی دہلوی کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے جبکہ تخلیقی ادب کا عبدالماجد دریابادی ایوارڈ عظیم اختر کو دیا جائے گا جو کہ دہلی حکومت میں انفارمیشن آفیسر رہ چکے ہیں اور متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں نیز ان کے مضامین اخبارات کی زینت بنے رہتے ہیں۔ محفوظ الرحمٰن ایوارڈ برائے صحافت کے لیے ڈاکٹر مظفر حسین غزالی کو منتخب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسین غزالی فی الحال یونائیٹڈ نیوز نیٹ ورک کے ایڈیٹر ہیں اور یونیسیف میں اردو کے مشیر کے طور پر بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ادبی خدمات کے لیے حیات اللہ انصاری ایوارڈ ڈاکٹر جسیم الدین کو دیا جائے گا جو روزنامہ انقلاب سے وابستہ ہیں۔ اسماعیل میرٹھی ایوارڈ برائے ادب اطفال کے لیے مولانا سراج الدین ندوی کو منتخب کیا گیا ہے۔ مولانا سراج الدین ندوی ملت اکادمی بجنور سے وابستہ ہیں اور ایک عرصے سے بچوں کا رسالہ 'اچھا ساتھی' نکال رہے ہیں۔ حفیظ میرٹھی ایوارڈ برائے شعری ادب افضل منگلوری کو دیا جائے گا جو کہ اس وقت اردو اکادمی اتراکھنڈ کے چیئرمین ہیں۔ قاضی عدیل عباسی ایوارڈ برائے ادارتی خدمات کے لیے عبدالحی کو منتخب کیا گیا ہے جو کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے وابستہ ہیں اور ماہنامہ 'اردو دنیا' اور سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کے نائب مدیر ہیں۔ خیال رہے کہ ڈاکٹر علامہ اقبال کے یوم پیدائش کی مناسبت سے ہر سال 9 نومبر کو عالمی یوم اردو ملک وبیرون ملک میں منایا جاتا ہے۔ اس موقعے پر عالمی یوم اردو آرگنائزنگ کمیٹی ایک یادگار مجلّہ بھی شائع کرتا ہے۔ میٹنگ کے اختتام پر تمام شرکا کا شکریہ عالمی یوم اردو آرگنائزنگ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں نے ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 مئی 2017

اجرا

ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی کی دو کتابوں کا اجرا

نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کے ہاتھوں ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی کی دو کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: مولانا حسرت موہانی فاؤنڈیشن کے صدر اور معروف قانون داں ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی کی تحریر کردہ دو کتابوں کا اجرا بدست نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری عمل میں آیا۔ اپنی سرکاری رہائش گاہ پر منعقد ایک سادہ تقریب میں نائب صدر جمہوریہ نے 'حسرت موہانی کی شاعری میں احتجاج' اور 'بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط وسفرنامہ' کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر حامد انصاری نے عظیم مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی کی شخصیت، ان کے علم وفن اور قائدانہ صلاحیتوں پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا حسرت موہانی وہ واحد اور کرشمائی شخصیت ہیں جو بیک وقت اپنے اندر ان گنت صلاحیتیں رکھتے تھے۔ تحریک آزادی میں حسرت موہانی کے ناقابل

راجیو پرکاش ساحر کی کتاب 'ایک جھروکا افسانوں سے' کا رسم اجرا

مولوی واصف حسن کی مرتب کردہ کتاب 'قیمتی باتیں' کا اجرا

فراموش کردار کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی نے حسرت موہانی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاکر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس موقعے پر صاحب کتاب نفیس احمد صدیقی نے کہا کہ ان کی کوشش ہے کہ مولانا حسرت موہانی کی بیش قیمتی خدمات اوران کے علمی سرمائے کو سامنے لایا جائے۔ رسم اجرا کی اس تقریب میں شکیل احمد ایڈوکیٹ سپریم کورٹ، مولانا حسرت موہانی فاؤنڈیشن کے سکریٹری شاہد پرویز اور روزنامہ 'انقلاب' کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر یامین انصاری بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مئی 2017

ایک جھروکا افسانوں سے

لکھنؤ: راجیو پرکاش ساحر کی کتاب 'ایک جھروکا افسانوں سے' کی رسم اجرا کے موقعے پر علامہ شبلی چیریٹیبل ٹرسٹ کے چیئرمین نعمان اعظمی نے کہا کہ راجیو پرکاش ساحر اردو ادب کی دنیا میں ایک ایسا نام بن چکا ہے جو اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی کتاب 'ایک جھروکا افسانوں سے' ان کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ پروگرام میں خصوصی طور پر روزنامہ 'انقلاب' کے یوپی کے بیورو چیف جیلانی خان، ڈاکٹر مسیح الدین خان، ناگرک ادھیکار پریشد کے صدر رفیع احمد خان موجود تھے۔ صدارت نعمان اعظمی نے اور نظامت ڈاکٹر مسیح الدین خان مسیح نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مسیح الدین خان نے کہا کہ راجیو پرکاش ساحر اردو کے ایک پختہ مصنف ہیں۔ ان کی اس کتاب کے علاوہ دو اور کتابیں غزل مجموعہ 'تعارف' اور افسانوی مجموعہ 'ایک بھیگے لمحے کی لمبی سڑک' منظر عام پر آچکے ہیں۔ پروگرام میں راجیو پرکاش ساحر، حاجی اکرم ضیاء، مرزا احتشام، اشرف علی، قاری ادریس سمیت بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ پروگرام کے آخر میں راجیو پرکاش ساحر نے کہا کہ لکھنؤ کا باشندہ ہونے کی وجہ سے اردو سے جڑا ہوں اور اس کی خدمت کررہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ انھوں نے تمام مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 مئی 2017

قیمتی باتیں

دیوبند: اسٹریٹ ضیاء الحق پر واقع دینی ادارہ جامعہ قاسمیہ دارالتعلیم والصنعۃ میں مولوی واصف حسن کی مرتب کردہ کتاب 'قیمتی باتیں' کا اجرا علامہ قمر عثمانی استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ مذکورہ کتاب آیات قرآنی، احادیث مبارکہ نیز دانشوران عالم کے اقوال زریں پر مشتمل ہے جو کہ علماء کرام عوام وخواص نیز سماج کے ہر طبقے کے لیے یکساں مفید ہے، روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کی بھرپور رعایت رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں کامیاب مواد کافی عرق ریزی سے جمع کیا گیا ہے۔ مولانا ابراہیم قاسمی نے کہا کہ یہ کتاب میرے نقطہ نظر سے عوام وخواص کے علاوہ دینی مدارس کے طلبا کے لیے بھی اس دور کی مفید ترین مختصر وعام فہم وسلیس رواں دواں اردو میں ایک کامیاب کوشش ہے۔ قبل ازیں تقریب کا آغاز امان اللہ سلمانی کی تلاوت اور حافظ محمد ساجد کی نعت پاک سے ہوا۔ صدارت علامہ قمر عثمانی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض محمد راہیم عثمانی نے انجام دیے۔ آخر میں مولوی واصف حسن نے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 11 مئی 2017

شیخ مہدی حسین ناصری: ایک فراموش صاحب کمال

الہ آباد: میور سینٹرل کالج الہ آباد یونیورسٹی کے عربی و فارسی ادب کے سابق استاد شیخ مہدی حسین ناصری کی شخصیت اور فن پر محقق ڈاکٹر سید فاضل احسن ہاشمی کی تصنیف کردہ 'شیخ مہدی حسین ناصری- ایک فراموش صاحب کمال' کا رسم اجرا پدم شری شمس الرحمٰن فاروقی کے مکان میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت شمس الرحمٰن فاروقی نے کی۔ انھوں نے اس موقعے پر کہا کہ پروفیسر ناصری بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں الہ آباد یونیورسٹی کے ان نامور اساتذہ میں سے تھے جن کی شہرت نے الہ آباد یونیورسٹی کی شہرت قائم کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں میں اردو فارسی ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا ہے اور ایسی مستحکم روایات قائم کی ہے جس کے آثار اب تک باقی ہیں۔ افسوس کہ زمانے کے بحران کے ساتھ ناصری صاحب کا نام ہی رہ گیا تھا اور ان کے بارے میں تصنیف سامنے نہیں آئی۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ فاضل ہاشمی نے اس کمی کو پورا کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے لوگ ناصری صاحب کے نام سے نہیں بلکہ کام سے واقفیت حاصل کریں گے۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر شبنم حمید نے کہا کہ مرحوم ناصری نے نہ صرف یونیورسٹی کا وقار بلند کیا ہے بلکہ اردو ادب کو بھی پایۂ استناد عطا کیا ہے۔ صدر شعبۂ عربی و فارسی ڈاکٹر صالحہ رشید نے کہا کہ ناصری صاحب کی کتاب 'صناد ید عجم' جو فارسی ادب کی تاریخ ہے، ہندوستان کی تقریباً سبھی یونیورسٹی کے نصاب میں آج تک شامل ہے۔ شعبہ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کی پروفیسر باراں فاروقی نے کہا کہ ڈاکٹر فاضل ہاشمی کی کتاب کو وہ جگہ یقیناً ملے گی جس کی وہ مستحق ہے۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر فاضل ہاشمی نے اپنی متذکرہ کتاب کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی اور ناصری مرحوم کے متفرق اشعار سنائے۔ آخر میں امین اختر فاروقی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 مئی 2017

اضطراب

علی گڑھ: ابن سینا اکادمی میں ڈاکٹر افشاں ملک کے افسانوی مجموعہ 'اضطراب' کا رسم اجرا کرتے ہوئے مہمان خصوصی پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے کہا کہ دور حاضر میں افسانہ لکھنے والوں میں کئی اہم نام منظر عام پر آئے ہیں۔ اس میں ڈاکٹر افشاں ملک بھی شامل ہیں، انھوں نے افسانوں کو ایک نئی جہت دی ہے، وہ جو کچھ

سہ ماہی میگزین 'تمثیل نو' کا اجرا

افسانہ نگار رحیم انور کے فن اور شخصیت پر مبنی رسالہ 'گونج' کا اجرا

للھتی ہیں وہ مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ معروف فکشن نگار پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار نے کہا کہ ڈاکٹر افشاں ملک ایک سنجیدہ اور جینوئن افسانہ نگار ہیں، ان کا افسانوی مجموعہ 'اضطراب' پڑھ کر اندازہ ہوا کہ معاصر اردو افسانوی منظرنامے میں بہت اچھی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ افشاں ملک کی کہانیاں دلوں کو چھوتی ہیں۔ کلیم تیاگی نے ڈاکٹر افشاں ملک کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ غالب اسٹڈی سینٹر ابن سینا اکادمی کے کنوینر خالد فریدی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر شہر اور مسلم یونیورسٹی کے معزز شخصیات نے شرکت کی جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 مئی 2017

امروہہ کے گورو

امروهه: معروف کوی و مصنف بھونیش کمار شرما بھون امروہوی کی تصنیف امروہہ کے گورو کا رسم اجرا انجمن ترقی اردو اترپردیش کے زیر اہتمام ہاشمی گرلس پی جی کالج میں چیئرمین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ و نائب صدر انجمن ترقی اردو اترپردیش ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی کی صدارت میں منعقد ایک تقریب کے دوران ہوا۔ بھونیش کمار شرما کے ذریعے اپنی اس تصنیف میں امروہہ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ موجودہ وقت میں نمایاں سماجی خدمات پیش کرنے والے اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے۔ اپنی تازہ تصنیف امروہہ کے گورو کے رسم اجرا کے موقعے پر مصنف کتاب بھونیش کمار شرما نے کتاب کی بابت تفصیلی جانکاری بھی فراہم کرائی۔

ہاشمی گلرس ڈگری کالج امروہہ میں انجمن ترقی اردو اترپردیش کے زیر اہتمام منعقد اس تقریب میں بطور مہمان خصوصی ضلع گوتم بدھ نگر اترپردیش کے ایس ایس پی لوکمار رہے۔ مشہور شاعر، مرثیہ گو اور ادیب ڈاکٹر عظیم امروہی نے کہا کہ اس کتاب میں شخصیات کی فہرست صرف اس اعتبار سے چونکانے والی نہیں ہے کہ وہ طویل ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی حیران کرنے والی ہے کہ اس میں انتہائی ضروری معلومات موجود ہیں جو ہر قاری کی معلومات میں اضافہ کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ بھون امروہی کے اس تاریخی کام پر امروہہ کا ذرہ ذرہ فخر کرے گا۔ ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر سراج الدین، ہاشم نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 15 مئی 2017

اردو جریدہ 'تمثیل نو'

دربھنگہ: 11 مئی 2017 کو پی جی شعبۂ اردو ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر انیس صدری کے ہاتھوں اردو جرنل 'تمثیل نو' دربھنگہ (مدیر: ڈاکٹر امام اعظم) کا اجرا ہوا۔ دیگر حاضرین میں بائیں سے ڈاکٹر گوپی رمن پرساد سنگھ (پروفیسر پی جی شعبۂ سماجیات، ایل این ایم یو)، ڈاکٹر عالمگیر شبنم، ڈاکٹر رئیس انور (پروفیسر پی جی شعبۂ اردو ایل این ایم یو)، ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر مانو کولکاتا)، پروفیسر انیس صدری، ڈاکٹر منجو جھا (ایسوسی ایٹ پروفیسر پی جی شعبۂ سماجیات ایل این ایم یو) اور ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی (پی جی شعبۂ اردو ایل این ایم یو) موجود تھے۔ ان حضرات نے اردو جریدہ 'تمثیل نو' کے تازہ موضوعاتی شمارہ (جولائی 2016 تا جون 2017) کی تعریف کی اور کہا کہ اس طرح کا متنوع شمارہ نکالنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ سال میں ایک ہی شمارہ آیا لیکن اس میں سال بھر کی اہم ادبی، ثقافتی خبریں نیز وفیات موجود ہیں۔ کئی برسوں سے اس کے موضوعاتی شمارے ہی شائع ہو رہے ہیں۔ اس شمارہ کا موضوع 'اردو ادب میں وحدت الوجودی اور وحدت الشہودی عناصر' ہے۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر امام اعظم، (ریجنل ڈائریکٹر مانو کولکاتا) 17 مئی 2017

گونج کا خاص نمبر

نظام آباد: 24 مئی ضلع کاماریڈی کے ممتاز منی افسانہ نگار رحیم انور کے فن اور شخصیت پر مبنی رسالہ گونج کے خاص نمبر کی رسم اجرا ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اردو گری راج کالج نظام آباد نے انجام دی۔ مدیر گونج جناب جمیل نظام آبادی نامور ادیب، شاعر و صحافی کے مکان پر منعقدہ اس تقریب میں نظام آباد کے شعرا اور ادیب جناب چکر نظام آبادی، جناب جلال اکبر، جناب تمیم نظام آبادی اور جناب فضل صاحب اور دیگر احباب شریک تھے۔ تقریب رسم اجرا سے خطاب کرتے ہوئے مدیر گونج جناب جمیل نظام آبادی نے کہا کہ ادارہ گونج اس بات پر مسرت کا اظہار کرتا ہے کہ کاماریڈی سے وابستہ ممتاز افسانہ نگار رحیم انور کا گونج خاص نمبر شائع ہوا ہے جس میں رحیم انور کی تخلیقات کے علاوہ ان کے فن اور شخصیت اور دیگر شرکا کے تعارفی مضامین شامل ہیں۔ جناب جمیل نظام آبادی نے کہا کہ گونج کی جانب سے خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اور ادبی دنیا میں اس کی خاصی پذیرائی ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے کہا کہ یہ اچھی بات ہے کہ ایک ایسے دور میں جب کہ مادہ پرستی عام ہے ایک قلمکار افسانے کے ذریعے سماجی مسائل کو اجاگر کر رہا ہے وقت کی کمی کے اس دور میں مختصر افسانے کے ذریعے دو تین جملوں میں سماج کی ایک کڑوی حقیقت کو اجاگر کیا جاتا ہے اور یہ کام رحیم انور خاموشی سے کر رہے ہیں۔ افسانہ نگار رحیم انور نے کہا کہ وہ اب تک دس افسانوی مجموعے پیش کر چکے ہیں ان کے پانچ سو افسانوں میں دو سو کے قریب افسانے گونج میں شائع ہوئے۔ انھوں نے خاص نمبر کی اشاعت پر مدیر گونج کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی، اسسٹنٹ پروفیسر اینڈ ہیڈ، شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد، تلنگانہ، 29 مئی 2017

حضرت مولانا نسیم احمد صدیقی کی ادبی خدمات

امروهه: آزاد ایجوکیشنل ویلفیئر وسائٹی کی جانب سے اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے مالی تعاون سے ایک سمینار بعنوان 'حضرت مولانا نسیم احمد فریدی کی ادبی خدمات' ہاشمی ڈگری کالج میں ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی کی سرپرستی میں مع ہذا جس کی صدارت اترپردیش اردو اکادمی کے سابق رکن سید محمد ہاشم نے کی۔ نظامت کے

فرائض سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر چیئرمین ڈاکٹر افسر پرویز و مہمان ذی وقار کے طور پر مشہور نعت گو شاعر ڈاکٹر تابش مہدی، حاجی عبدالسلام منصوری، ظہیر راہی، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، حاجی شبیہ احمد، مشکور حسن شوق مسند پر جلوہ افروز رہے۔ پروگرام کا آغاز قاری محمد نوشاد نے تلاوت قرآن پاک سے کیا جبکہ نعت پاک کا نذرانہ حافظ شمیم امروہوی نے پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی کی تصنیف 'تواریخ امروہہ کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ' کا اجرا بھی مہمانان کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اس کے بعد مقالہ نگار حضرات نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے مفتی نسیم احمد کے حیات پر روشنی ڈالی۔ صدارت کررہے اتر پردیش اردو اکادمی کے سابق رکن سید محمد ہاشم نے کہا کہ مولانا نسیم احمد میں بہت ساری خوبیاں تھیں جس کا تذکرہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ آخر میں سوسائٹی کے صدر ترنم زاہد نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 8 مئی 2017

وفیات:

استاد شاعر حیرت رزاقی

سہارنپور: معروف استاد شاعر سید مہتاب حسین حیرت رزاقی کا اچانک حرکت قلب بند ہونے سے 70 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کا ایک مجموعہ سفر منظر عام پر آکر ارباب سخن سے پذیرائی حاصل کرچکا ہے اور ایک مجموعہ بازگزشت کے نام سے زیر ترتیب تھا اور جلد ہی اس کی اشاعت ہونے والی تھی لیکن ان کی عمر نے وفا نہیں کی۔ وہ نظم کے شاعر تھے لیکن تمام اصناف سخن پر دسترس رکھتے تھے۔ غزلیں، رباعیات اور قطعات کے علاوہ نئی طرز کے سہرے بھی انھوں نے لکھے ہیں۔ جنازہ اور دفین میں شعرا اور ادیبوں کے علاوہ سرکردہ شخصیات بھی شریک تھیں۔ ان کے انتقال سے شعری اور ادبی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 مئی 2017

طاہر منظور سلمانی شاہ پوری

کھتولی: شاہ پور کے معمر و معروف شاعر طاہر منظور سلمانی شاہ پوری (95) سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔ انتقال کی خبر سے ادبی حلقوں میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ بڑھانہ میں ڈاکٹر اکمل راہی کی رہائش گاہ پر منعقد تعزیتی میٹنگ میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اور مرحوم کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے اکمل راہی

نے کہا کہ شاہ پور علاقہ میں اردو ادب کا روشن چراغ افسوس کہ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم نہایت نیک سیرت، خوش اخلاق، ملنسار، سادہ لوح اور نہایت مشفق و مربی صفات کے حامل تھے۔ ان کی ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا ناممکن ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 مئی 2017

شاہد احمد شعیب

گیا: اردو کے مشہور شاعر و ادیب شعبہ عمرانیات کے پروفیسر ڈاکٹر شاہد احمد شعیب کا 2 جون 2017 کو علی الصباح ساڑھے چھ بجے انتقال ہوگیا۔ وہ 80 سال کے تھے۔ انھوں نے گیا کے ایمس نرسنگ ہوم میں آخری سانس

لی۔ ان کی نماز جنازہ چھوٹی مسجد کے پاس ادا کی گئی اور ڈویژن قبرستان میں مرحوم کو سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ سات بیٹے بیٹیاں ہیں۔ واضح رہے کہ ان کا آبائی وطن رانچی کے کربلا چوک علاقے میں ہے لیکن 1964 سے لگاتار وہ اپنے پوری فیملی کے ساتھ گیا میں رہ رہے تھے۔ پروفیسر شاہد احمد شعیب اردو اکادمی کے وائس چیئرمین، مرزا غالب کالج کاؤنسل کے چیئرمین کے طور پر خدمات دے چکے ہیں۔ آپ پروفیسر وہاب اشرفی اور کلام حیدری جیسی شخصیتوں کے ہم عصر تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے 'لے سانس بھی آہستہ' اور 'نازک ہے بہت کام' منظر عام پر آکر مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔

ڈاکٹر شاہد احمد شعیب کی شخصیت پر ترقی پسندیت کی گہری چھاپ تھی۔ ان کی تخلیقات میں کیمونزم کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔

مرحوم کی نماز جنازہ میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ خاص طور پر مرزا غالب کالج جی بی کے صدر ایڈوکیٹ مسعود منظر، جی بی کے سکریٹری ایڈوکیٹ سید قیصر شرف الدین، سابق پرنسپل پروفیسر غلام صمدانی، مرزا غالب کالج کے موجودہ پروفیسر انچارج پروفیسر خورشید احمد خان، موتی کریمی، انصر حسن (آبگلہ) کے علاوہ پروفیسر مرحوم کے خویش و اقارب، احباب، رشتہ دار کثیر تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ 5 جون 2017

جمنا پرشاد راہی

علی گڑھ: اردو کے مشہور شاعر اور علی گڑھ کے فراق کہے جانے والے جمنا پرشاد راہی کا 3 جون کو انتقال ہوگیا۔ وہ 78 سال کے تھے اور کافی عرصے سے بیمار تھے۔ ان کا شمار

علی گڑھ کے اہم شاعروں میں ہوتا تھا۔ ان کے والد مہابر پرشاد بھیکم پوری بھی عمدہ شاعر تھے۔ جمنا پرشاد راہی گنگا جمنی قدروں کے علمبردار تھے۔ فن عروض پر انھیں مہارت تھی اور رباعی گوئی میں کمال حاصل تھا۔ علی گڑھ کی ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ متحرک اور فعال رہتے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سے ادبی دنیا میں غم کی لہر چھاگئی۔ ان کا مجموعہ 'سرابوں کی فصل' بہت مقبول ہوا تھا۔ حال ہی میں 'بازگشت غالب' کے عنوان سے ان کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے غالب کی مشکل زمینوں میں شعر کہے تھے۔ وہ مشاعروں کے بھی مقبول شاعر تھے۔ ان کا ایک شعر بہت مشہور ہے:

دنیا کے بازار میں یارو جھوٹ کا سکہ چلتا ہوگا
لیکن میں سچ بول رہا ہوں ماشہ ماشہ رتی رتی

ان کے انتقال پر مختلف ادبی اور ثقافتی تنظیموں نے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے انھیں گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار شاعر قرار دیا اور اردو شاعری کے لیے ایک بڑا خسارہ بھی!

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تاج المآثر

تالیف: تاج الدین حسن نظامی
ترجمہ: پروفیسر سید احسن الظفر
صفحات: 301
قیمت: 145 روپے

انارکلی

مقدمہ: محمد شاہد حسین
صفحات: 143
قیمت: 90 روپے

باتوں باتوں میں

مصنف: عبدالودود انصاری
صفحات: 79
قیمت: 60 روپے

زمینی آلودگی پر مبنی کہانیاں

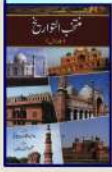

مصنف: ادریس صدیقی
صفحات: 40
قیمت: 35 روپے

تتلی تارے پھول

مصنف: عزیز انصاری
صفحات: 32
قیمت: 20 روپے

طوطا کہانی

مصنف: محسن خان
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)

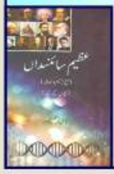

مصنف: احرار حسین
صفحات: 121
قیمت: -/32 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد چہارم)

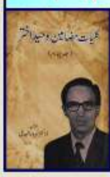

مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 305
قیمت: 160 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد پنجم)

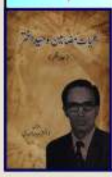

مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 204
قیمت: 115 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد ششم)

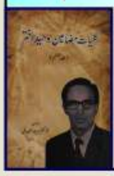

مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: -/115 روپے

اسرار کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658)

مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
و حواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: -/335 روپے

دستورِ ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

انتخابِ سخن (جلد اوّل) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: -/175 روپے

داستان گو آیا ہے

مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجر الدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجر الدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی

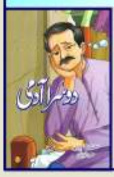

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, July-2017, Vol.19, Issue:07
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/06/2017**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025